آگ ہی ان کے پیٹ بھرے گی۔

کرپشن، لوٹ مار، بے حیائی اور حرامکاری کے اس حمام میں ایسے ایسے پردہ نشین ننگے ہوئے کہ الامان الحفیظ! کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں، اب اللہ تعالیٰ نے اس بے بس قوم کی حالت پر رحم فرماتے ہوئے ایک آزاد عدلیہ نصیب فرمائی ہے جو اپنی بساط بھر کوششوں کے ساتھ ان پر گرفت کر رہی ہے اور پاکستانی عوام کی واحد اُمید بن گئی ہے۔

یہ مضامین ماہنامہ نیا جہان انٹرنیشنل کے گزشتہ ایک سال کے شماروں میں شائع ہوئے اور بلاشبہ تحقیقی صحافت کی اعلیٰ ترین روایات رکھتے ہیں۔ افسوس یہ دور اپنے الگ تقاضے رکھتا ہے جن پر کوئی غیرت مند صحافی شاید پورا نہیں اُتر سکتا یہی وجہ ہے کہ صحافت کی اعلیٰ اقدار کے امین وہ پرچے جنھیں سرکاری یا غیر سرکاری سرپرستی حاصل نہیں عوام تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن تا بہ کے؟

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی بقاء کے لئے ہی سہی، اپنے افعال و کردار پر نظر ثانی کریں۔

طارق اسمٰعیل ساگر

عنوان	صفحہ نمبر

لوڈشیڈنگ! حقیت یا سازش

ملک میں جاری 20,20 گھنٹوں پر مشتمل اعلانیہ اور غیر اعلانیہ لوڈشیڈنگ نے اہل پاکستان کی زندگیوں کو اجیرن کر دیا ہے، بجلی کے مسلسل تعطل کے باعث معاشی ترقی کی رفتار قابل ذکر حد تک سست ہو چکی ہے، دفتری امور معطل ہیں، گھریلو زندگی اذیت ناک ہو چکی ہے، گرمی وحبس کی وجہ سے کئی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ گزشتہ دو ماہ کے اخبارات پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب گرمی، حبس اور لوڈشیڈنگ کی وجہ سے کچھ ہلاکتوں کی اطلاع نہ دی گئی ہو۔ ہسپتالوں میں مریض گرمی اور آپریشن وقت پر نہ ہونے کی وجہ سے جان کی بازی ہار رہے ہیں۔ طلباء کو پڑھنے اور امتحان کی تیاری کے لئے موم بتیاں جلانی پڑ رہی ہیں، کاروباری طبقہ الگ پریشان ہے، ان کے کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گئے ہیں، صنعتیں بجلی کے اس بحران کی وجہ سے بند ہو رہی ہیں یا ان میں ڈاؤن سائزنگ ہو رہی جس کی وجہ سے لاکھوں افراد بے روزگار ہو گئے ہیں اور ان کے گھروں میں چولہے ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔ گزشتہ ایک عشرے میں ہونے والی تیز معاشی ترقی الٹے قدموں پیچھے کی طرف رواں ہے، پیداوار میں قابل لحاظ کمی واقع ہو رہی جس کے باعث قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں۔ راتوں کو مسلسل وقفے وقفے سے

لوڈشیڈنگ کے باعث لوگوں کی نیند پوری نہیں ہورہی جس کی وجہ سے چڑ چڑاپن پھیل رہا ہے اور افرادی قوت کی پیداواری صلاحیتوں میں کمی آ رہی ہے۔بجلی کے نرخوں میں اضافے اور لوڈشیڈنگ کے خلاف مظاہرے ہورہے ہیں۔ بڑے شہروں میں روزانہ کی بنیادوں پر احتجاج اور ہڑتالوں کی وجہ سے ٹریفک جام ہے،ٹائر جلائے جارہے ہیں،سرکاری عمارتوں کے گھیراؤ اور واپڈا کے دفتروں پر حملے ہورہے ہیں جس کے باعث معاشی پہیے کی پہلے سے ست رفتار مزید ست ہوگئی ہے۔گزشتہ چند ہفتوں سے ان حملوں کی شدت میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے،28رجون کو پشاور کے نواحی علاقوں کے عمائدین نے ایک اجلاس میں فیصلہ کیا کہ اگر طویل لوڈشیڈنگ کا خاتمہ نہ ہوا تو وہ واپڈا ہاؤس کو تالا لگا دیں گے اور پشاور کی تمام اہم شاہراہوں کو ہر قسم کی ٹریفک کے لئے بند کر دیں گے۔لاہور کی تاجر تنظیموں نے بھی اعلان کر رکھا ہے کہ اگر حکومت نے لوڈشیڈنگ ختم نہ کی تو واپڈا دفاتر کا گھیراؤ کریں گے،لاہور کے تاجروں کی طرف سے 21 جولائی کو پہیہ جام ہڑتال بھی کی گئی۔لاہور کے تاجروں نے پیپلز پارٹی کی حکومت پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ انہیں شریف برادران کا حمایتی ہونے کی سزا دی جارہی ہے۔اوکاڑہ اور جھنگ میں بھی مشتعل مظاہرین نے ٹرین کو آگ لگا دی اور ملتان روڈ بھی بند کر دی۔لوڈشیڈنگ کی وجہ سے سیاسی میدان میں بھی ہلچل کے آثار نظر آتے ہیں۔مسلم لیگ (ن) کے بہت سے لیڈر اپنی مرکزی قیادت کو مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ پیپلز پارٹی سے اشتراک عمل کی پالیسی ترک کرے اور عوامی ایجنڈا اپنائے ورنہ پچھلے کچھ عرصے میں کمائی گئی ساری نیک نامی اور مقبولیت گہنا جائے گی۔

بجلی کے اس بحران سے ریاست کے بنیادی ستونوں کے مابین ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔بجلی پر دی جانے والی 65ارب روپے کی سبسڈی ختم کئے جانے کے بعد یکم جولائی سے بجلی کے نرخوں میں 17 فیصد تک اضافے کا فیصلہ کیا گیا جس پر عوام نے احتجاج کیا اور سپریم کورٹ نے از خود نوٹس لیتے ہوئے چیئرمین واپڈا، نیپرا اور دیگر کمپنیوں کو نوٹس جاری کیا کہ وہ

عدالت عالیہ کے سامنے وضاحت کریں۔از خود نوٹس کے حتمی فیصلے تک عدالت نے حکومت کو بجلی کی نرخ بڑھانے سے بھی روک دیا۔عدالت عالیہ کی طرف سے عوامی ریلیف کا یہ فیصلہ سامنے آیا تو دوسری طرف حکومتی حلقے جو اپنی معیشت کو آئی ایم ایف کے شکنجے میں پھنسائے بیٹھے ہیں، کے لئے مصیبت کھڑی ہوگئی کیونکہ انہوں نے آئی ایم ایف سے یہ قول وقرار کیا ہوا ہے کہ سال رواں کے اختتام تک وہ بجلی پر سبسڈی ختم کردیں گے۔بعض رپورٹوں کے مطابق اب آئی ایم ایف نے ایکدم سبسڈی ختم کرنے کی بجائے سلسلہ وار خاتمے کی منظوری دے دی ہے۔اگر سبسڈی کا مکمل خاتمہ کیا جاتا ہے تو بجلی کے نرخوں میں تقریباً 30 فیصد اضافہ کرنا پڑے گا گویا 17 فیصد اضافے کے بعد ایک اور بجلی ڈرون حملہ دسمبر سے پہلے پاکستانی عوام کے لئے تیار ہے جس سے بجلی کے نرخوں میں 13 فیصد مزید اضافہ ہوگا۔حالانکہ حکومت بارہا یہ دعویٰ کر چکی ہے کہ مکمل لوڈشیڈنگ کے خاتمے تک سبسڈی کا خاتمہ نہیں کیا جائے گا۔انتظامیہ اور عدلیہ کے درمیان بجلی کے بحران سے شروع ہونے والا تنازعہ،بعض مبصرین کے نزدیک،شدید تر ہوسکتا ہے۔عدلیہ اور انتظامیہ کے درمیان ٹکراؤ کا مظہر پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے اور کاربن ٹیکس کے نفاذ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ کا از خود نوٹس بھی ہے، جس کو کالعدم کرنے کے لئے صدر کو پٹرولیم ڈویلپمنٹ لیوی (پی ڈی ایل) نافذ کرنا پڑا۔

حیرت کی بات ہے کہ گزشتہ چند سالوں سے عوام کبھی آٹا بحران، کبھی شوگر بحران، کبھی بجلی بحران اور کبھی مہنگائی اور بے روزگاری کے بحران کا عذاب جھیل رہے ہیں جبکہ اسکے برعکس آئل کمپنیاں دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہی ہیں، جسٹس بھگوان داس کی سرکردگی میں قائم کئے جانے والے جوڈیشل کمیشن کی رپورٹ کے مطابق 2001ء سے لیکر 2008ء کے درمیان حکومت نے آئل سیکٹر سے 1 ٹریلین روپے (12.5 ارب ڈالر) کمائے جبکہ 2001-02 کے مقابلے میں 2007-08 میں ہر آئل فیکٹری نے 3516 فیصد سے زائد منافع کمایا ہے۔

پاکستان کی آئل ریفائنریز کو ریکارڈ منافع ہوا، مثال کے طور پر اٹک پٹرولیم کی پیداوار 1398 فیصد بڑھی، شیل پاکستان کا منافع 483 فیصد رہا، پاکستان سٹیٹ آئل کا منافع 440 فیصد، کالٹیکس پاکستان کا 170 فیصد، اٹک ریفائنری کا نفع 830 فیصد، نیشنل آئل ریفائنری کا 768 فیصد اور پاک عرب ریفائنری کا منافع 567 فیصد رہا۔ جب حکومت کی طرف سے کاربن ٹیکس عائد کیا گیا تو اس رپورٹ کی سفارش کے مطابق سپریم کورٹ نے از خود نوٹس لیتے ہوئے کاربن ٹیکس کے نتیجے میں ہونے والی پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کو روک دیا، جس پر صدر محترم نے راتوں رات پی ڈی ایل نافذ کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے از خود نوٹس کے اثر کو زائل کر دیا۔ عوام کو ریلیف پہنچانے کی یہ عدالتی کوشش ناکام ہوئی اور آئل کمپنیوں کے منافع کو محفوظ اور آئی ایم ایف کی شرطوں کی پاسداری کرتے ہوئے صدارتی آرڈی نینس فوری طور پر نافذ ہو گیا۔

اخباری رپورٹوں کے مطابق آئی ایم ایف نے پی ڈی ایل کے نفاذ کی صورت میں ہی پاکستان کو قرض کی تیسری قسط 84 کروڑ ڈالر فراہم کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ گزشتہ سال بھی حکومت نے پٹرولیم مصنوعات کی مد میں 129 ارب روپے وصول کئے، اور یہ سوچے بغیر کے پچھلے سال بھی پٹرولیم کی بلند قیمتوں کی وجہ سے عام آدمی کی زندگی اجیرن بنی رہی، اس سال بھی حکومت نے منصوبہ بنایا کہ وہی آسان راستہ اختیار کیا جائے اور عوام کی رگوں سے جتنا خون نچوڑا جا سکتا ہے، نچوڑا جائے۔ کاربن ٹیکس بنیادی طور پر ماحولیات کو بہتر بنانے اور آلودگی کو روکنے کے لئے لاگو ہوتا ہے جبکہ پاکستان میں نہ تو اس سطح کی ماحولیاتی آلودگی ہے جو ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں پائی جاتی ہے اور نہ ہی عوام کی جیبوں میں اتنی طاقت ہے کہ وہ پٹرولیم مصنوعات پر مزید ٹیکس ادا کر سکیں۔ پی ڈی ایل کے نفاذ سے عوام کو پہنچنے والا وہ ریلیف یکدم ختم ہو گیا جو سپریم کورٹ کے فیصلے سے انہیں پہنچنے کا ''خدشہ'' تھا۔ کاربن ٹیکس جیسے ٹیکس لاگو کر کے عوام کی مشکل زندگی کو مزید مشکل بنانے سے یہ بہتر ہوتا اگر حکومت اپنے دوسرے ٹیکسز اور اخراجات کو ایڈجسٹ کرتی، شاہی

اخراجات میں کمی لاتی اور جہازی سائز کابینہ کو محدود کرتی مگر چونکہ اس سے سرمایہ داروں کے مخصوص ٹولے کے مفادات کو زک اور غریب صارفین کو ریلیف ملنے کا خطرہ تھا اس لئے اس سال بھی پٹرولیم پر ٹیکسز لگا کر بجٹ خسارہ پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ پی ڈی ایل کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جا چکا ہے اور درخواست میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ آئین کے آرٹیکل 77 کے تحت صدر کے پاس ٹیکس عائد کرنے کا اختیار ہی نہیں ہے۔ ریلیف کو ترستی قوم کی نظریں اب سپریم کورٹ کے فیصلے پر ہیں۔

لوڈشیڈنگ کے بحران پر قابو پانے کے لئے فوری طور پر کرنے کا کام یہ ہے کہ نجی تھرمل کمپنیوں کو واجب الادا رقوم ادا کی جائیں۔ حکومت کو اس وقت بھی 100 ارب روپے ان کمپنیوں کو دینے ہیں اور اگر یہ دے دیئے جاتے ہیں تو لوڈشیڈنگ کا مسئلہ عارضی طور پر حل ہو جائے گا۔ آئی پی پیز کو ادائیگی کے لئے کاربن ٹیکس اور پی ایل ڈی جیسے آرڈی نینس کے نفاذ کے بجائے شاہی اخراجات، وزیروں کی فوج، بیرونی دوروں اور غیر ضروری اخراجات میں تخفیف کی جائے۔ کچھ دن قبل وزیر اعظم نے ارکان پارلیمنٹ کو ان کے علاقے کے ترقیاتی کاموں کے لئے مختص رقم کو دوگنا کرتے ہوئے ایک کروڑ سے بڑھا کر دو کروڑ کر دیا ہے۔ معلوم نہیں کہ مانگے تانگے کے خزانے میں اتنی رقم کہاں سے آ گئی اور اس رقم کو دوگنا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی کیونکہ پاکستان کا عام شہری بھی اب یہ جاننے لگا ہے کہ ترقیاتی کاموں کے لئے ارکان پارلیمنٹ کے یہ صوابدیدی فنڈز در اصل ایک قسم کی رشوت ہوتے ہیں جو خود کو ارکان پارلیمنٹ میں مقبول بنانے کے لئے دی جاتی ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ رقم ترقیاتی منصوبوں پر نہیں بلکہ ارکان اسمبلی کی جیبوں میں جاتی ہے۔ ان اخراجات کو محدود کر کے تھرمل کمپنیوں کو واجب الادا رقم ادا کی جائے تاکہ لوڈشیڈنگ کے عذاب سے بے حال لوگوں کو گرمیوں اور شدید حبس کے ان دنوں میں کوئی سکھ کا سانس نصیب ہو۔

یقیناً یہ بجلی کے بحران اور توانائی کی کمی کے مسئلے کا دیرپا حل نہیں بلکہ وقتی ہے، دیرپا حل کے لئے

ضروری ہے کہ واپڈا اور نیپرا سمیت بجلی فراہم کرنے والے اور ترسیل کا انتظام کرنے والے اداروں سے کرپشن ختم کی جائے، بجلی چوری کو روکا جائے، آبی ذخائر تعمیر کئے جائیں، تھر اور دادو میں موجود کوئلے کے ذخائر کو بجلی پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جائے، ایٹمی، شمسی اور ہوا کی توانائی کو پاور سٹیشنوں کے لئے استعمال کیا جائے اور ڈیموں پر سیاست چمکانے اور فیصلے صادر کرنے کی بجائے ان کی بلا تاخیر تعمیر شروع کی جائے۔ واپڈا اہلکاروں کی غفلت اور نااہلی کا عالم یہ ہے کہ اس دوران جبکہ ملک بجلی کے شدید بحران کا شکار ہے ان دنوں منگلا پاور ہاؤس میں ٹرانسمشن لائن کے جلنے سے 1100 میگاواٹ بجلی کی مزید کمی ہو گئی جس کی وجہ سے شارٹ فال کی مقدار 4000 میگاواٹ تک جا پہنچی۔ اس حادثے پر فرائض سے غفلت برتنے پر واپڈا کے 4 اہلکاروں کو معطل کر دیا گیا، تحقیقات کے لئے حسب معمول کمیٹی قائم کر دی گئی جو پندرہ دن میں اپنی رپورٹ پیش کرے گی، حالانکہ ایسے حادثات پر مہذب ملکوں میں وزیر شعبہ استعفیٰ دیا کرتے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ 25 رجولائی تک ٹرانسمشن لائن مرمت ہو کر قابل استعمال ہو جائے گی۔

ایشیائی ترقیاتی بنک نے اپنی ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ پاکستان حکومت سب سے زیادہ توانائی کو ضائع کرتی ہے۔ پاکستان صرف گیس کی ترسیل کے نظام کو بہتر بنا کر 58 کروڑ ڈالر کی بچت کر سکتا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ گیس کی ترسیل کے فرسودہ نظام کی وجہ سے 30 فیصد گیس ضائع ہو جاتی ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صرف گھروں میں بجلی کے بہتر بلبوں کے استعمال سے 880 میگاواٹ بجلی بچائی جا سکتی ہے۔ بجلی کی پیداوار اور ترسیل کے ذمہ دار اداروں میں کرپشن اور حکومتی اداروں کی نااہلی کا عالم یہ ہے کہ عالمی بنک کی ایک رپورٹ ان کی کرپشن کے بارے میں کہتی ہے...... پاکستان میں بجلی کے کنکشنز کے حصول کے لئے 84 فیصد اور پانی کے کنکشنز کے لئے 62 فیصد فرمز غیر رسمی ادائیگیاں کرتی ہیں...... بجلی چوری کی وارداتیں صرف شمالی علاقوں اور سرحد و بلوچستان کے قبائلی علاقوں تک ہی محدود نہیں بلکہ کراچی جیسے بڑے

شہروں میں بھی ڈنکے کی چوٹ پر بجلی چوری کی جاری ہے مگر حکومت اپنی سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ بجلی کے بحران کے فوری خاتمے کے لئے مندرجہ بالا کوتاہیوں اور سسٹم میں موجود کرپشن اور بجلی چوری کو روکنے کی شدید ضرورت ہے۔

مستقبل کے لئے ٹھوس منصوبہ بندی اور بجلی و توانائی کی بڑھتی ہوئی طلب کے لئے ضروری ہے کہ فیول کی بنیاد پر پیدا کی جانے والی مہنگی بجلی کی بجائے ملک میں موجود بے تحاشا قدرتی وسائل کو استعمال میں لایا جائے۔ بھارت مسلسل پاکستان کی طرف بہنے والے دریاؤں پر ڈیم بنا کر اور سرنگوں کے ذریعے پانی چوری کر کے آبی دہشت گردی کا مرتکب ہو رہا ہے جس پر آج تک مقتدر حلقوں کی طرف سے مجرمانہ غفلت برتی گئی ہے۔ دریائے راوی اور ستلج کے بعد بھارت بگلیہار ڈیم بنا کر چناب کا پانی بھی روکنے کی پوزیشن میں آ گیا ہے۔ بھارت اگلے چھ برسوں میں دریائے سندھ کے 90 ملین کیوبک فٹ پانی پر قبضہ کرنے کے لئے کشن گنگا ڈیم بنا رہا ہے جو دریائے سندھ کے 80 فیصد پانی کو سٹور کر لے گا۔ بھارت کی تین بڑی ڈونر ایجنسیوں نے گزشتہ 15 برسوں میں کالا باغ ڈیم کی مخالفت میں کمی نہ آنے کے لئے ڈیم مخالف تنظیموں میں 10 ارب روپے بانٹے ہیں۔ سندھ واٹر کونسل کے چیئرمین کے مطابق بھارت پاکستانی دریاؤں پر 62 ڈیم بنا رہا ہے جن میں سے 32 ڈیم مکمل کر لئے گئے ہیں اور باقی زیر تعمیر ڈیموں کی بھارت نے 2014ء تک تکمیل کرنی ہے۔ اگر یہ ڈیم بن گئے تو پاکستان کے لئے ایک قطرہ پانی نہیں بچے گا۔

آبی ماہرین کے مطابق قومی تقاضا یہی ہے کہ کالا باغ ڈیم کی فوری تعمیر کی جائے، کیونکہ یہ ملکی ضروریات کے لئے ناگزیر ہو چکا ہے اور اسی سے پاکستان کے سرسبز لہلہاتے کھیتوں اور وادیوں کو بنجر ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ کالا باغ ڈیم کو التوا میں پڑے ہوئے چالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ موجودہ برسر اقتدار پیپلز پارٹی کی حکومت نے مسند اقتدار سنبھالتے ہی قومی مفادات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اس منصوبے کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ ڈیم کی فزیبلیٹی، واپڈا ملازمین کی

تنخواہوں اور سڑکوں کی تعمیر پر 80 ارب روپے خرچ ہو چکے ہیں، ڈیم کی تعمیر کے لئے جائزہ رپورٹوں کی تیاری پر ایک ارب روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ امریکہ سمیت بڑی طاقتیں کالا باغ ڈیم کی بجائے بھاشا ڈیم کی تعمیر میں دلچسپی رکھتی ہیں، کیونکہ مذکورہ ڈیم کی تعمیر سے قراقرم ہائے وے کا کچھ حصہ ختم ہو جائے گا جس کی وجہ سے بھارت کے مقابلے میں چین کے سٹریٹیجک مفاد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کالا باغ ڈیم کا منصوبہ ہمیشہ کے لئے ترک کر کے ہماری منتخب جمہوری حکومت نے نااہلی کا ثبوت دیا ہے۔ پاکستان کو قدرت نے پانی کے معاملے میں فیاضی سے نوازا ہے جس سے ہم اپنی بجلی کی ضروریات با آسانی پوری کر سکتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف آزاد کشمیر میں آبی وسائل سے 17000 میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی گنجائش موجود ہے جبکہ ملک بھر میں ہائیڈل پاور منصوبوں کے تحت 54 ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی گنجائش موجود ہے جبکہ اس وقت صرف 6500 میگاواٹ بجلی حاصل کی جا رہی ہے۔

تھرمل پاور کے برعکس ہائیڈل طریقے سے بجلی کی پیداوار کے لئے ایندھن کا ایک قطرہ بھی خرچ نہیں ہوتا۔ گزشتہ دس برسوں میں واپڈا نے اپنے سسٹم میں سوائے غازی بروتھا سے پیدا ہونے والے چند میگاواٹ کے علاوہ کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا۔ اس وقت اشد ضرورت ہے کہ نہ صرف کالا باغ اور دیگر بڑے ڈیم بنائے جائیں بلکہ جہاں ممکن ہو کئی چھوٹے ڈیم بھی تعمیر کئے جائیں۔ اگر کالا باغ ڈیم منصوبہ آج سے 5 سال پہلے شروع ہو جاتا تو آج ہم جس بحران کا شکار ہیں اس کا شکار نہ ہوتے کیونکہ اس سے 3600 میگاواٹ بجلی پیدا ہونی تھی جبکہ اس وقت بجلی کا شاٹ فال 2000 میگاواٹ سے 4000 میگاواٹ کے درمیان ہے جس کو پورا کرنے کے لئے لوڈ شیڈنگ کی مصیبت ہم سے چمٹی ہوئی ہے۔ کالا باغ ڈیم قومی اہمیت کا انتہائی نازک معاملہ ہے اور اسے تکنیکی بنیادوں اور ملکی ضروریات کے پیش نظر دیکھنا چاہئے ناں کہ اسے خود غرضانہ سیاسی مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔

مشرف دورِ حکومت میں ملک کے ترقیاتی بجٹ میں ریکارڈ اضافہ ہوا لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس عرصے میں ایک میگاواٹ بجلی کی اضافی پیداوار کے لئے بھی سرمایہ کاری نہیں کی گئی۔ حالانکہ مشرف حکومت بجلی کی بڑھتی ہوئی طلب اور اس کی رسد وطلب کے درمیان بڑھتے ہوئے خلا سے بخوبی واقف تھی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں جان بوجھ کر پاور جنریشن کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ اب یہ حقائق سامنے آ رہے ہیں کہ بجلی کی قلت سے ایک طاقتور طبقے کا مفاد وابستہ ہے اور بجلی کی موجودہ بحران سے اس طبقے نے اربوں روپے کمائے ہیں۔ مثال کے طور پر کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن (کے ای ایس سی) ایک ایسے نجی ادارے کے حوالے کی گئی جس کا بنیادی کاروبار جنریٹرز کی فروخت کا تھا۔ صرف 13 ارب روپے میں کے ای ایس سی جیسا ادارہ اس نجی کمپنی کو دے دیا گیا حالانکہ کے ای ایس سی کے اثاثہ جات کی قیمت اس سے تین گنا تھی۔ اس کمپنی نے نہ صرف کے ای ایس سی کے اثاثے گروی رکھ کر اربوں روپے کا قرض لیا بلکہ اسے لوگوں کو بجلی فراہم کرنے سے زیادہ اس بات میں دلچسپی تھی کہ لوڈ شیڈنگ زیادہ سے زیادہ ہوتا کہ اس کے جنریٹرز زیادہ فروخت ہوں۔ ایک غیر سرکاری مارکیٹ سروے کے مطابق اس عرصے میں ساڑھے تین ارب روپے کے جنریٹرز فروخت ہوئے۔ اس کے بعد مزید ظلم یہ کیا گیا کہ کمپنی کی جوابدہی کی بجائے اسے آسانی سے راستہ دیدیا گیا کہ وہ کے ای ایس سی کو بحران میں چھوڑ کر چلی جائے۔ بعد ازاں کے ای ایس سی ایک دوسری غیر ملکی نجی کمپنی کے حوالے کی گئی جس کی انتظامیہ کے بارے میں تمام اہل کار کہہ رہے ہیں کہ یہ نجکاری کے معاہدے کی پاسداری نہیں کر رہی ہے، اس نے نہ صرف یہ کہ نئے پاور جنریشن پلانٹس نہیں لگائے بلکہ موجودہ پاور جنریشن پلانٹس کو بھی ان کی گنجائش کے مطابق نہیں چلا رہی تا کہ مبینہ طور پر فیول کے اخراجات بچائے جا سکیں۔ عام لوگ جو لوڈ شیڈنگ کا عذاب برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ اضافی بلوں کی شکایت کر رہے ہیں (بلکہ لوڈ شیڈنگ کا بل بھی دے رہے ہیں) ان کی کوئی نہیں سن رہا، کیونکہ ان معاملات سے بڑے

بڑے لوگوں، گروہوں اور کمپنیوں کے مفادات وابستہ ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ملک میں وسائل موجود ہیں، سستی بجلی پیدا کی جا سکتی ہے تو آخر ایسا کیوں نہیں ہو پا رہا۔ پاکستان میں ایسے کئی گروہ سرگرم عمل ہیں جو چاہتے ہیں کہ ملک میں سستی بجلی پیدا نہ ہو، جن میں سب سے اہم نجی آئل کمپنیاں ہیں۔ سستی بجلی کا سب سے آسان طریقہ ہائیڈرو انرجی ہے، ڈیم تعمیر ہونے کی صورت میں ان آئل کمپنیوں کے منافع کم ہونے کے چانسز ہیں۔ آئل کمپنیوں کے منافعوں کی صورت حال جاننے کے لئے پہلے ذکر کی گئی جسٹس بھگوان داس کمیشن کی رپورٹ ملاحظہ کی جا سکتی ہے جو خاصی چشم کشا ہے۔

کالا باغ ڈیم نہ صرف 3600 میگاواٹ بجلی پیدا کرے گا بلکہ اس کی 9.6 ملین ایکڑ فٹ پانی کی ذخیرہ کرنے کی صلاحیت کے باعث لاکھوں ایکڑ اراضی بھی سیراب ہو گی، اس سے 20 فیصد سیلابوں کی بھی روک تھام ہو گی اور جو پانی ہر سال بحیرہ عرب کی نذر ہو جاتا ہے اس کو بھی بچایا جا سکے گا۔ چھوٹے صوبوں کی طرف سے اس ڈیم پر اعتراضات تکنیکی نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ ان کی بنیادیں خالص سیاسی ہیں اور صوبوں کے درمیان باہمی عدم اعتماد کا شاخسانہ ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ 1988ء سے لیکر اب تک جتنی بھی سیاسی حکومتیں یا فوجی حکومت رہی ہے انہوں نے کالا باغ ڈیم کو ملکی معیشت کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہوئے اس کی تعمیر کے حق میں دلائل دیئے، محترمہ بے نظیر بھٹو، میاں محمد نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف ہمیشہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے حق میں رہے ہیں اور ان کی طرف سے کوشش بھی کی گئی کہ صوبوں کے درمیان اتفاق رائے پیدا کیا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ تکنیکی نوعیت کے اس منصوبے کو انجینئروں کی بحث کا موضوع بنانے کی بجائے سیاست دانوں کی سطحی بحثوں اور تنگ نظر قوم پرستانہ جذبات کی حامل مقامی سیاسی جماعتوں کے ہتھے چڑھا دیا گیا ہے۔

کالا باغ ڈیم کے منصوبے کو دفن کرنے کی بجائے اس منصوبے پر از سر نو سنجیدہ بحث کا آغاز

ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ بھاشا سمیت تمام بڑے، چھوٹے ڈیموں کی تعمیر کا آغاز ہی بجلی کے بحران کا دیرپا اور مستقل نوعیت کا حل ہے۔ ایک مجرمانہ غفلت یہ کی گئی کہ آزاد کشمیر، گلگت اور بلتستان میں پن بجلی کے بے بہا امکانات سے معمولی استفادہ بھی نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے بھارت کو یہ سہولت حاصل ہو گئی کہ وہ جہلم، سندھ اور چناب کا پانی اپنی مرضی سے استعمال کر سکے۔ آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات میں متعدد ڈیم بنائے جا سکتے تھے، ایسے کئی مقامات کی نشاندھی کی جا چکی ہے جہاں سے باآسانی 5000 میگاواٹ سے زائد بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ حکومت آزاد کشمیر نے 30 مختلف کمپنیوں کو جہلم، نیلم اور چند دیگر علاقوں میں بجلی پیدا کرنے کی اجازت بھی دی مگر ایک کے سوا کسی بھی پراجیکٹ پر تعمیراتی سرگرمیاں شروع نہ ہو سکیں۔ جس بجلی بحران کا پاکستان کو سامنا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے پانی سے بجلی پیدا کرنے کے آپشن کو استعمال کرنے کی شدید ضرورت ہے، اس کے لئے پانی کے جو بھی دستیاب وسائل ہیں ان سے ہنگامی بنیادوں پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

بجلی پر سبسڈی کے خاتمے اور پٹرولیم پر کاربن ٹیکسز کی شرط تو آئی ایم ایف نے لگا کر حکومت کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں لیکن کیا ڈیموں کی تعمیر اور دوسرے ذرائع سے توانائی کے حصول کی شرط بھی آئی ایم ایف یا ورلڈ بنک نے رکھی ہے یقیناً! ایسا نہیں ہے تو پھر کیوں اتنے اہم معاملات میں غفلت کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ ویسے تو یہ بھی کتنی بے بسی کی بات ہے کہ بجلی پر سبسڈی کے معاملے پر بھی ہمیں آئی ایم ایف کی ہدایات پر عمل کرنا پڑتا ہے اور سبسڈی ختم کرنے کی مہلت بڑھانے کے لئے ہمارے مشیر خزانہ کو امریکی حکمرانوں کی منت سماجت کرنا پڑتی ہے، اس غلامی سے نکلنے کا واحد حل بھی یہی ہے کہ توانائی کے شعبے میں خود کفالت حاصل کی جائے اور شاید اسی صورت ہم عالمی استعماری طاقتوں کے استحصال سے خود کو محفوظ رکھ سکیں گے۔ سبسڈی کا مقصد غریب عوام کی قوت خرید میں اضافہ کرنا ہوتا ہے تا کہ وہ روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھ سکیں، خود عالمی

طاقتیں اور خوشحال ممالک بھی کئی شعبوں میں اپنے عوام کو سبسڈی دیتے ہیں۔ امریکہ صرف زر
شعبے کو سالانہ 4 کھرب ڈالر کی سبسڈی فراہم کرتا ہے مگر پاکستان کے غریب عوام جن کی قو
خرید کمزور تر ہو چکی ہے، کے لئے اس سہولت کا استعمال شجر ممنوعہ قرار دی جا چکی ہے۔

آبی وسائل کو استعمال کرنے کے علاوہ بھی پاکستان کے سامنے کئی آپشنز ہیں جن کو بروئے کا
لا کر توانائی کے بحران پر قابو پایا جا سکتا ہے مثال کے طور پر صوبہ سندھ کے علاقے تھر میں دریافت
شدہ کوئلے کی مقدار 75 بلین ٹن کے قریب ہے، جبکہ دادو اور بدین میں بھی 10 بلین ٹن کوئلے
کے ذخائر موجود ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ سندھ کے کوئلے کو توانائی کے طور پر استعمال کرنے سے
پاکستان میں نہ صرف بجلی کی کمی دور ہو سکتی ہے بلکہ پاکستان بجلی کی پیداوار میں خود کفالت حاصل
کر کے بجلی برآمد کرنے والے ملکوں میں بھی شامل ہو سکتا ہے لیکن پاکستان میں موجودہ عالمی تیل
مافیا اور اس کے کارندے کوئلے کے ان ذخائر کو بطور ایندھن استعمال کرنے کی راہ میں سب سے
بڑی رکاوٹ ہیں۔ تیل مافیا کو خدشہ ہے کہ اگر سندھ کا کوئلہ توانائی کے ذریعے کے طور پر استعمال
ہونے لگا تو پاکستان میں آئل کمپنیوں کی دکانیں بند ہو جائیں گی۔ بے نظیر بھٹو نے بطور وزیر اعظم
1996ء میں سندھ میں موجود کوئلے کے ذخائر کو استعمال میں لانے کی کوشش کی تھی اور اس سلسلے
میں بیرونی کمپنیوں کے ساتھ کئی ایک معاہدے بھی ہوئے تھے لیکن عوام دشمن قوتوں نے ان کی
حکومت کے ساتھ تھر کول پراجیکٹ کو بھی ختم کر دیا۔ موجودہ حکومت نے بھی تھر کے کوئلے کو بطور
ایندھن استعمال کرنے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں تھر کول اینڈ انرجی بورڈ کے چیئرمین
اور سندھ کے وزیر اعلیٰ قائم علی شاہ نے گزشتہ سال واشنگٹن میں سرمایہ کاروں کی کانفرنس بھی منعقد
کی۔ معلوم نہیں کہ یہ منصوبہ کہاں تک پہنچا ہے، اگر یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے تو امکان ہے کہ
پاکستان میں بجلی کی لوڈشیڈنگ قصۂ پارینہ بن جائے گی۔ لیکن تیسری دنیا کے ممالک کے ساتھ
مسئلہ یہ ہے کہ وہ عالمی طاقتوں کے باعث اپنے وسائل بھی اپنی مرضی سے استعمال کرنے کی

پوزیشن میں نہیں ہیں۔ تھر کے کوئلے کے ذخائر توانائی میں ڈھلنے کے لئے کسی بہادر اور محب وطن
لیڈر کے منتظر ہیں۔ اگر یہ ذخائر صحیح طور پر استعمال ہو جاتے ہیں تو یہ اگلے 150 سالوں تک
پاکستان کی بجلی کی ضرورت پوری کر سکتے ہیں کیونکہ اس سے آئندہ دس بارہ سال میں ایک لاکھ میگا
واٹ تک بجلی پیدا ہو سکتی ہے۔

پرویز مشرف نے 30/اپریل 2005ء کو ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے
Alternative Energy Development Board قائم کیا تھا جس کا مقصد
ملک میں توانائی کے متبادل ذرائع تلاش کرنا تھا تاکہ توانائی کے بحران سے نمٹا جا سکے۔ حکومت نے
اس ادارے کو 2030 کا ٹاسک دیا تھا جس کے دوران اسے 9700 میگاواٹ بجلی کی پیداوار کا
ہدف پورا کرنا تھا۔ بورڈ نے اس سلسلے میں ہوائی اور شمسی توانائی پیدا کرنے کے کئی منصوبے بنائے،
جن میں سے کچھ پر عملدرآمد بھی شروع کیا گیا۔ اس سلسلے میں پہلا منصوبہ سندھ کے ضلع ٹھٹھہ کے
علاقے گھارو میں ہوائی چکیوں کی تنصیب کا تھا تاہم اب تک معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ منصوبہ کس
حالت میں ہے اور یہ ادارہ کیا کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ بجلی پیدا کرنے کے لئے ایٹمی انرجی بھی
استعمال ہو سکتی ہے جس کی طرف توجہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

لوڈشیڈنگ کے عذاب میں قوم کو مبتلا کرنے میں واپڈا کا بھی اہم کردار ہے جس پر لوٹ مار
کرنے والا طبقہ چھایا ہوا ہے۔ واپڈا کے معمولی اہلکار بھی بہتی گنگا میں نہا چکے ہیں اور اپنی آنے
والی کئی نسلوں کو غمِ روزگار سے بے نیاز کر چکے ہیں لائن مین کی سطح کے آدمی پوش علاقوں میں
کروڑوں روپے کے مکانوں میں رہائش پزیر ہیں۔ واپڈا کے کرپٹ ملازمین نے ہمیشہ اسے
خسارے میں رکھا ہے جبکہ ماہرین کے بقول واپڈا کو تربیلا ڈیم کی بجلی کا ایک یونٹ ڈیڑھ روپے
کے لگ بھگ پڑتا ہے جسے عام لوگ کس قیمت پر خرید رہے ہیں یہ سب صارفین جانتے ہیں۔ ایک
معمولی فہم رکھنے والا آدمی بھی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ تین سے پانچ گنا نرخ وصول کرنے کے باوجود

خسارہ کس طرح ہوسکتا ہے۔ کروڑوں روپے جولائن لاسز کی مد میں ڈالے جاتے ہیں انہی کرپٹ
اہلکاروں کی جیبوں میں جارہے ہیں۔ کرپشن کی لعنت سے نجات حاصل کئے بغیر اس بجلی بحران
سے نجات محال ہے۔

حیرت ہوتی ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ کالا باغ ڈیم پر صوبے رضامند نہیں۔ ایک سادہ سا
سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ساتھ دینے پر تمام صوبے، تمام سیاسی
جماعتیں، تمام پریشر گروپ تیار تھے، یقیناً نہیں۔ لیکن اس وقت کے فوجی آمر نے عالمی مفادات
کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور کمانڈو جرنیل نے ایک ٹیلی فون کال پر ان کی ہاں میں ہاں ملادی لیکن
اسی بہادر جرنیل کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ملکی سلامتی کے ضامن اور قومی نوعیت کے اہم منصوبے پر
بہادرانہ فیصلہ کرتے ہوئے اس کی تعمیر کا حکم دے دیتا۔ جب تن تنہا بلوچوں کے ہردلعزیز لیڈر کو
پہاڑی غاروں میں قتل کیا جاسکتا تھا اور صوبے کے عوام کے احساسات کو پامال کیا جاسکتا تھا، جب
ایک پرائی جنگ کو اپنے ملک لاکر لوگوں کو دہشت زدہ کیا جاسکتا تھا اور لوگوں کی رائے اور صوبائی
اتفاق رائے اس کے لئے غیر اہم قرار پاسکتا تھا اور جب ایک دور کے سٹریٹیجک پارٹنر طالبان کو
بیک جنبشِ قلم صفِ دشمناں میں کھڑا کیا جاسکتا تھا تو آبی ذخائر کی تعمیر پر ہردلعزیز فیصلوں کی ایسی
کیا ضرورت آپڑی تھی۔ مان لیتے ہیں اگر یہ منصوبہ کچھ لوگوں کو ناراض کرتا تو آخر لوگوں نے باقی
ناپسندیدہ فیصلے بھی تو قبول کئے تھے، لیکن چونکہ اِن منصوبوں کا فائدہ عالمی طاقتوں کو نہیں ہونا تھا
اس لئے یہ درخورِ اعتناء نہ سمجھے گئے اور آمر اپنے پورے دورِ حکومت میں 1 میگاواٹ بجلی پیدا کئے
بغیر ہی اپنی منطقی انجام کو پہنچ گیا۔

موجودہ دورِ حکومت میں بھی صورت حال کوئی اتنی زیادہ تبدیل شدہ نظر نہیں آتی اور یہ بھی عالمی
استعماری طاقتوں سے ''وفاداری بشرطِ استواری'' نبھارہے ہیں۔ پاکستانی خارجہ پالیسی تو کبھی
آزاد پہلے بھی نہیں رہی تھی مگر انہوں نے داخلی معاملات میں بھی عالمی طاقتوں کی غلامی کی روش اپنا

لی ہے اور آئی ایم ایف کے معاشی شکنجے میں خود کو گرفتار کرا کے ان کے فیصلے یہاں نافذ کرا رہے
ہیں۔ باقی رہ گئے پاکستان کے غریب عوام جو نہ صرف دہشت گردی، ڈرون حملوں اور خودکش
بمباروں کی زد میں ہے بلکہ غربت، جہالت، بے روزگاری، مہنگائی کے ساتھ ساتھ اب
لوڈشیڈنگ کے شاہی کوڑے بھی سہہ رہی ہے۔ سیاست دانوں، چوروں، لٹیروں اور مافیاز کے
لئے قانونی تحفظ اور این آر اوز موجود ہیں مگر ملک کے غریب عوام کے لئے نہ پارلیمنٹ میں قانون
سازی ہے نہ فیصلہ سازوں کا رحم لانہ رویہ۔ کبھی کسی آمر پر بھروسہ کرتے اور کبھی جمہوری حکومتوں
سے آس لگاتے غریب عوام آجکل سپریم کورٹ پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ مگر بقول فیض

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

وزیر پانی و بجلی بار بار ایک ہی رٹ لگا رہے ہیں کہ دسمبر تک لوڈشیڈنگ کا خاتمہ کر دیا جائے گا
مگر معلوم نہیں کہ ان کے پاس جادو کی ایسی کون سی چھڑی ہے جو چند ماہ میں سب کچھ نارمل کر دے
گی۔ صدر زرداری کی طرف سے بھی اعلان کیا گیا ہے کہ فی صوبہ 8 ڈیم کے حساب سے 32
نئے ڈیم تعمیر کئے جائیں گے، امید ہے مقتدر حلقوں کی طرف سے اس بار کئے جانیوالا وعدہ ایفا ہو
گا۔ وزیر اعظم کا فرمانا ہے کہ ''قوم دعا کرے کہ لوڈشیڈنگ کا جلد از جلد خاتمہ ہو جائے''۔ وزیر
اعظم کی معصومیت اور بھولپن اپنی جگہ مگر کوئی ہمارے چارہ سازوں کو یہ اطلاع دے کہ دعاؤں سے
تقدیریں نہیں بدلا کرتیں بلکہ دعاؤں سے لوگوں کے ضمیر بدلتے ہیں اور دعا کرنے کی ضرورت خود
ان کو ہوتی ہے جن کا بدلنا ضروری ہوتا ہے۔ عوام کی دعاؤں سے اگر بحران ٹلتے تو ہم کیوں مسلسل
ساٹھ سالوں سے دعاؤں کے باوجود بحرانوں کی زد میں ہوتے۔

(اگست 2009ء)

☆☆☆☆☆☆☆

شوگر مافیا کو بیوروکریسی نے بچالیا!

انسان نما درندے جن کے منہ کو گذشتہ کئی سالوں سے پاکستانی غریب عوام کا خون لگ چکا ہے اور جن پر وحشت و درندگی کا خصوصی دورہ عموماً رمضان المبارک کے مقدس و مطہر مہینے سے پہلے پڑتا ہے، ایک مرتبہ پھر رمضان المبارک سے پہلے حرکت میں آئے اور ان شیطانی چیلوں نے اس مرتبہ چینی پر حملہ کیا۔ یوں تو تمام اشیائے خورونوش ان کی درندگی کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں لیکن اس مرتبہ بطور خاص چینی کو کیوں نشانہ بنایا گیا اس کی تفصیلات بڑی لرزہ خیز لیکن عام پاکستان کے لئے نئی ہرگز نہیں کہ وہ اس کا ایک عرصہ سے شکار ہوتا آ رہا ہے۔ یہ شیطانی ڈریکولا پاکستانی عوام کا اتنا خون پی چکے ہیں کہ اب وہ انہیں اپنا خون پلانے کا عادہ ہوتے جا رہے ہیں۔

اگست کے پہلے ہفتے تک چینی بازار میں 35 روپے کلو تک آسانی سے دستیاب تھی لیکن اچانک دوسرے ہفتے میں اس کا ریٹ 50 تا 55 روپے فی کلو ہو گیا جو سمجھ سے باہر تھا، لوگ حیران تھے کہ اس مرتبہ چینی کا قحط کیسے گیا جبکہ حکومت کی طرف سے اس ضمن میں بھی کچھ نہیں کہا گیا اور اللہ کے فضل سے بدترین حالات اور اعمال کے باوجود ہمارے ہاں اجناس کی پیداوار اچھی ہی ہوتی ہے شاید اللہ تعالیٰ کو بھی یہی منظور ہے کہ اس مملکت خداداد میں لطیانی چیلوں چانٹوں کی

سازش کے باوجود غریب پاکستانی قحط کا شکار نہ ہوں لیکن یہ شیطانی ٹولہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں رہتا۔

شوگر مافیا نے اس مرتبہ جو طریق واردات اپنایا اُس کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں، ان لوگوں نے کوشش کی تھی کہ اس مرتبہ رمضان المبارک میں چینی کے نرخ 60 روپے کلو تک پہنچ جائیں جس کے لئے سرکاری ایوانوں میں موجود ان کے ساتھیوں اور شوگر مافیا کے کرتا دھرتا ملک مالکان کی محتاط حکمت عملی کے ذریعے اقتصادی رابطہ کمیٹی ECC کو نظر انداز کیا گیا، گذشتہ 9 ماہ کے دوران ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان (ٹی سی پی) کی فیصلہ سازی میں ہیری پھیری کی گئی اور شوگر مل مالکان اور تاجروں، جو سب سیاستدانوں کے اہلخانہ سے وابستہ ہیں کے لئے اربوں روپے کے فائدے کے لئے ملک میں چینی کی قیمتوں میں ناقابل اعتبار حد تک اضافے کا ہدف حاصل کیا گیا۔ ٹی سی پی کے ذرائع اور چینی کے ماہر تاجروں کے مطابق چینی کی قیمتوں میں انتہائی حد تک اضافے کا منصوبہ گذشتہ سال اس وقت بنایا گیا جب پاکستان کی سالانہ شوگر رپورٹ برائے 2009-10ء میں پیش گوئی کی گئی کہ ملک کی سالانہ 4.35 ملین ٹن کے مقابلے میں پیداوار 3.65 ملین ٹن رہے گی، لہٰذا سات لاکھ ٹن کی قلت کا امکان تھا۔ چینی کی نمایاں قلت کا علم پہلے سے ہی ہو جانے سے حکومت کی اقتصادی رابطہ کمیٹی (ECC) کو اس بات کا موقع دیا گیا کہ وہ جلد از جلد مناسب ٹیرف پر صاف اور خام چینی کی درآمد کے لئے آرڈر جاری کر کے طلب اور رسد کے فرق کو ختم کرے۔ یہ ایک ایسا اقدام تھا جس سے چینی کی قیمتیں مناسب حد پر برقرار رہتیں۔

شوکت ترین کے تحت اقتصادی رابطہ کمیٹی نے ٹی سی پی کو ہدایت دی کہ وہ اپنے چینی کے ذخائر کو بہتر بنانے کے لئے دو لاکھ ٹن چینی درآمد کرے اور تخمینہ لگاتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس عمل کو فوراً مکمل کیا جائے کیونکہ آئندہ ہفتوں میں چینی کی عالمی قیمتوں میں اضافے کا امکان تھا۔

اقتصادی رابطہ کمیٹی کا اجلاس تین فروری 2009ء کو بھی ہوا جس میں ٹی سی پی کو محتاط ہدایت دی

گئی کہ اپنے ذخائر سے یوٹیلٹی سٹورز کو ایک لاکھ ٹن چینی جاری کرے تاکہ چینی کی بڑھتی قیمتوں کی
روایت کو ختم کیا جاسکے۔

چینی کی قیمتوں کی افواہوں پر پھلنے پھولنے والے بااثر شوگر مل مالکان اور ڈیلرز جانتے تھے کہ
عملدرآمد ہوا تو اقتصادی رابطہ کمیٹی کا فیصلہ چینی کی قیمتوں میں تیزی سے اضافے کے نمایاں
امکانات ختم کردے گا اور اگر ای سی سی کا فیصلہ کچھ عرصے کے لئے ملتوی کردیا جائے تو اس سے
چینی کی خرید وفروخت کے نتیجے میں ان کی قسمت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ ان بااثر کھلاڑیوں
کے اثر ورسوخ نے سرکاری حلقوں میں اپنا کام دکھایا، ایک طرف ٹریڈنگ کارپوریشن آف
پاکستان نے دولاکھ ٹن چینی کی فوری درآمد کے فیصلہ پر عارضی طور پر عملدرآمد روک دیا اور اپنے
ذخائر سے یوٹیلٹی سٹورز کو ایک لاکھ ٹن چینی بھی جاری نہیں کی جبکہ دوسری طرف اقتصادی رابطہ کمیٹی
نے فیصلہ کیا کہ چینی کی درآمد کے حوالے سے ای سی سی کے فیصلے پر عملدرآمد نہ کرنے پر ٹی سی پی کی
جانب سے کی جانے والی پراسرار تاخیر پر اس سے جارحانہ انداز میں سوالات نہیں کئے جائیں
گے۔

12 مارچ 2009ء کو ہونے والے اقتصادی رابطہ کمیٹی کے اجلاس میں ٹی سی پی کی کھچائی نہیں
کی گئی تھی کہ ای سی سی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ یوٹیلٹی سٹورز کو 34 روپے فی کلوگرام کے
نرخوں پر ایک لاکھ ٹن چینی جاری کرنے کے پہلے کے احکامات کی بجائے چینی 38 روپے فی
کلوگرام کے نرخوں پر جاری کی جائے۔ اس اقدام کا مقصد مقامی مارکیٹ میں چینی کی قیمتوں کے
بڑھتے اثر کو کم کرنا تھا۔ اس پورے واقعے میں جو بات اسے مزید پراسرار بناتی ہے وہ یہ ہے کہ ای
سی سی کے یوٹیلٹی سٹورز کے ذریعے 38 روپے فی کلوگرام کے کنٹرولڈ نرخوں پر چینی فروخت کرنے
کے احکامات پر تاحال عملدرآمد نہیں ہوا اور کراچی میں چینی کی قیمتیں ریکارڈ سطح یعنی 52 روپے فی
کلوگرام تک پہنچ چکی ہیں۔ ایک ایسے موقع پر جب چینی کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے فروری

میں، جب عالمی سطح پر قیمتیں درمیانی سطح پر تھیں، چینی کی درآمد کے لئے دیا جانے والا آرڈر ٹی سی
پی کی بیوروکریسی میں پھنسا ہوا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مئی اور جون میں 50 ہزار ٹن چینی کی
درآمد کے لئے ٹی سی پی کی جانب سے جاری کئے جانے والے ٹینڈر کو بھی ٹی سی پی کی جانب سے
منسوخ کردیا گیا، جس کی وجہ سے بھی چینی کی قیمتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ چینی کی مافیا کی جانب سے
اٹھائے جانے والے فائدے کی یہ ایک اور مثال ہے۔

اقتصادی رابطہ کمیٹی کے اجلاس کی صدارت کرنے والے وفاقی وزیر خزانہ شوکت ترین نے اس
سلسلے میں معروف تجزیہ نگار کامران خان سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ”یہ سنجیدہ نوعیت کا معاملہ
ہے اور اقتصادی رابطہ کمیٹی کے اجلاس میں ہم نے ٹی سی پی کی جانب سے ای سی سی کے فیصلے کی
خلاف ورزی کی تحقیقات کا حکم دیا ہے“۔ انہوں نے نشاندہی کی، ”اس بات میں کوئی شک وشبہ
نہیں ہے کہ ٹی سی پی کی جانب سے ای سی سی کے فیصلے کی کھلی خلاف ورزی نے ملک بھر میں چینی کی
قیمتوں میں زبردست اضافے میں کردار ادا کیا ہے“۔ انہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ
زبردست منافع کی خاطر چینی کے بڑے ذخائر کی ذخیرہ اندوزی کی گئی ہے۔ انہوں نے اس بات کا
انکشاف کیا کہ انہیں آگاہ کیا گیا ہے کہ یوٹیلٹی سٹورز کو اپنے ذخائر سے ایک لاکھ ٹن چینی جاری
کرنے کے لئے ٹی سی پی کو ای سی سی کی جانب سے دی گئی ہدایت پر عملدرآمد میں تاخیر کرنے کی
ہدایت ایک بااثر وفاقی وزیر نے دی تھی۔ انہوں نے مذکورہ وزیر کا نام نہیں بتایا تاہم اتنا کہا کہ اس
سلسلے میں تحقیقات ہورہی ہیں۔ انہوں نے آگاہ کیا کہ انہوں نے اب ٹی سی پی کو ہدایت دی ہے
کہ وہ ای سی سی کے پہلے فیصلے کے تحت ہر ماہ 38 روپے فی کلوگرام کے خوردہ نرخ پر یوٹیلٹی سٹورز کو
70 ہزار ٹن چینی جاری کرے۔ انہوں نے کہا، ”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم اس بات کو یقینی
بنائیں گے کہ یوٹیلٹی سٹورز سے چینی بھاری منافع کمانے والوں کی بجائے عام لوگوں تک پہنچے
اس سے پہلے ملک میں چینی کی قیمتوں میں زبردست اضافے کو یقینی بنانے کے لئے انتہائی

شاطرانہ انداز سے اقدامات کیے گئے، حکومتی وابستگیاں رکھنے والی بااثر لابی نے گذشتہ سال ستمبر میں اس وقت سٹریٹیجک اقدامات کئے جب طلب اور رسد کے فرق کو ختم کرنے کے لئے خام چینی درآمد کرنے کی تجویز متعلقہ سرکاری محکموں کی جانب سے مسترد کر دی گئی۔

چینی کی تجارت سے وابستہ ذرائع کے مطابق کم رسد کی وجہ سے چینی کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے جبکہ رمضان کی وجہ سے چینی کی طلب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف شوگر کمپنیوں اور بڑے ڈیلرز کی جانب سے ایڈوانس فروخت اور ایڈوانس ڈلیوری کے نام پر بڑی مقدار میں چینی کی ذخیرہ اندوزی کی جا رہی ہے۔ ٹریڈ انڈسٹری کے ایک باخبر ذریعے کے مطابق، "یہ لوگ رمضان المبارک کے آغاز کے لئے چینی کے بڑے ذخائر محفوظ کر رہے تھے اور جب قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہوں گی اس وقت یہ ذخیرہ کیا ہوا سٹاک مارکیٹ میں جاری کیا جائے گا تاکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جا سکے"۔ وزیر خزانہ شوکت ترین کا کہنا ہے کہ اہم کھلاڑیوں کی جانب سے کی جانے والی اس ذخیرہ اندوزی نے چینی کی قیمتوں کے حوالے سے ملک میں بحرانی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے لیکن اس مرتبہ کے سکینڈل میں چینی کی قیمتوں میں ہونے والے اضافے کی نظیر نہیں ملتی کیونکہ عام پاکستانی صارف کو انتہائی ضرورت کی چیز کے لئے انتہائی بھاری قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ ایسا ہی ایک سکینڈل پرویز مشرف کی ناک کے نیچے سامنے آیا تھا جب چینی کی قیمت اس وقت کی انتہائی حد یعنی 35 روپے فی کلوگرام تک پہنچ گئی تھی۔ قومی احتساب بیورو (نیب) کی تفتیش کے نتیجے میں اس سکینڈل میں پرویز مشرف حکومت کے کچھ قریبی ساتھیوں کے نام سامنے آئے تھے۔

کامران خان کی کی روزنامہ جنگ میں اس رپورٹ کی اشاعت کے اگلے ہی روز 14 اگست کو جب قوم یوم آزادی منا رہی تھی اور یہ آدم خور درندے اپنی دانست میں خود کو بالکل محفوظ سمجھ کر اگلی لوٹ مار کی پلاننگ کر رہے تھے اچانک وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف آفت ناگہانی بن کر ان

پر ٹوٹے، 14 اگست کو ان درندوں کے خلاف سرچ آپریشن شروع ہوا جس میں پنجاب کے مختلف شہروں سے لاکھوں کی تعداد میں چینی کی بوریاں گوداموں سے برآمد کی گئیں۔

ساری قوم میاں شہباز شریف کے اس اقدام پر اُن کو خراج تحسین پیش کر رہی تھی اور اُمید کر رہی تھی کہ وہ اس ضمن میں ایسی مثال قائم کریں گے کہ لوگ انہیں ہمیشہ یاد رکھیں لیکن بیوروکریسی آڑے آئی اور ان مجرموں کو خاصی چھوٹ مل گئی۔

کاش پنجاب کے وزیر اعلیٰ یہ روایت قائم کریں کہ جس علاقے سے اسی طرح سٹاک کی گئی اجناس برآمد ہوں وہ مالکان کے سامنے اسی علاقے کے محتاجوں اور مجبوروں میں مفت تقسیم کر دی جائیں لیکن "بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے گا کون؟"

(ستمبر 2009ء)

پاکستانی معیشت کا کینسر

1689ء میں یہودیوں نے اپنی سازشوں اور مالی امداد سے ہالینڈ کے ایک باشندے William Stradholder کو انگلستان کا بادشاہ بنوا دیا تھا اور اسے کاروبارِ مملکت چلانے کے لئے ساڑھے بارہ لاکھ پاؤنڈ قرض بھی دیا تھا۔ اس احسان کا بدلہ چکانے کے لئے اس بدیسی بادشاہِ انگلستان نے یہودیوں کو ''بنک آف انگلینڈ'' قائم کرنے کا چارٹر عطا کیا اور اس بنک کو ایسی ایسی ناجائز مراعات دیں جو انگلستان کو یہودیوں کے ہاتھ کوڑیوں میں فروخت کر دینے کے مترادف تھیں۔ ہمارے زمانے کے بنک اسی بنک آف انگلینڈ کی ذریت ہیں۔ اسلام میں سودی کاروبار حرام ہے اور ہمیں پاکستان میں بنکوں کو کام کرنے کی اجازت دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، مگر پاکستان اتنے مشکل حالات میں بنا تھا اور اتنے مسائل کا شکار تھا کہ یہاں کی حکومت سود کے خاتمے کی طرف فوری توجہ نہیں دے سکی۔ پھر بھی قائداعظمؒ نے سٹیٹ بنک کے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ میں دلچسپی لی اور یہ امید ظاہر کی کہ یہ ڈیپارٹمنٹ پاکستانی مالیاتی نظام کو اسلامی اقدار کے سانچے میں ڈھالے گا مگر قائداعظمؒ کی زندگی نے وفا نہیں کی اور ملک لٹیروں کے ہاتھ میں چلا گیا تو بنکوں کی گویا لاٹری کھل گئی۔ ان پر سے ہر طرح کا کنٹرول ہٹایا جانے لگا اور انہیں ملک کی دولت لوٹنے کا

پورا پورا موقع فراہم کیا گیا۔ بنکوں نے بھی دانستہ Bad Debts دے دے کر اور پھر معاف کر کر کے صاحبانِ اختیار کی جیبیں رشوت سے بھر دیں۔ اب اس وقت ملک کی مالیاتی صورت حال یہ ہے کہ جتنے کرنسی نوٹ سٹیٹ بنک میں ذخیرے میں ہیں یا نئے چھاپ کر سٹیٹ بنک میں جمع کئے جاتے ہیں وہ ''منی مارکیٹ'' کے کنٹرول میں ہیں اور حکومت اور عوام کے پاس صرف وہ کرنسی نوٹ ہیں جو پہلے سے ان کے درمیان زیرِ گردش ہیں۔ یہ ایک ''جوئے کم آب'' ہے جو عوام اور حکومت کے درمیان چکر لگاتی رہتی ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی یا ضروریات کے متناسب اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اگر اضافہ ہوتا ہے تو وہ سودی قرض کی صورت میں ہوتا ہے جو حکومت/عوام سٹیٹ بنک/بنکوں سے لیتے ہیں اور جتنا لیتے ہیں معہ سود اس سے زیادہ واپس کرتے ہیں جس کے نتیجے میں حکومت اور عوام کے درمیان زیرِ گردش کرنسی نوٹ مزید کم ہو جاتے ہیں جبکہ آبادی اور ضروریات بڑھ چکی ہوتی ہیں۔ اس سے حکومت اور عوام غریب سے غریب تر ہو جاتے ہیں۔ ان دو فریقوں، حکومت اور عوام، میں چونکہ حکومت طاقتور اور عوام کمزور ہیں اس لئے حکومت زیرِ گردش کرنسی نوٹوں کا بڑا حصہ ٹیکسوں کی شکل میں عوام سے جبراً لے لیتی ہے اور انہیں مفلسی کے سمندر میں غوطے کھانے کے لئے چھوڑ دیتی ہے اس طرح پاکستان کی آبادی دو طبقات میں تقسیم ہو گئی ہے۔ 1۔ عیش و عشرت میں غرق حکمران اور 2۔ مفلسی کا شکار عوام۔ دولت کی فراوانی سے حکمرانوں میں بے انتہا اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جبکہ مفلسی کے شکار عوام ہر طرح کے مجرموں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے دشمنوں خصوصاً بھارت اور اسرائیل نے اس صورت حال سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ بھارت نے پاکستان کو حالتِ جنگ میں رکھ کر حکومت پاکستان پر اخراجات کا پہاڑ لاد دیا ہے جو ان کے عیش و عشرت پر ہونے والے اخراجات کے علاوہ ہے جبکہ اسرائیل نے ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے پاکستان کو بیرونی قرضوں کے جال میں پھنسوا دیا۔ واضح ہو کہ تمام بین الاقوامی قرض دینے والے ادارے یہودیوں کے کنٹرول میں ہیں۔ پھر قرضوں کے دباؤ

میں پاکستان کے حکمرانوں سے پاکستان کی اسلامی حیثیت ختم کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے لئے انگلش میڈیم تعلیمی ادارے کو استعمال کر رہے ہیں۔ ٹی وی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کم کم ارکانِ حکومت ٹائیسوٹ کو قومی لباس اور انگریزی کو حکومت کی زبان بنا چکے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر آنے والی خواتین سے ان کی زینت کی چیزیں جنہیں اللہ نے چھپانے کا حکم دیا ہے ظاہر کروائی جا رہی ہیں۔ عورتوں کا مرد ڈاکٹروں سے علاج کرایا جا رہا ہے (معہ زچگی کے) اور مخلوط تعلیمی ادارے قائم کئے جا رہے ہیں جبکہ خود انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں عورتوں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ ہسپتال اور تعلیمی ادارے قائم کئے جہاں ان کے پردے کا اطمینان بخش انتظام ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ٹرینوں میں عورتوں کے لئے علیحدہ ڈبے ہوتے تھے جہاں وہ اطمینان سے لیٹ بیٹھ سکتی تھیں۔ پاکستان میں یہ سب تقریباً ختم کر دیا گیا ہے۔ ہمارے حکمران انگریوں سے زیادہ انگریز بننے کی کوشش کر رہے ہیں، ان سب کوششوں کے پس پردہ ان کی اسلامی پابندیوں سے آزاد زندگیب بسر کرنے کی خواہش ہے کہ جو جی چاہے کریں انہیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے، پوچھنے والے تو مغربی معاشرے میں بھی ہوتے ہیں، البتہ جنسی آزادی پر وہاں روک ٹوک نہیں ہوتی مگر باہمی رضامندی شرط ہے۔

پاکستان قدرتی وسائل اور دیگر ذرائع آمدنی سے مالا مال ہے اور اسے قرضوں کے جال سے نکال کر ترقی یافتہ فلاحی مملکت بنانا بہت آسان ہے، اس کے لئےصرف سودی کاروبار کو غیر قانونی قرار دے کر کرنسی کو حکومت کے کنٹرول We control the currency and we do not care who makes the other Laws. (Jewish Baukers) میں لینا ہوگا جس کے لئے سٹیٹ بنک کو "بنکوں کے بنک" کے بجائے "قومی خزانہ" قرار دینا ہوگا اور اسے ہمیشہ کرنسی سے بھرا ہوا رکھنا ہوگا۔ اس کے بعد حکومت اپنے اخراجات پورے کرنے کے ئے اور ملک کو ترقی یافتہ فلاحی مملکت بنانے کے لئے قومی خزانے کو

بلاخوف "افراط زر" استعمال کرے اور عوام سے کوئی ٹیکس نہ لے۔ اس طرح حکومت اور عوام دونوں کے پاس سرمائے کی فراوانی ہوگی۔ پبلک اور پرائیویٹ دونوں سیکٹروں میں تمام ترقیاتی اور فلاحی کام ایک ساتھ شروع کئے جاسکیں گے۔ بیروزگاری کا نام ونشان مٹ جائے گا قوم کے بچے بچے کی ضروریات زندگی ان کے سرپرست خرید سکیں گے۔ پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ ہوگا۔ ہماری سستی پیداوار/مصنوعت کو بیرونی مارکیٹوں میں خوش آمدید کہا جائے گا اور ہم آئندہ کبھی بیرون ممالک کے ساتھ ادائیگیوں کے عدم توازن کا شکار نہیں ہوں گے......انشاءاللہ۔

ابتدائی چند سالوں کے علاوہ پاکستان میں جمہوریت نہیں لٹیروں کی حکومت رہی ہے جو عوام کی سادگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں کے قدیم فارمولے تقسیم کرو اور حکومت کرو (Divede and Rule) پر عمل کر کے اقتدار پر قبضہ کرتے ہیں اور پھر قدرتی وسائل سے دولت پیدا کرنے کے بجائے ملک میں موجودہ دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے میں لگ جاتے ہیں۔ یہ لٹیرے پاکستان میں نفاذ اسلام کے سخت ترین مخالف ہیں کیونکہ اس سے ان کے لوٹ مار کے مواقع جاتے رہیں گے اور یہ اب تک نہ صرف نفاذِ اسلام کو روکنے میں کامیاب رہے ہیں بلکہ انہوں نے قوم کے اخلاق کو اتنا خراب کر دیا ہے کہ وہ اب نفاذ اسلام کا تقاضہ بھی نہیں کرتی اور تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر بیٹھ گئی ہے۔

جب لٹیروں کی بُری حکومت عوام کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو فوج کو مداخلت کرنی پڑتی ہے۔ فوج کے حکومت میں آنے پر عوام مٹھائی بانٹتے ہیں اور حکومت کو استحکام حاصل ہو جاتا ہے مگر یہودیوں کے آلہ کار بین الاقوامی سازشی فوجی حکومت کو بھی چلنے نہیں دیتے۔ کیونکہ پاکستان کو تباہ کرنا ان کے پیش نظر ہے، عوام کی بدقسمتی سے ملک میں عوام دوست لیڈروں کا قحط ہے اور جو بطور استثنٰی ہیں بھی ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز کے مانند ہے۔ پاکستان میں مذہب ایک بڑی طاقت ہے مگر فرقہ بندی نے مذہبی قوتوں کی ہوا اکھاڑ دی ہے اور انہیں غیر مؤثر

کر کے رکھ دیا ہے ورنہ قرارداد مقاصد اور 22 (وضاحتی) نکات کو اس طرح آئین میں دفن نہیں کر دی جاتا جس طرح کر دیا گیا ہے۔ غضب خدا کا سودی لین دین کرنا اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کرنا ہے اور پاکستان میں یہ لین دین 62 سال سے زور وشور سے جاری ہے اور مذہب کے ٹھیکیدار منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔ ذرا آواز نہیں نکالتے بروز حشر یہ اللہ کو کیا جواب دیں گے؟ یہ صاحب علم لوگ ہیں مگر انہوں نے کبھی تحقیق کر کے عوام کو جلسہ ہائے عام میں نہیں بتایا کہ ان کی غربت، فاقہ کشی اور تمام مصائب اور حکومت کی کشکول برداری ملک پر مسلط سودی نظام کی وجہ سے ہے اگر بتاتے اور تحریک چلاتے تو عوام ججوں کی بحالی کی تحریک سے زیادہ ان کا ساتھ دیتے اور عوامی تحریک کے سیلاب میں سودی نظام مالیات جھاگ کی طرح بہہ جاتا مگر ہمارے علمائے کرام نے جدید بنکنگ کے مضمرات پر کوئی تحقیق نہیں کی۔ کیا تو یہ کیا کہ اسلامی بنکنگ کے جائز ہونے کا فتویٰ دے دیا جس سے اسلامی بنکنگ کی ایک کھڑکی کھول کر سودی بنکنگ زور وشور سے جاری ہے اور پاکستان میں روز ایک نیا بنک معہ اسلامی بنکنگ کی کھڑکی کے کھل رہا ہے۔ اسلامی بنکنگ کے جائز ہونے کا فتویٰ دینا ایسا ہے جیسا تاڑی (تاڑ کے درخت سے نکلنے والا نشہ آور مشروب) پینے کے جائز ہونے کا فتویٰ دینا جبکہ شراب پینے سے بچنے کے لئے تاڑی پینے سے بچنا ضروری ہے یا ہیروئن سے بچنے کے لئے سگریٹ سے بچنا ضروری ہے ورنہ ایک قدم اٹھا لینے کے بعد دوسرا قدم اٹھانا آسان ہو جاتا ہے۔ خود امریکہ والوں نے تحقیق کر کے دنیا پر یہودیوں کے غلبے کا سبب سودی نظام کو بتایا ہے اور آج جو مالیاتی بحران آرہے ہیں وہ بھی اسی نظام کے سبب سے ہیں اور یہ بحران آتے نہیں لائے جاتے ہیں۔ مفصل معلومات کے لئے صرف ایک کتاب "Pawns in the game" کا مطالعہ کرلیں جو امریکن William Guy Carr نے لکھی ہے۔

پاکستان میں بنکوں کو جو ناجائز مراعات دی گئی ہیں ان کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ مراعات

یہودیوں کو انگلستان کے ایک بادشاہ ولیم آف آرینج نے دی تھیں جسے انگلستان کا شہری نہ ہونے کے باوجود یہودیوں نے انگلستان کے تخت پر بٹھایا تھا۔ ہم نے یہ مندرجہ ذیل مراعات بنکوں کو کیوں دی ہوئی ہیں جن کی وجہ سے ہمارے عوام بھوک کے مر رہے ہیں اور حکومت دنیا میں بھیک مانگتی پھر رہی ہے؟ جبکہ دائمی قدرتی وسائل، انسانی لیاقت محل وقوع وغیرہ کی بنیاد پر پاکستان کو علاقے کا امیر ترین ملک بنایا جا سکتا ہے۔

☆...... ہم نے اپنی کرنسی کا مکمل کنٹرول بنکوں کے ہاتھ میں کیوں دیا ہوا ہے کہ حکومت بھی اسے خرچ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی جبکہ بنک اسے سود پر چلاتے ہیں (IMF پاکستان کی معیشت کا گلا گھونٹنے کے لئے اس کی بھی مخالفت کرتی ہے کہ یہ کرنسی حکومت کو بطور سودی قرض بھی دی جائے)۔

☆...... ہم نے عوام کے ڈیپازٹ کا 90% بنکوں کو سود پر چلانے کا اختیار کیوں دیا ہوا ہے۔

☆...... ہم نے عوام کے Deposit سے دس گنا زیادہ کی پرائیویٹ کرنسی (مثالیں: کریڈٹ کارڈ، قرض کی چیک بک) بنکوں کو سود پر چلانے کی اجازت کیوں دی ہوئی ہے۔

☆...... ہم نے بنکوں کو کھاتے داروں (Depositors) اور قرضہ داروں سے من مانے Charjges وصول کرنے کی اجازت کیوں دی ہوئی ہے۔

بنک کس طرح ملک کو لوٹ رہے ہیں اس کا پتہ اسمبلی میں پوچھے گئے صرف ایک (مندرجہ ذیل) سوال سے چل جائے گا:

"یہ معلومات سٹیٹ بنک سے حاصل کر کے بتائی جائیں کہ بنکوں کے مالکان نے پاکستان میں اپنا بنک قائم کرنے میں اپنا کتنا سرمایہ لگایا اور انہیں ہر سال ٹیکس ادا کرنے سے پہلے اور بعد کتنا منافع ہوا؟ (آسانی کے لئے صرف پچھلے پانچ سال کے اعداد و شمار حاصل کئے جائیں)"

اگر ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ملک میں سودی کاروبار معہ اسلامی بنکنگ کو غیر قانونی قرار

دے دیں تو ملک کی کایا پلٹ سکتی ہے اور یہ امن وآشتی اور خوشحالی اور فارغ البالی کا گہوارہ بن سکتا ہے۔اس کے لئے ہمیں مندرجہ ذیل اقدام اٹھانے ہوں گے:

1- سٹیٹ بنک کو قومی خزانہ قرار دینا ہوگا۔

2- ملک کو ترقی یافتہ فلاحی مملکت بنانے کے لئے حکومت کو اس خزانے کو استعمال کرنے کا پورا اختیار دینا ہوگا۔

3- حکومت کو تمام ٹیکس ختم کرنے ہوں گے کیونکہ وہ اپنا خرچ عوام کے خزانے سے پورا کر رہی ہوگی۔

4- عوام کو ڈاکخانوں میں روپیہ رکھنے کی فری سہولت دینا ہوگی۔

(ستمبر 2009ء)

پاکستان کو بنجر کرنے کا خوفناک بھارتی منصوبہ

پانی انسانیت کی بقا کے لئے کتنا ناگزیر ہے اس کا اندازہ شاید پیاس سے مرنے والوں نے ضرور لگایا ہوگا کیونکہ کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ اس موت کی شدت کو الفاظ میں بیان کر سکے، آپ نے افریقہ کے صحراؤں کی وہ تصاویر دیکھی ہوں گی جہاں ریت پر گرائے جانے والے مکئی کے دانے لوگ ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے اکٹھے کرتے ہیں کہ اُن کی زمینیں پانی کی کمی سے بانجھ ہو چکی ہیں، یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا حال کیا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بھارت نے پاکستان کو پانی سے محروم کر کے ایک ایسی جنگ کا آغاز کر دیا ہے جس کا انجام سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔

قوم کو یاد ہی ہوگا کہ ہمارے صدر کے دورہ امریکہ میں من موہن سنگھ نے یہ کہہ کر ہم سب کا من موہ لیا تھا کہ ''سندھ طاس معاہدے پر اس کی روح کے مطابق عمل کیا جائے گا''۔کیا ہوا، جو اس نے چناب کا پانی روکنے کے لئے غیر قانونی طور پر دریائے چناب پر بگلیہار ڈیم تعمیر کر لیا ہے۔دریائے سندھ کا 40 فیصد پانی ایک خفیہ سُرنگ کے ذریعے چوری کر کے دریائے برہم پترا میں ڈال رہا ہے اور اس سے بھی معاہدے کی روح پر بھلا کیا اثر پڑے گا کہ وہ دریائے سندھ کے

اوپر کارگل کے مقام پر ایک بہت بڑا کارگل ڈیم بنا رہا ہے، جو دنیا کا تیسرا بڑا ڈیم ہوگا، جس کے بعد دریائے سندھ کی حیثیت ایک برساتی نالے سے زیادہ نہیں رہ جائے گی۔ بھارت در سندھ میں گرنے والے ندی نالوں پر بھی 14 چھوٹے ڈیم بنا رہا ہے، اسی طرح جہلم سے ایک بگلیہار سے دو نہریں نکال کر راوی میں ڈالی جا رہی ہیں اور راوی کا پانی ستلج میں ڈال کر راجستھان لے جایا جا رہا ہے، جہلم پر 12 اور چناب پر مزید 20 چھوٹے ڈیم بنائے جانے کے منصوبوں بھی کام جاری ہے اور یہ تمام آبی تجاوزات ان دریاؤں پر ہو رہی ہیں، جو سندھ طاس معاہدے کے تحت پاکستان کے حصے میں آئے ہیں اور معاہدے کے مطابق ان دریاؤں کے پانی روکنے ان پر ڈیم بنانے کا بھارت کو کوئی حق نہیں ہے لیکن ظاہر ہے ان چھوٹی بڑی خلاف ورزیوں معاہدے کی روح پر بھلا کیا اثر پڑتا ہے، جب ہی تو حکومت اتنی مطمئن نظر آ رہی ہے۔ یہ ''سرکا خاموشی'' بھارت کو مزید شہ دینے کے برابر ہے، جو ہمارے ملک کو دھیرے دھیرے صحرا بنانے منصوبے پر کام کر رہا ہے۔

بھارت کی تاریخ عہد شکنی سے عبارت ہے، اس نے کبھی کسی معاہدے اور قانون کی پابند نہیں کی، چاہے وہ مسئلہ کشمیر ہو، سرکریک تنازع ہو یا آبی مسائل، وہ ہر مسئلے کو بات چیت کے ذریعے حل کرنے کا خواہش مند تو ضرور نظر آتا ہے لیکن برسوں کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ کسی بھی مسئلے کے حل میں تعطل پیدا کر دینے کا یہی بہترین ہتھکنڈا ہے، جسے بھارت مہارت سے استعمال کرتا ہے۔

کیا ایسا کوئی نہیں، جو بھارت کو آئینہ دکھائے؟ دریائے چناب کے پانی میں سے سات سے آٹھ ہزار کیوسک پانی بھارت روزانہ چوری کر رہا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ پنجاب کی اس وقت تمام نہریں بند ہو چکی ہیں، ان میں ریت اُڑ رہی ہے۔ ساہیوال، اوکاڑہ، ملتان، ایسٹرن بار اور ویسٹرن بار کے 35 لاکھ ایکڑ رقبے پر کھڑی فصلیں تباہ ہو رہی ہیں۔ جون سے اب تک پنجاب

سندھ کی سوا کروڑ اراضی پانی کی کمی سے دوچار ہے۔ یہی صورت حال برقرار رہی تو خدانخواستہ شہ ہے کہ کہیں یہاں ایتھوپیا اور صومالیہ جیسے حالات پیدا نہ ہو جائیں اور شمالی کوریا اور روانڈا کی رح ہماری انتہائی زرخیز زرعی زمینیں اجاڑ، ویران اور بے آباد نہ ہو جائیں۔ حیرانی کی بات یہ ہ کہ اس سنگین صورت حال پر کوئی بات بھی نہیں کر رہا۔ پچھلی حکومت سے تو خیر کسی کو کوئی امید ہی ں تھی لیکن موجودہ حکومت......؟ ایک خاموشی ہے، ہر بات کے جواب میں! کیا اس مسئلے کے رتا دھرتا، اس خاموشی کا کوئی تسلی بخش جواز پیش کر سکتے ہیں؟

برصغیر کی تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کے مابین 18 دسمبر 1947ء کو ایک معاہدہ کیا گیا جس کی ے سے دونوں ممالک کے درمیان پانی کی تقسیم ملکوں کی تقسیم سے پہلے والی پوزیشن ہی پر رکھنی تھی لیکن آٹھ ماہ سے بھی کم مدت کے اندر بھارت نے بغیر کسی پیشگی اطلاع کے آب پاشی کے لئے صوص ہر اس نہر کو بند کر دیا جو فیروز پور اور گورداس پور سے نکل کر دونوں ملکوں کی سرحد عبور کر رہی تھی۔ بھارت کی اس کارروائی کے باعث پاکستان کی کھڑی فصلوں کو شدید نقصان پہنچا۔ بھارت کا مطالبہ تھا کہ بھارتی پنجاب سے گزرنے والے تمام دریاؤں پر پاکستان، بھارت کا حق تسلیم کرے وران کے پانی پر پاکستان (پنجاب) کے باشندوں کے حق اور حصے کا مطالبہ نہ کرے۔ اس کے برعکس پاکستان کا مطالبہ تھا کہ پانی کے استعمال یا کھپت کی موجودہ صورت حال جوں کی توں رہنے دی جائے، البتہ زائد پانی کو دونوں ممالک کے رقبے اور آبادی کے لحاظ سے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے اس مطالبے کو متعدد معاہدوں اور ملکوں کی حمایت حاصل تھی لیکن اپریل 1948ء کو بھارت نے ایک بار پھر پاکستان کو دریاؤں کے پانی کی فراہمی روک کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کسی معاہدے اور اخلاقیات کو نہیں مانتا۔ اس آبی بحران سے نمٹنے کے لئے پاکستان کے ایک وزارتی وفد کو نئی دہلی کا ہنگامی دورہ کرنا پڑا اور پانی کی بحالی کے لئے بات چیت کرنا پڑی۔ ان مذاکرات میں بھارت نے اصرار کیا کہ مشرقی جانب سے آنے والے تمام دریاؤں پر پاکستان، بھارت کی

ملکیت کا حق تسلیم کرے، بھارت کا یہ مطالبہ سراسر غلط تھا، کیونکہ 1921ء کے بارسلونا کنونشن کے مطابق، جس کا رکن بھارت بھی تھا، کسی بھی ملک کو ایسے دریاؤں کا پانی روکنے یا ان کا رخ تبدیل کرنے کا قطعی کوئی حق حاصل نہیں، جو کسی ملک کی سرحد عبور کر کے پڑوسی ملک میں داخل ہوتے ہیں۔ مذکورہ کنونشن کے مطابق کسی ملک کو دریاؤں کے پانی کی اس حد تک اور اس طریقے سے استعمال کی اجازت بھی حاصل نہیں کہ اس کے پڑوسی ملک کی زمینیں سیراب نہ ہو سکیں یا وہ پانی کو درست طور پر استعمال نہ کر سکے لیکن ہر قاعدے اور قانون سے خود کو ماورا سمجھنے والے

بھارت نے اس کنونشن کو بھی اپنی ٹھوکر پر رکھا۔ بھارتی رویے سے مجبور ہو کر پاکستان نے بین الاقوامی عدالت انصاف سے رجوع کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس دوران بھارت نے دریائے بیاس اور ستلج کے بالائی حصے میں، فیروز پور سے آگے ہریک کے مقام پر بیراج کی تعمیر شروع کر دی اور بھاگرا کی ڈیم سائٹ پر بھی کام شروع کر دیا۔ پاکستان کی ہر کوشش، ہر اعتراض اسے مسترد کر دیا اور یوں حالات ایک خطرناک نہج پر آ گئے، چوں کہ اس مسئلے سے لاکھوں لوگوں کی قسمت وابستہ تھی اور پرامن مذاکرات کے ذریعے اس کا حل بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا لہٰذا امریکہ کے ایک مشہور رسالے کولیئر (جو 1957ء میں بند ہوا) نے ٹینیسی ویلی اتھارٹی کے سابق چیئرمین اور امریکی اٹامک انرجی کمشن کے چیئرمین ڈیوڈ ای کو حقائق معلوم کرنے کی غرض سے بھارت اور پاکستان کے دورے پر بھیجا۔ ان کا کام اس مسئلے پر ایک تفصیلی رپورٹ تیار کرنی تھی، جس کا مقصد مسئلہ کا حل تلاش کرنا تھا۔ وطن واپسی پر ڈیوڈ نے سلسلے وار آرٹیکلز کی صورت میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس سلسلے کا پہلا آرٹیکل ''کولیئر'' کے 4 اگست 1951ء کے شمارے میں شائع ہوا، اس نے لکھا تھا ''ابتدائی نکتہ، جس سے شروعات کی جائے، یہ ہو کہ پاکستان کو پانی سے محرومی اور صحرا بنا دیئے ان کے خدشات ختم کئے جائیں۔ پانی کے حالیہ استعمال کے حجم کی بھارت تصدیق کرے اور دونوں ممالک کو پابند کیا جائے کہ وہ صحیح معنوں میں دریا کے بین الاقوامی طاس میں مل کر کام کریں۔ علیحدہ

علیحدہ کام کی صورت میں دونوں ممالک ہی مقصد حاصل نہیں کر سکیں گے، کیونکہ دریا (سندھ) دونوں ممالک کی سرحد کو خاطر میں نہیں لاتا اور کشمیر، بھارت اور پاکستان سے گزرنے والے اپنے قدرتی راستے پر گامزن رہتا ہے۔ اس پورے نظام کو بطور ایک اکائی ترقی دی جانی چاہئے اور امریکہ کی سات ریاستوں کے TVA سسٹم کی طرح بطور ایک اکائی ہی چلایا بھی جانا چاہئے''۔

اس وقت کے عالمی بنک کے صدر یوجین آر لیک نے ڈیوڈ کے تحریر کردہ آرٹیکلز پڑھے اور ان سے رابطہ کر کے پوچھا کہ بھارت اور پاکستان کے لئے کیا ان کی تجاویز قابل قبول ہو سکتی ہیں۔ ڈیوڈ سے مشاورت کے بعد صدر عالمی بنک نے دونوں ممالک کے وزرا کے نام خطوط لکھے اور دریائے سندھ کے پانی کے تنازع کے حل کے لئے مذاکرات کی غرض سے اپنے دفتر کی خدمات پیش کر دیں۔ یہ مذاکرات مئی 1952ء میں عالمی بنک کی نگرانی میں شروع ہوئے اور یہ وقفے وقفے سے تقریباً نو برس تک جاری رہے لیکن کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ 1957ء میں پاکستان نے یہ مسئلہ سلامتی کونسل میں لے جانے کا فیصلہ کیا، اسے یقین تھا کہ اسے انصاف مل جائے گا لیکن اس کے فوراً بعد ایوب خان تشریف لے آئے اور آتے ہی مذاکرات میں مصروف پاکستانی وفد کو حکم دیا کہ وہ بنک کی تجاویز غیر مشروط طور پر مان لیں۔ اختلاف رکھنے والے وفد کو مذاکرات سے نکال دیا گیا اور تین دریا یعنی 30 ملین ایکڑ فٹ قدرت کا عظیم تحفہ بالآخر بھارت کے حوالے کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں بھارتی صحافی کلدیپ نائر کی گواہی موجود ہے، ان کے الفاظ میں ''1951ء میں جب پاکستان سلامتی کونسل میں جا رہا تھا تو امریکی رضامندی سے معاملہ ورلڈ بنک کو منتقل کر دیا گیا''۔
اس معاہدے کے تحت مغربی دریاؤں (سندھ، جہلم اور چناب) کے پانی پر پاکستان کو حق دار ٹھہرایا گیا اور دیگر تین مشرقی دریا (راوی، ستلج اور بیاس) بھارت کے حوالے کر دیئے۔ یہ معاہدے، جسے انڈس واٹر ٹریٹی (سندھ طاس معاہدہ) کا نام دیا گیا اس پر 19 ستمبر 1960ء کو بھارتی وزیراعظم جواہر لال نہرو، اس وقت کے پاکستانی حکومت کے سربراہ صدر ایوب خان اور اس وقت کے صدر

عالمی بنک نے دستخط کئے۔ اس معاہدے کا مقصد 365,000 مربع میل کے علاقے کو سندھ طاس میں واقع دونوں ممالک کے درمیان تقسیم کرنا اور دونوں ممالک کو اپنی اپنی سرحدوں کے اندر پانی کے قدرتی وسیلے کو محفوظ کرنا اور اس کا انتظام کرنا تھا۔ یہ معاہدہ یکم اپریل 1960ء سے مؤثر ہوا۔ اس معاہدے کی شق میں یہ واضح ہے کہ مشرقی دریاؤں کے تمام تر پانی پر بھارت اور مغربی دریاؤں کے پانی پر مکمل طور پر پاکسان کا حق ہوگا۔ پاکستان میں داخل ہونے والے تمام دریاؤں کے پانی اور ان ذیلی دریاؤں کے پانی پر، جو اپنی قدرتی گزرگاہ سے ہوتے ہوئے مرکزی ستلج اور مرکزی راوی میں ضم ہو جاتے ہیں، پاکستان میں داخل ہونے کے بعد پاکستان کا حق ہوگا اور بھارت کسی بھی طرح ان کا بہاؤ روکنے کا مجاز نہیں ہے لیکن ساٹھ سالہ تاریخ گواہ ہے کہ بھارت نے کبھی کسی معاہدے کی پابندی نہیں کی اور اب حالیہ آبی جارحیت دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ اس کے لئے سندھ طاس معاہدہ کاغذ کے کسی بے کار پرزے سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ سمجھنا بھی انتہائی خوش گمانی بلکہ بے وقوفی ہوگا کہ وہ ہماری بات چیت سے قائل ہو کر اپنے کروڑوں ڈالر کے منصوبوں سے دست بردار ہو جائے گا۔ بھارت نے ان تین دریاؤں کا پانی استعمال کر کے اپنے صحرا راجستھان کو گلزار بنا دیا ہے لیکن ہم ایسا نہ کر سکے۔ جب بھی کسی ڈیم کی تعمیر کی بات ہوتی ہے تو سیاسی اور جاگیردارانہ نظام کے محافظ، وہ ہنگامہ مچاتے ہیں کہ پورے ملک میں افراتفری پھیل جاتی ہے۔ ہماری اس نالائقی کو دیکھتے ہوئے بھارتی وزیراعظم واجپائی نے 2001ء میں اپنے ایک انٹرویو میں واشگاف الفاظ میں کہا کہ "بھارت پیاس سے مر رہا ہے اور پانی کا ایک ایک قطرہ اس کی ضرورت ہے جبکہ پڑوسی ملک پاکستان 35 ملین ایکڑ فٹ پانی ضائع کر رہا ہے تاکہ مچھلیاں بچائی جا سکیں"۔ 2003ء میں اسلام آباد میں ایک کانفرنس ہوئی تھی، جس کا موضوع "واٹر اینڈ سکیورٹی اِن ساؤتھ ایشیا" تھا، لیکن اگر ریکارڈ اٹھا کر دیکھیں تو موضوع صرف اور صرف دریائے سندھ، جہلم اور چناب تک محدود رہا۔ کانفرنس میں بھارتی وفد نے ہماری اسی نالائقی کو زیر

بحث لاتے ہوئے ایک تجویز پیش کی تھی کہ پاکستان اب تک اپنے حصے کا پانی استعمال کرنے میں ناکام رہا ہے لہٰذا اس پانی کو مشترکہ طور پر استعمال کرنے کی غرض سے سندھ طاس معاہدہ نمبر دو کیا جائے۔ پاکستان کی جانب سے اس تجویز کی جتنی سخت مخالفت ہونی چاہئے تھی، وہ بھی نہ ہوئی اور مشرف حکومت نے اگرچہ یہ معاہدہ تو نہ کیا، البتہ جس طرح بھارت کے جارحانہ اقدام کے جواب میں خاموشی اختیار کی، یہ خود قومی سطح کا ایک جرم سمجھی جا سکتی ہے، ایک آمر نے معاہدے کے تحت تین دریا بیچ ڈالے تو یقیناً دوسرے آمر کا اتنا تو حق بنتا تھا کہ وہ بغیر معاہدے کے تین دریا بخش دے۔

پاکستان اس وقت اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے، شمالی علاقوں میں رچایا جانے والا آگ اور خون کا کھیل ہمارے چاروں صوبوں کے گلی محلوں اور سڑکوں تک آ پہنچا ہے۔ دوسروں کی جنگ لڑتے لڑتے ہم خود حالت جنگ میں آ چکے ہیں، جمہوریت کے ایک سال بعد بڑے دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ قیمتی انسانی جانوں اور املاک کے ساتھ ساتھ قوم کے وہ خواب بھی جل کر راکھ ہو گئے، جو سولہ کروڑ آنکھوں نے جمہوریت کی آمد پر امن، انصاف، استحکام اور تعمیر نو کے لئے دیکھے تھے۔ 2001ء میں نائن الیون کے بعد جو غلطیوں کے بیج ہم نے بو کئے، وہ ان آٹھ برسوں میں بار آور ہوئے اور ایسے ہوئے کہ آج یہ فصل خودکش حملوں کی صورت میں وطن کا بچہ بچہ کاٹ رہا ہے۔ ایسی صورت میں ہم یقیناً کسی نئی جنگ کے متحمل نہیں ہو سکتے لیکن کیا ہم اپنے حق کے لئے آواز بھی بلند نہیں کر سکتے؟ دوستی، مفاہمت اور مصالحت کی پالیسی یقیناً بہتر ہے لیکن کس قیمت پر؟ کیا ملک و قوم کی قیمت پر؟ اپنے مستقبل کی قیمت پر؟ اور کیا یکطرفہ ایسی کسی پالیسی سے ہمارا بھلا ہو سکتا ہے۔ جو دوسرا فریق اپنی ٹھوکر پر رکھے اور اسے ہماری کمزوری سمجھے۔ نہیں، اپنی بقا کے لئے ہمیں اس حوالے سے ایک واضح پالیسی بنانی ہوگی، اس مسئلے کو ہر بین الاقوامی فورم پر اٹھانا ہوگا، عالمی عدالت انصاف میں بھارت کی اس کھلی آبی جارحیت کو چیلنج کرنا ہوگا۔ عالمی بنک سندھ طاس

معاہدے کا ضامن ہے، اس کے آگے اس مسئلے کو اٹھانا ہوگا اور اسے اپنا کردار ادا کرنے پر مجبور کرنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی صفوں میں موجود بھارتی مفادات کے لئے سرگرم ملک دشمن عناصر کو بے نقاب کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ سندھ طاس واٹر کونسل کے چیئرمین، ظہور الحسن ڈاہر کے ایک اخباری انٹرویو کے مطابق ''پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جو بھارت کے مفادات کے لئے ہمہ وقت سرگرم رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ محکمہ آبپاشی کے دو اعلیٰ افسران ایسے بھی ہیں، جو دن رات اس کوشش میں مصروف ہیں کہ چناب کا معاملہ قومی سطح پر نہ اٹھایا جائے اور وہ اس مقصد کے لئے پیسہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں، ہم ان تمام لوگوں سے، جنہیں کالا باغ ڈیم پر تحفظات ہیں، بہت ادب سے یہ پوچھنے کی جسارت کرتے ہیں کہ کیا بھارت کی آبی جارحیت ان کے لئے قابل قبول ہے؟ کالا باغ ڈیم کو نہ قبول کرنے والوں کے لئے کیا کارگل ڈیم قابل قبول ہے؟ ہزاروں ایکڑ پر مشتمل انڈس ڈیلٹا، جو ویسے ہی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے، کیا اس سے یہ جنگ ہار نہیں جائے گا؟ ہزاروں ماہی گیر بے سروساماں بھٹکنے پر مجبور نہیں ہوں گے؟ ساحلی حیات برباد ہو جائے گی اور پاکستان سمندری حیات سے، جو کثیر زرمبادلہ حاصل کرتا ہے اس سے محروم ہو جائے گا۔ کیا یہ ماہی گیر تنظیموں کا مسئلہ نہیں ہے؟ کیا یہ انسان کے بنیادی حقوق کی پامالی نہیں اور اگر ہے تو اس کے لئے آواز بلند کرنے والی ملکی اور غیر ملکی تنظیمیں کہاں ہیں؟ ماحول اور قدرتی وسائل کے تحفظ کی تنظیمیں اور جنگلی حیات کے محافظ کہاں خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں؟ جاگیے...... خدا کے لئے جاگ جایئے؟

یاد رکھیے، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، صرف آٹھ سال ہیں، بھارت 2016ء میں اپنا ''انٹرلنک ریور پروگرام'' مکمل کر لے گا، جو اس نے گذشتہ حکومت کی خاموش حمایت سے شروع کیا تھا، اس منصوبے کے تحت بھارت اپنے اکیس دریاؤں کا باہم رابطہ نہروں سے مکمل کرے گا۔ تینتیس ڈیم بنائے گا اور دس ہزار کلومیٹر طویل نہریں کھودے گا۔ اس منصوبے سے اس کی 360

ملین ایکڑ زمین آباد ہوگی اور 30 ہزار میگاواٹ بجلی دستیاب ہوگی۔ وہ تو سرسبز اور گل و گلزار ہو جائے گا لیکن ہمارے ملک میں ریت اڑنے لگی گی۔ اس منصوبے کو بنگلہ دیش نے بھی اپنے لئے ڈیتھ ٹریپ فار بنگلہ دیش قرار دیا ہے، کیونکہ دریائے گنگا اور برہم پترا کے پانی سے بھی بھارت اسی طرح استفادہ کرے گا۔ ہم بنگلہ دیش سے مل کر کوئی راہ نکال سکتے ہیں اور بین الاقوامی فورمز پر احتجاج بھی کر سکتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے اس گلوبل ولیج میں جنگ کے علاوہ بھی بہت سے راستے ہمارے لئے کھلے ہیں اور اگر ہم نے اپنی آنکھیں نہ کھولیں تو پھر ہم اپنی آنے والی نسلوں کے لئے قحط اور افلاس کے سوا کچھ نہیں چھوڑیں گے۔ آج یہ مسئلہ جنگ کئے بغیر حل ہو سکتا ہے، بہت سے دوسرے راستے ہمارے لئے کھلے ہیں لیکن اگر ہم نے دیر کر دی تو پھر ہر راستہ بند ہوتا چلا جائے گا۔

(ستمبر 2009ء)

☆☆☆☆☆☆☆

600 ارب روپے کے نئے ٹیکس

یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ کسی خفیہ تھنک ٹینک کو پاکستان دشمن ایجنسیوں نے یہ ذمہ داری سونپ رکھی ہے کہ وہ ہفتہ دس دن کے بعد پاکستانی عوام کے سر پر کوئی نہ کوئی اعصاب شکن ہتھوڑا ضرور چلا دیا کرے۔ صورتحال یہ ہے کہ ملک بھر میں بجلی، آٹا اور چینی کے بعد اب دودھ کا بھی بحران پیدا ہو گیا ہے۔ دارالحکومت اسلام آباد سمیت کئی شہروں میں دودھ اور دہی کی قیمتوں میں غیر اعلانیہ اور خودساختہ اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اب دودھ 50 سے 55 روپے فی کلو کے حساب سے فروخت کیا جا رہا ہے جبکہ دہی کی قیمتوں میں بھی 10 روپے فی کلو اضافہ کر دیا گیا ہے جبکہ دودھ کی پیکنگ کا ڈبہ 53 روپے فی لیٹر کی بجائے 58 روپے اور 60 روپے فی لیٹر مل رہا ہے۔ ادھر وفاقی انتظامیہ نے بھی اس خودساختہ اضافے پر چپ سادھ لی ہے اور اضافے کو روکنے کے لیے کوئی حکمت عملی وضع نہیں کی گئی جس کی وجہ سے عوام کی پریشانی مسلسل بڑھتی جا رہی ہے جبکہ کہیں بھی دودھ اور دہی کی دکانوں پر کوئی سرکاری ریٹ لسٹ آویزاں نہیں ہے۔ ایک خبر رساں ایجنسی کی رپورٹ کے مطابق کراچی میں ڈیری فارمرز فی لیٹر دودھ پر 15 روپے منافع کما رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے سب سے بڑے شہر کراچی میں ریٹیلرز کی جانب سے دہی 68 روپے فی کلو کے حساب سے

فروخت کیا جا رہا ہے۔ اس طرح فی کلو پر 47 فیصد یعنی 20 روپے منافع حاصل کیا جا رہا ہے۔ شہری حکومت کی جانب سے دودھ کی فی لیٹر قیمت 38 روپے مقرر کی گئی تھی لیکن حکومت کو اشیاء کی قیمتوں میں تعین میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

یاد رہے کہ ملک میں آٹے اور چینی کی قلت و مہنگائی بھی بدستور جاری ہے۔ حکومتی اعلانات کے باوجود لاہور شہر میں کئی بازاروں سے چینی اور آٹا غائب ہے اور چینی کی قیمت 45 روپے سے 50 روپے فی کلو تک رہی۔ کراچی بھر میں بھی حکومتی دعوؤں کے باوجود کہیں بھی سرکاری ریٹ پر چینی دستیاب نہیں۔ 45 روپے سرکاری نرخ ہونے کے باوجود ہر جگہ 50 روپے میں چینی مل رہی ہے۔ شہریوں کا کہنا ہے کہ حکومت کی عدم دلچسپی کے باعث چینی اور آٹا عوام کی قوت خرید سے باہر ہو گئے ہیں۔ ملک کے سب سے بڑے صنعتی شہر کراچی میں بجلی کا بحران بھی زوروں پر ہے۔ کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی لمیٹڈ ماہ رمضان کے دوران شہر میں بجلی کی طلب اور رسد پورا کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہوگئی ہے۔ مختلف پاور اسٹیشنوں میں یونٹوں کی خرابی اور گل احمد پاور پلانٹ سے بجلی کی معطلی کے بعد بجلی کی طلب اور رسد کا فرق 500 میگاواٹ تک جا پہنچا ہے۔ جس کے بعد کراچی کے عوام ہر ایک گھنٹے بعد ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کی لوڈشیڈنگ برداشت کرنے پر مجبور ہیں جبکہ کے ای ایس سی حکام کا دعویٰ ہے کہ بجلی کی لوڈشیڈنگ کا دورانیہ صرف 6 گھنٹے جبکہ طلب اور رسد میں فرق ڈھائی سو میگاواٹ ہے۔ کے ای ایس سی بجلی کی فراہمی کی صورت حال بہتر بنانے کی بجائے نرخوں میں اضافے کے لئے سرگرم ہے۔ تازہ اطلاعات کے مطابق کراچی میں بجلی کی فراہمی میں بری طرح ناکام ہونے والے اس ادارے نے بجلی کی نرخوں میں ایک روپیہ فی یونٹ اضافے کے ساتھ صنعتی صارفین کی سکیورٹی ڈیپازٹ فیس 1500 روپے سے بڑھا کے 8000 روپے کرنے کی تجویز پیش کر دی ہے۔

اس پس منظر میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ وطن عزیز پاکستان اس وقت زبردست داخلی

وانتظامی بحرانوں میں گھرا ہوا ہے اور بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہماری حکومت اور سیاسی قیادت ان پیچ در پیچ بحرانوں کے حل میں نہ صرف ناکام دکھائی دے رہی ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ حکمرانوں کو ملک کو موجودہ بحرانی کیفیت سے نکالنے کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ سیاستدانوں کے درمیان ایک دوسرے کی کردارکشی اور ماضی کے گڑے مردے اکھاڑنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے اور کسی کو عوام کی مشکلات کا احساس ہی نہیں ہے۔ حکومتی زعماد موجود بحرانوں کے حل میں سنجیدہ ہیں نہ حزب اختلاف کی جماعتوں کو ان حقیقی ایشوز پر آواز بلند کرنے، حکمرانوں پر دباؤ ڈالنے یا عوامی احتجاج منظم کرنے کی توفیق مل رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک جانب خود سرکاری سطح پر بڑے پیمانے کی کرپشن اور بدعنوانی کی داستانیں زبان زد عام ہیں تو دوسری جانب ذخیرہ اندوز و ناجائز منافع خور عناصر نے بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے شروع کر دیئے ہیں اور جس کا جی چاہتا ہے اشیاء ضرورت کی قیمتوں میں من مانے اضافے کر دیتا ہے۔ کسی وزیر یا تدبیر سے اگر اس کا سبب اور ان بے پناہ اخراجات کا تذکرہ کیا جائے جو سرکار کے دربار میں "حلوائی کی دکان اور نانا جی کی فاتحہ" کے مصداق ہو رہے ہیں۔ تو وہ طیش میں آجاتے ہیں اور آخر میں "کرلو جو کرنا ہے" کہہ کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ اب سنتے ہیں کہ 600 ارب روپے کے نئے ٹیکسوں کا ایک ذیلی بجٹ آرہا ہے۔ معلوم نہیں حکومت کو کب یقین آئے گا کہ ملک کے 90 فیصد سے زیادہ "عوام" زندہ نہیں بلکہ "زندہ درگور" ہیں۔

(اکتوبر 2009ء)

ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل اور ہم

محترمہ فوزیہ وہاب جو اچانک طیش میں آجانے کے حوالے سے اب خصوصی شہرت کی حامل ہیں ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی تازہ رپورٹ بابت پاکستان پر خوب گرجی اور برسی ہیں آپ کا کہنا تھا کہ عین اس مرحلے پر کہ جب فرینڈز آف پاکستان ہمارے لئے اپنے خفیہ خزانوں کے منہ کھولنے والے ہیں اس رپورٹ کا اجراء پاکستان کے خلاف سازش ہے۔ جس پر انہوں نے ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کے خوب لتے لئے اور فرمایا کہ جب بھی پیپلز پارٹی کی حکومت آتی ہے اس کے خلاف سازشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ چونکہ آپ پیپلز پارٹی سیکرٹری اطلاعات ہیں اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لئے آپ نے یہ نیا فقرہ ایجاد کیا ہے اور موقعہ بے موقعہ اس کے استعمال سے نہیں چوکتیں اکثر چینلز پر دوران گفتگو اچانک آپ فرمادیتی ہیں "جب بھی پیپلز پارٹی کی حکومت آئے اس کے خلاف سازشیں شروع ہو جاتی ہیں۔"

محترمہ فوزیہ وہاب کو کم از کم یہ داد ضرور دینا چاہیے کہ آپ نے گزشتہ قریباً سوا سال سے پیپلز پارٹی کے لیڈروں کی طرف سے مسلسل دہرائے جانے والا یہ فقرہ "ہمارے کارکنوں کی قربانیاں ہم سے زیادہ قربانیاں کس نے دی ہیں" وغیرہ وغیرہ میں ایک نئے فقرے کا اضافہ ضرور فرمادیا۔ قبل

اس کے کہ ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کے متعلق محترمہ کے ارشادات پر تبصرہ کیا جائے۔ ایک نظر اس رپورٹ کا جائزہ لے لینا ضروری ہے جس نے محترمہ فوزیہ وہاب کو اس پریس کانفرنس پر مجبور کیا۔ ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی جانب سے جاری کی جانے والی گلوبل کرپشن رپورٹ برائے 2009ء میں عالمی ادارے نے پاکستان کی شکل دنیا کے انتہائی بدعنوان ملک کے طور پر پیش کی ہے۔ سالانہ رپورٹ جاری کرتے ہوئے عالمی ادارے کے پاکستان کیلئے سربراہ عادل گیلانی نے کہا کہ چونکہ جنرل پرویز مشرف نے اقوام متحدہ کے کنونشن برائے انسداد کرپشن کی منظوری کے محض 56 روز بعد یعنی 5 اکتوبر 2007ء کو قومی مصالحتی آرڈیننس جاری کر دیا، پاکستان میں بدعنوانی کے انسداد کی کوششیں الٹ ہوگئیں۔ ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی جانب سے رپورٹ جاری کرنے کیلئے جس وقت کا انتخاب کیا گیا تھا وہ صدر آصف علی زرداری کیلئے پریشانی کا باعث بن سکتا ہے کیونکہ عالمی سطح پر ان کی حکومت کی ساکھ پر پہلے ہی سوال اٹھائے جا رہے ہیں۔ صدر محترم اور ان کے کئی اہم ترین ساتھیوں کا ماضی کرپشن کے الزامات کی وجہ سے داغ دار ہے۔ وزیر خزانہ شوکت ترین نے ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ کا لب ولہجہ نرم کرانے کیلئے کوششیں کیں اور کہا کہ نیویارک میں امریکی حکام کے ساتھ ان کے مذاکرات میں امریکہ کی جانب سے یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ امداد کا زیادہ تر حصہ حکومت پاکستان کے ذریعے سے چینل کیا جائے گا لیکن تاحال یہ واضح نہیں ہے کہ امریکی کانگریس اس بات کی اجازت دے گی یا نہیں۔ نیویارک اور اسلام آباد میں جاری کئے گئے پریس ریلیز کے مطابق ٹرانس پیرنسی انٹرنیشنل پاکستان کے چیئرمین سید عادل گیلانی نے کہا کہ این آر او کی وجہ سے ارکان پارلیمنٹ کو مزید تحفظ مل گیا ہے کیونکہ خصوصی پارلیمانی کمیٹیوں برائے اخلاقیات کی تجاویز پر غور کرنے کے بغیر کسی بھی صوبائی قومی رکن اسمبلی کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پارلیمانی کمیٹیاں تاحال تشکیل نہیں دی گئیں۔ مسٹر گیلانی نے مزید کہا کہ این آر او کے علاوہ موجودہ حکومت کے عزائم نے عالمی برادری کو یہ سنجیدہ نوعیت کے اشارے دیئے ہیں کہ اگر تین سال کے

دوران کسی کا احتساب نہیں ہوتا تو کرپشن کوئی جرم نہیں ہے۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ ”جن کے پاس نیب آرڈیننس کی جگہ پر حکومت کا تیار کردہ پبلک آفس ایکٹ 2009ء کا مسودہ جس پر قومی اسمبلی نظر ثانی کر رہی ہے، موجود ہے، وہ اکتوبر 2010ء تک سب کو کرپشن سے تحفظ فراہم کرتا ہے اور یہ حیرانگی کی بات ہے۔“ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ”جس ملک میں کرپشن کے خلاف کوئی قانون موجود نہیں وہ آخر یہ امید کس طرح کر سکتا ہے کہ عالمی برادری آگے بڑھ کر پاکستان کی اس کے مالی بحران میں مدد کرے گی۔

پاکستان میں کرپشن ایک سنجیدہ مسئلہ ہے اور یہ موقف حال ہی میں کی جانے والی تحقیق اور رپورٹس کا جائزہ لینے کے بعد اختیار کیا گیا ہے۔ حکومت پاکستان کی درخواست پر پاکستان کے بنیادی ڈھانچے کے متعلق پیش رفت کی گنجائش کی اسسمنٹ کی گئی اور نومبر 2007ء میں اس حوالے سے ورلڈ بینک اور پلاننگ کمیشن آف پاکستان نے مل کر رپورٹ جاری کی۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ 15 فیصد کرپشن پروکیورمنٹ میں پائی جاتی ہے جس سے پاکستان کے ترقیاتی بجٹ میں 150 ارب روپے کا نقصان ہوا۔ مزید برآں، ورلڈ بینک کے کرپشن انڈیکیٹر برائے 2007ء میں پاکستان کو 100 میں سے 21.3 نمبر ملے۔ عالمی مسابقتی رپورٹ برائے 2008-09ء میں پاکستان کو 130 ممالک میں سے 101 واں نمبر دیا گیا اور یہ طے پایا گیا کہ جواب دہندگان نے حکومتی عدم استحکام کے بعد کرپشن کو ملک میں بزنس کے حوالے سے دوسرا بڑا پریشان کن مسئلہ قرار دیا۔ پرائیویٹ سیکٹر میں بڑھتی کرپشن کے ایک عنصر کی حیثیت سے پاکستان کے سیاسی عدم استحکام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پرویز مشرف کی جانب سے کرپشن کے خاتمے کے عزم اور دعوؤں کے باوجود اس مسئلے سے نمٹنے کیلئے بہت کم ہی پیش رفت ہو پائی ہے اور اب یہ سمجھا جا رہا ہے کہ کرپشن کا اثر پھیل چکا ہے اور سرایت کر چکا ہے۔ پرویز مشرف نے نومبر 2007ء میں فوجی قیادت چھوڑی اور ان کے حامیوں کو 2008ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ

(ن) کے اتحاد نے شکست فاش سے دوچار کیا۔ رپورٹ کے مطابق پرویز مشرف نے اگست 2008ء میں استعفیٰ دیا، انہیں آئین کی خلاف ورزی، بے ضابطگیوں اور مبینہ جرائم کے حوالے سے مواخذے کا سامنا تھا۔ قانونی اور اداراتی تبدیلیوں کے حوالے سے ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ سابق وزیراعظم شوکت عزیز نے عالمی ادارے کے ساتھ اس بات پر رضامندی ظاہر کی تھی کہ الیکشن کمیشن شفاف انداز میں انتخابات کا انعقاد کرے گی لیکن 2007ء میں شوکت عزیز کی ملک سے روانگی کے بعد ان وعدوں کو نظرانداز کر دیا گیا۔ 2008ء میں نگران حکومت کے دور میں پروکیورمنٹ ریگولیٹری اتھارٹی کے معاملات پر بھی عمل نہ ہوا۔ اقوام متحدہ میں کرپشن کے انسداد کے کنونشن کی منظوری کے محض 56 دن بعد پرویز مشرف نے این آر او جاری کر دیا جو پاکستان میں بدعنوانی کے خاتمے کی کوششوں کیلئے زبردست دھچکا تھا کیونکہ نیب کی جانب سے 12 اکتوبر 1999ء کے پہلے سے شروع کیے گئے کرپشن کے تمام مقدمات ختم کر دیے گئے۔

یہ ہے وہ رپورٹ جس پر محترمہ فوزیہ وہاب ناراض ہو رہی تھیں اور شنید ہے کہ آجکل پاکستان میں ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کے لوگوں پر کڑا وقت آیا ہوا ہے۔ محترمہ کا غصہ بجا لیکن وہ کس کس پر سازش کا الزام لگائیں گی۔ ایشیائی ترقیاتی بینک نے کہا ہے کہ پاکستان میں بجلی کی قیمت میں اضافہ ناگزیر ہے۔ ایشیائی ترقیاتی بینک نے اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ بجلی کی قیمت میں اضافے سے سرکلر ڈیٹ اور سبسڈی میں کمی ہوگی جس سے معیشت پر بوجھ کم ہوگا۔ رپورٹ کے مطابق معیشت کی شرح نمو میں کمی کی اہم وجہ توانائی کا بحران ہے۔ پاکستان کو معاشی میدان میں تاحال آزمائشوں کا سامنا ہے۔ اے ڈی بی کے مطابق حکومت کو اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا ہوگا تاکہ بنیادی ڈھانچے کی تعمیر اور ترقیاتی منصوبوں پر عمل درآمد ہو سکے۔ اس کے علاوہ برآمدات کے حجم میں اضافے کے لیے بھی اقدام کی ضرورت ہے۔ ایشیائی ترقیاتی بینک نے کہا ہے کہ مارچ

2010ء تک پاکستان کی اقتصادی شرح افزائش 3 سے 4 فیصد رہے گی۔ جنوبی ایشیائی ممالک کی معیشتوں سے متعلق ایشائی ترقیاتی بینک نے معاشی اہداف جاری کر دیئے جس میں سال 2008ء سے اور 2010ء تک اہداف مقرر کیے گئے۔

اس طرح کی رپورٹوں کا اس تواتر کے ساتھ یومیہ بنیاد پر اخبارات اور ابلاغ کے دوسرے ذرائع سے آنا ایک معمول بن گیا ہے۔ ڈر محسوس ہو رہا ہے کہ معیشت کی ابتری کی یہ صورت حال یونہی جاری رہی تو چند ہی سالوں میں پاکستان کی حالت اس مقام تک نہ پہنچے جس کے بعد انتہائے زوال کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ صورت حال ان امپورٹڈ معاشی جادوگروں کے لیے تو کوئی پریشان کن نہیں کہ دراصل یہ وہ سنڈیاں ہیں جو ہمارے کھیت کھلیانوں کو بنجر کر دینے کے لیے یہاں پلانٹ کیے گئے ہیں اور جو اپنا کام کر کے واپس وہیں چلے جائیں گے جہاں سے بھیجے گئے تھے مگر عوامی حکومت کے بڑوں کو جنہیں اگلے انتخابات میں دوبارہ عوام کے سامنے جانا ہے، اس صورت حال پر ضرور غور کرنا چاہیے اور قومی معیشت کے استحکام کے لیے ٹھوس بنیادوں پر اقدامات کرنے چاہیں۔

محترمہ فوزیہ وہاب صاحبہ نے جو پریس کانفرنس بابت ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل اور ایک خاص اخبار فرمائی تھی اس کا جواب محترم انصار عباسی کی طرف سے روزنامہ جنگ مورخہ 28 ستمبر 2009ء شائع ہوا ہے جو بلاتبصرہ پیش ہے۔ اس سے زیادہ ہم اس خبر پر اور کیا کہیں گے۔ اس کا عنوان ہے۔ ''ملک دشمن کون؟'' ملاحظہ فرمائیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکزی سیکرٹری اطلاعات فوزیہ وہاب صاحبہ نے نام لئے بغیر مجھ پر اور میرے اخبار پر ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ کی خبر شائع کرنے پر ملک دشمنی کا فتویٰ لگا دیا۔ اگرچہ فوزیہ وہاب صاحبہ کو یا ان کے آئے روز دیئے گئے چونکا دینے والے بیانات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا جانا چاہیے مگر جس انداز میں باقاعدہ ایک پریس کانفرنس بلا کر ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کا

غصہ ہم پر نکالا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوزیہ وہاب کے اس فتویٰ کے پیچھے پاکستان پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت کی سوچ بھی شامل تھی جس کا جواب دینا لازم ہے۔ اگر کسی ٹی وی ٹاک شو یا اخبار نویسوں سے کسی غیر رسمی بات چیت کے دوران پی پی پی کی سیکرٹری اطلاعات ہمیں ملک دشمن قرار دے دیتیں تو ہم ان کے کہے کو اسی طرح سنی ان سنی کر دیتے جیسا پچھلے دنوں ان کے اس بیان کو نظر انداز کیا۔ جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ جنرل پرویز مشرف نے ایسا کون سا جرم کیا کہ ان کا حکومت Trial کرے۔ گویا کہ 3 نومبر 2007ء کو جس طرح آئین کی دھجیاں اڑائی گئیں اور ساٹھ سے زائد اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کو نکال کر ان کو ان کے گھروں میں نظر بند کیا گیا، کوئی جرم ہی نہ تھا۔ کسی نے کبھی یہ شاید سوچا نہ تھا کہ NRO کے احسان کا بدلہ ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی آج اس طرح دے گی کہ وہ آئین شکن جنرل مشرف کی سب سے بڑی محافظ بن بیٹھے گی۔

صدر آصف علی زرداری نے تو ڈیل کا ذکر کر کے اپنی اس مجبوری کا برملا اظہار کر دیا جو ان کے راستہ میں مشرف کو آئین کے آرٹیکل 6 کے تحت مقدمہ درج کرنے کی راہ میں اصل رکاوٹ ہے مگر فوزیہ صاحبہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مشرف نے ایسا کیا کیا کہ ان کے خلاف بغاوت کا مقدمہ قائم کیا جائے۔ مجھے تعجب اس بات پر ہوا کہ جنرل مشرف کے ان گنت جرائم پر پردہ ڈالنے والوں اور ان کا تحفظ کرنے والوں کو میڈیا اس لئے ملک دشمن نظر آنے لگا کیونکہ اس نے ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ شائع کی جو حکمرانوں کو ناگوار گزری۔ غصہ اس بات کا کہ اس بین الاقوامی تنظیم میں حکومت پاکستان کے بارے میں انتہائی منفی رپورٹ ایسے وقت میں کیوں جاری کر دی۔ جب صدر زرداری اپنی ٹیم کے ہمراہ امریکہ میں پاکستان کے لئے ''دوست ممالک'' کی امداد کے منتظر تھے لیکن نزلہ ہم پر گرایا گیا کہ ہم نے 23 ستمبر کو جاری کی گئی ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی اس رپورٹ کو 24 ستمبر کے دی نیوز اور جنگ میں کیوں شائع کیا۔ باوجود اس کے کہ ہم نے اس رپورٹ کو شائع کرتے وقت اس بات کا خصوصاً تذکرہ کیا کہ ٹرانسپرنسی نے اپنی رپورٹ کو ایسے وقت میں جاری

کیا جب پاکستان کی اعلیٰ قیادت امریکہ میں ''دوست ممالک'' کے ساتھ امداد کے حصول کے لئے مذاکرات کر رہی ہے مگر پھر بھی فوزیہ وہاب صاحبہ اور ان کی پارٹی کے لئے ہم ''ملک دشمن'' ٹھہرے۔ ہر حکومت یہاں میڈیا کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتی ہے۔ پیغام پسند نہ آئے تو پیغام رساں کو یہاں نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔ اپنی شکل آئینہ میں اچھی نہ لگے تو آئینہ ہی توڑنے کی بات کی جاتی ہے۔ فوزیہ صاحبہ کے مزاج گرامی کو اگر ناگوار نہ گزرے تو کیا وہ اس بات کا جواب دے سکتی ہیں کہ اگر ایک اخبار کا ایک بین الاقوامی ادارے کی رپورٹ جس میں موجودہ حکومت کے دور میں ملک میں کرپشن اور بدعنوانی کے متعلق سنگین حالات کا ذکر کیا گیا کو شائع کرنا ملک دشمنی ہے تو کیا جنرل مشرف دور میں بے نظیر بھٹو صاحبہ کی طرف سے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ پاکستان کو امداد نہ دیں بھی ملک دشمنی تھی۔ ہمیں ملک دشمن کہنے والے کیا بتا سکتے ہیں کہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کا 2007ء میں امریکی میڈیا کو یہ کہنا کہ اگر وہ برسراقتدار آئیں تو وہ بین الاقوامی ایٹمی ادارہ (IAEA) کو اجازت دیں گی کہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر کی پوچھ گچھ کر سکیں آیا پاکستان کی خدمت تھی۔ آج ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کو ہدف تنقید بنانے والے ذرا ماضی قریب میں جا کر دیکھیں کہ مشرف دور میں کرپشن پر اسی بین الاقوامی ادارے کی رپورٹوں پر کون کون سی سیاسی جماعتیں اور ان کے لیڈر اپنی سیاست چمکاتے تھے۔ بلاشبہ ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی 23 ستمبر 2009ء کی رپورٹ جو ایک ساتھ پاکستان اور امریکہ میں جاری ہوئی اپنی Timing کی وجہ سے معنی خیز تھی جیسا کہ دی نیوز اور جنگ کی خبر میں کہا گیا مگر سچ پوچھیں تو اس رپورٹ میں پاکستان میں کرپشن اور بدعنوانی کے بارے میں جو کہا گیا وہ شاید زیادہ غلط نہ تھا۔ اس حقیقت کو کون روک سکتا ہے کہ مشرف دور میں پاکستان پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت کے خلاف کرپشن کے مقدمات کے خاتمے کے لئے NRO کے نفاذ سے اس ملک میں احتساب کا عمل نہ صرف رک گیا بلکہ مکمل طور پر Reverse ہو گیا۔ کیا ایسا کرنا ملک دشمنی نہیں۔ یہ کون نہیں جانتا کہ NRO کے آنے کے بعد اور خصوصاً

موجودہ دور حکومت میں نیب کو مکمل طور پر بے اثر اور بے زور کر دیا گیا ہے اور عملی طور پر یہ ادارہ Redundant ہو چکا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ موجودہ حکومت کی طرف سے قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا نیا احتساب قانون دراصل سیاستدانوں اور ان کی کرپشن کو قانونی تحفظ اور ان کے بچاؤ کا ذریعہ تصور کیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں پہلے ہی میڈیا میں کافی کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ ایسا کرنا ملک کی کون سی خدمت ہے۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ موجودہ دور حکومت میں کرپشن کا بازار ہر طرف گرم ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ آئے دن اخبارات اور نجی ٹیلی ویژن چینلز پر کرپشن اور بدعنوانی کے متعلق لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ گزشتہ سال سے کشکول تھامے ہمارے حکمرانوں کو دنیا کا کوئی ملک حتیٰ کہ اپنے دوست ممالک کیش پیسہ دینے سے گریزاں ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ امداد دینے والے تمام ممالک یا تو صرف ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے ذریعے پیسہ دینے پر تیار ہیں یا امریکہ کی طرح خود مختلف پراجیکٹس کے لئے NGO's کے ذریعے یہاں پیسہ لگانا چاہتے ہیں۔ موجودہ حکومت پر دوست ممالک کی یہ بداعتمادی کیوں؟ ذرا سوچئے!

(نومبر 2009ء)

غلط زرعی پالیسیاں

زراعت پر مبنی معیشت کے باوجود پاکستان کو بنیادی غذائی اشیاء کی قلت کا سامنا ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے ملک ماسوائے چند مختصر وقفوں کے، گندم اور آٹے کے بحران میں مبتلا ہے۔ حکومت یقین دہانی کرا رہی ہے کہ فلور ملوں کو گندم ان کے کوٹے کے مطابق فراہم کی جا رہی ہے۔ مگر اس کے باوجود آٹے کی قیمتوں میں کمی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے اور نہ ہی حکومت کی جانب سے اس کے نرخ مقرر کیے جا رہے ہیں۔ سرکاری نرخوں پر دستیاب گندم غیر معیاری ہے آٹے کی قیمتوں میں کمی خواب وخیال بن کر رہ گئی ہے۔

ملک میں غذائی بحران کا سبب جامع، ٹھوس اور قابل عمل زرعی پالیسی کا فقدان ہے۔ آزادی کے بعد سے ملک میں 2 بار اہم زرعی اصلاحات کی گئیں۔ پہلی نمایاں زرعی اصلاحات 1959ء میں جبکہ دوسری 1972ء میں کی گئیں۔ دونوں زرعی اصلاحات کا فائدہ زمینداروں اور جاگیرداروں کو حاصل ہوا۔ یہی سبب ہے کہ ملک میں جو لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ ان میں سے بڑی تعداد کا تعلق دیہی علاقوں سے ہے۔ ناقص اور اغلاط سے پر پالیسی تیار کرنے کے سبب ملک کو حالیہ غذائی بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

عالمی بینک کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کو ان 32 ممالک کے گروپ میں شامل کیا گیا

ہے۔ جہاں شدید غذائی قلت کی پیشن گوئی کی گئی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر ان ممالک کی زرعی پالیسیاں تبدیل نہ ہوئیں تو یہاں کے عوام کو شدید اقتصادی اور سماجی بے چینی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جو غذائی ذخائر اور سٹوریج ڈپوؤں پر حملوں کا سبب بن سکتی ہے۔

پاکستان کو گزشتہ 2 سال سے گندم اور آٹے کے شدید بحران کا سامنا ہے۔ اگرچہ بین الاقوامی سطح پر قیمتوں میں اضافے اور گندم کی قلت کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ مگر پاکستان میں گندم کے بحران کا سبب مختلف ہے۔

اپنی آبادی کے حساب سے پاکستان کو ہر سال تخمینی طور پر 2 کروڑ 20 لاکھ ٹن گندم کی ضرورت پڑتی ہے۔ ماضی میں زرعی شعبے میں متعدد وسائل کے باوجود کافی مقدار میں گندم پیدا کی جاتی رہی۔ پیداوار میں اضافے یا کمی کے پیش نظر گندم برآمد اور درآمد بھی کی جاتی رہی۔ لیکن سال 2007-08ء کے دوران ملک کو درپیش گندم کا بحران اپنی مثال آپ تھا۔

معاشی اور مالیاتی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ گندم کا بحران پیداوار میں کمی یا طلب میں اضافے کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ گزشتہ حکومت کی نااہلیت، ناقص انتظام، ذخیرہ اندوزی اور اسمگلنگ تھی۔ موجودہ حکومت نے بھی اس صورتحال سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا ہے۔

صورتحال اس حد تک دگرگوں ہوگئی کہ صوبوں نے گندم کے لیے ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیا۔ صوبوں کے درمیان گندم کے نقل وحمل پر پابندی کا آغاز ہو چکا ہے۔ جس کے مستقبل میں کوئی مثبت اثرات مرتب نہیں ہوں گے۔ اس کے نتیجے میں صوبوں کے درمیان تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگی۔

گزشتہ حکومت نے گندم کی پیداوار کا غلط تخمینہ لگا کر 5 لاکھ ٹن گندم کم قیمت پر برآمد کر دی تھی اور بعد میں یہی گندم زیادہ قیمت پر درآمد کرنی پڑی۔ اس کے نتیجے میں قومی خزانے کو بھاری نقصان ہوا۔ فی الوقت ملک کے زرعی شعبے کو مختلف چیلنجوں اور مسائل کا سامنا ہے۔ ان مسائل میں پانی کی قلت، زیر کاشت علاقے میں اضافہ نہ ہونا، فی ایکڑ پیداوار میں مسلسل کمی، توانائی اور

ڈیزل کی مہنگائی۔ ناقص معیار کے بیج، کیڑے مار ادویہ کی قلت اور زراعت سے متعلق مناسب آلات اور مشینوں کی ہوش ربا قیمتیں شامل ہیں۔

زرعی شعبے کو جس سب سے بڑے مسئلے کا سامنا ہے وہ بجلی کی قلت اور ڈیزل کی بھاری قیمت ہے۔ پاکستان میں ہزاروں ایکڑ زمین ٹیوب ویلوں کے پانی سے سیراب کی جاتی ہے جبکہ 80 فیصد سے زائد ٹیوب ویل ڈیزل سے چلتے ہیں۔ ڈیزل کی قیمتوں میں اضافے نے پیداواری لاگت بڑھا دی ہے۔ اگرچہ ڈیزل کی قیمت میں معمولی کمی ہوئی ہے لیکن یہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف ہے۔

کاشتکار اور زراعت سے تعلق رکھنے والے دیگر افراد حکومت پر زور دے رہے ہیں کہ وہ بجلی اور ڈیزل کی مد میں انہیں سبسڈی دے۔ کاشتکاروں کو اچھے معیار کے بیج اور فرٹیلائزر کے حصول میں مشکل کا سامنا ہے جو حکومت کی ناقص کارکردگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ذخیرہ اندوز گاہے بگاہے کسانوں کے لیے مسائل کھڑے کرتے رہتے ہیں وہ معیاری بیجوں اور فرٹیلائزر کی مصنوعی قلت پیدا کر دیتے ہیں اور انہیں بھاری قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ کم معیار کی کیڑے مار ادویات ایک اور مسئلہ ہیں جس کا کاشتکاروں کو سامنا ہے۔

2007-08ء کے دوران حکومت نے 2 کھرب 11 ارب مالیت کے قرضے جاری کیے تھے جو 2 کھرب روپے کے مقررہ ہدف سے زائد تھے لیکن زیادہ تر قرضے زمینداروں اور جاگیرداروں نے حاصل کر لیے اور چھوٹے کاشتکاروں کو کچھ نہیں ملا۔

قرضوں کی اس نامناسب تقسیم کے باعث، گندم کی پیداوار میں مناسب حد تک اضافہ نہ ہو سکا۔ 2008ء میں زرعی پیداوار کا ہدف 5.1 مقرر کیا گیا تھا جو حاصل نہ ہو سکا۔ شرح افزائش 1.5 فیصد تک محدود رہی جس کے نتیجے میں جی ڈی پی میں زرعی شعبے کا حصہ کم ہو کر 5 فیصد رہ گیا۔

نئے مالیاتی سال کے دوران حکومت نے 25 لاکھ ٹن گندم درآمد کرنے کا ہدف مقرر کیا ہے۔ حالانکہ حکومت کو درآمدات پر انحصار کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ حکومت کو پیداواری نظام کو

بہتر بنانے کی جدو جہد کرنا چاہیے اور آٹے اور گندم کی اسمگلنگ ختم کرنی چاہیے۔

ضرورت ہے کہ حکومت ذخیرہ اندوزوں سے آہنی ہاتھ سے نمٹے اور پیداوار بڑھانے کے لیے ایک واضح پالیسی تیار کی جانی چاہیے۔ اگرچہ موجودہ حکومت نے کاشتکاروں کے حالات بہتر بنانے اور زرعی شعبے کو ترقی دینے کے اقدام کیے ہیں مگر یہ سب بے سود ہیں کیونکہ ان پر عملدرآمد نہیں ہو رہا ہے۔ زرعی ماہرین نے حکومت پر زور دیا ہے کہ حکومت ان پیشن گوئیوں پر توجہ دے جو ملکی معیشت کے بارے میں کی جا رہی ہیں اور بحرانوں کو مزید سنگین بنانے سے احتراز کرے۔ انہوں نے ملک میں زرعی شعبے کو درپیش مسائل سے نمٹنے کے لیے مخلصانہ اقدامات کی ضرورت پر زور دیا۔

(نومبر 2009ء)

کیری لوگر بل کیا لے گیا کیا دے گیا

کیری لوگر بل نے ایک مرتبہ ساری قوم کے بل نکال دیے ہیں پہلی مرتبہ فوج کو بادل نخواستہ اپنا ردِعمل ظاہر کرنا پڑا حکومت ہر سوال کے جواب میں کہتی ہے کہ لوگ بل پڑھے بغیر اس پر تبصرہ کر رہے ہیں ذیل میں جمعرات 24 ستمبر 2009ء کو سینٹ سے پاس ہونے والے کیری لوگر بل کا متن پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ہاؤس آف ریپریزنٹیٹو میں پیش کیا جا رہا ہے اور اگر یہ بغیر کسی ترمیم کے منظور ہو گیا تو صدر اوباما کے پاس قانون دستخط کے لیے بھیج دیا جائے گا، جس کے بعد یہ قانون بن جائے گا۔ s. 1707 پاکستان کے ساتھ تعلقات کے فروغ ایکٹ برائے 2009ء (متفرق، متفق یا سینٹ سے منظور) SEC. 203 کچھ امداد کے حوالے سے متعین حدود ....(a) سکیورٹی تعلقات میں معاونت کی حدود: مالی سال 2012ء سے 2014ء کے لیے، پاکستان کو مالی سال میں اس وقت تک کوئی سکیورٹی تعلقات میں معاونت فراہم نہیں کی جائے گی، جب تک سیکرٹری آف اسٹیٹ، صدر مملکت کی ہدایت پر سب سیکشن (c) میں درج ہدایات کے مطابق منظوری نہ دے دیں۔ (b) اسلحہ کی فراہمی کی حدود: .... مالی سال 2012ء سے 2014ء تک کے لیے، پاکستان کو اس وقت تک بڑا دفاعی سامان کی فروخت کا

اجازت نامہ یا لائسنس، دی آرم ایکسپورٹ کنٹرول ایکٹ (22 usc 2751et seq.) کے مطابق جاری نہیں کیا جائے گا، جب تک امریکی وزیر خارجہ امریکی صدر کی ہدایت کے مطابق، سب سکیشن (c) میں درج ضروریات کے مطابق منظوری نہ دے دیں: (c) تصدیق کا عمل: ....اس سب سیکشن کے تصدیقی عمل کے لیے ضروری ہے کہ اُسے سیکرٹری آف اسٹیٹ، صدر کی ہدایت کے مطابق منظور کریں گے، کانگریس کی کمیٹیز کے مطابق کہ (1) امریکہ، حکومت پاکستان کے ساتھ تعاون جاری رکھے گا کہ پاکستان جوہری ہتھیاروں سے متعلق مواد کی منتقلی کے نیٹ ورک کو منہدم کرنے میں کردار ادا کرے۔ مثلاً اس سے متعلقہ معلومات فراہم کرے یا پاکستانی قومی رفاقت جو اس نیٹ ورک کے ساتھ ہے تک یا براہ راست رسائی دے۔ حکومت پاکستان نے موجودہ مالی سال کے دوران مسلسل اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور اب بھی دہشت گرد گروپوں کے خلاف موثر کوششیں کررہی ہے۔ سیکشن 201 میں امداد کے جن مقاصد کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کے تحت حکومت پاکستان نے مندرجہ ذیل امور میں قابل ذکر کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ (الف) مدد روکنا:........ پاکستانی فوج یا کسی انٹیلی جنس ایجنسی میں موجود عناصر کی جانب سے انتہا پسندوں یا دہشتگرد گروپوں، خصوصی طور پر وہ گروپ جنہوں نے افغانستان میں امریکی یا اتحادی افواج پر حملے کیے ہوں، یا پڑوسی ممالک کے لوگوں یا علاقوں پر حملوں میں ملوث ہوں (ب) القاعدہ، طالبان اور متعلقہ گروپوں جیسے کہ لشکر طیبہ اور جیش محمد سے بچاؤ اور پاکستانی حدود میں کارروائیاں سے روکنا، سرحد پر پڑوسی ممالک میں حملوں کی روک تھام، قبائلی علاقوں میں دہشت گرد کیمپوں کی بندش، ملک کے مختلف حصوں بشمول کوئٹہ اور مریدکے میں موجود دہشت گرد ٹھکانوں کا مکمل خاتمہ، اہم دہشت گردوں کے بارے میں فراہم کردہ خفیہ معلومات کے بعد کارروائی کرنا، (ج) انسداد دہشتگردی اور اینٹی منی لانڈرنگ قانون کو مضبوط بنانا (3) پاکستان کی سکیورٹی فورسز پاکستان میں عدالتی و سیاسی معاملات میں عملاً یا کسی اور طریقے سے دخل اندازی

نہیں کریں گی۔ بعض ادائیگیاں (1) عام طور پر ان کا تعلق پیراگراف (2) سے ان فنڈز میں سے کسی کا تعلق مالی سال 2010ء سے 2014ء تک کے مالی سال سے نہیں ہے یا اس فنڈ کا کوئی تعلق پاکستان کے کاؤنٹر انسرجنسی کیپے بلیٹی فنڈ سے بھی نہیں ہوگا جو سپلی مینٹل اپیروپری ایشن ایکٹ 2009ء (پبلک لاء III-32 کے تحت قائم ہے) اس کا دائرہ کار ان ادائیگیوں تک وسیع ہو گا جن کا تعلق (الف) لیٹر آف آفر اینڈ ایسپٹینس (Letter Of Offer And Pk-D-NAP, Acceptnce) سے ہے۔ جن پر امریکہ اور پاکستان نے 30 ستمبر 2006ء کو دستخط شدہ لیٹر آف آفر اینڈ ایکسپٹنس PK-D-NAP اور (ج) (Letter Of Offer Pk-D- NAP, And Acceptnce) جس پر امریکی حکومت اور حکومت پاکستان کی جانب سے 30 ستمبر 2006ء کو دستخط ہوئے تھے۔ استثنیٰ:... ...... مالی سال 2010ء سے 2014ء تک کیلئے جو فنڈز سکیورٹی میں مدد دینے کے لئے مختص کئے گئے ہیں۔ وہ تعمیرات اور متعلقہ سرگرمیوں کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ جن کی وضاحت Letter Of Offer And Acceptnce کے پیراگراف (1) میں کی گئی ہے۔ تحریری دستاویز:......... وزیر خارجہ صدر کی ہدایت کے تحت مختص رقم میں سیکشن (A-(B) اور (D) کے تحت ایک سال کے لئے کمی کرسکتے ہیں۔ وزیر خارجہ یہ اقدام اس وقت اٹھائیں گے جب انہیں خیال ہوگا کہ یہ اقدام امریکہ کی قومی سلامتی کے مفاد میں ہے۔ تحریری دستاویز کا نوٹس:......... وزیر خارجہ کو صدر کی ہدایت کے مطابق رقوم میں کمی کا اختیار پیراگراف (1) کے مطابق اس وقت تک استعمال نہیں کر سکیں گے جب تک کانگریس کی متعلقہ کمیٹی کو اس سلسلے میں سات روز کے اندر تحریری نوٹس نہ مل جائے جس میں رقوم میں کمی کی وجوہات درج ہوں یہ نوٹس کلاسیفائیڈ اور نان کلاسیفائیڈ شکل میں ضرورت کے مطابق پیش کیا جائے گا۔ (ف) مناسب کانگریسی کمیٹیوں کی تعریف: اس حصے میں مناسب کانگریسی کمیٹیوں کی اصطلاح سے مراد ایوان نمائندگان کی نمبر 1 کمیٹی برائے خارجہ امور،

کمیٹی برائے مسلح افواج، کمیٹی برائے حکومتی اصلاحات اور فروگزاشت، 2 سینٹ کی امور خارجہ تعلقات کمیٹی، مسلح افواج کمیٹی اور نتیجہ کمیٹی برائے انٹیلی جنس ہیں۔سیکشن 204 خانہ جنگی سے نمٹنے کی پاکستانی صلاحیت کا فنڈ (ایف) مالی سال 2010ء (1) عمومی طور پر۔ برائے مالی سال 2010ء کیلئے ریاست کے محکمہ نے ضمنی تخصیص ایکٹ 2009ء (پبلک لا 32-111) کے تحت پاکستان کی خانہ جنگی سے نمٹنے کی صلاحیت کا فنڈ قائم کر دیا گیا ہے۔(اس کے بعد اسے صرف فنڈ لکھا جائے گا) پر مشتمل ہوگا۔مناسب رقم پر جو اس سب سیکشن پر عملدرآمد کیلئے ہوگی (جو شاہد شامل نہیں ہوگی اس مناسب رقم میں 70 ایکٹ کے عنوان نمبر ایک پر عملدرآمد کیلئے ہے۔(ب) وزیر خارجہ کو دستیاب رقم بصورت دیگر اس سب سیکشن پر عملدرآمد کیلئے ہوگی۔(2) فنڈ کے مقاصد: ....فنڈز کی رقم اس سب سیکشن پر عملدرآمد کیلئے کسی بھی مالی سال دستیاب ہوگی اور اس کا استعمال وزیر خارجہ، وزیر دفاع کی اتفاق رمشاورت سے کریں گے اور یہ پاکستان کی انسداد خانہ جنگی صلاحیت کے فروغ اور استحکام پر انہی شرائط کے تحت صرف ہوگی۔ ماسوائے اس سب سیکشن جو مالی سال 2009ء کیلئے دستیاب فنڈ اور رقوم پر لاگو ہوگا (3) ٹرانسفر اتھارٹی:..........(الف) عمومی طور پر: امریکی وزیر خارجہ کسی بھی مالی سال کیلئے پاکستان انسداد خانہ جنگی فنڈ جو ضمنی تخصیص ایکٹ 2009ء کے تحت قاہم کیا گیا ہے، کو رقوم منتقل کرنے کی مجاز ہوں گی اور اگر وزیر دفاع کے اتفاق رائے سے یہ طے پائے کہ فنڈ کی ان مقاصد کیلئے مزید ضرورت نہیں جن کیلئے جاری کئے گئے تھے تو وہ وزیر خارجہ یہ رقوم واپس کر سکتے ہیں۔(ب) منتقل فنڈ کا استعمال۔سیکشن 203 کی ذیلی شق (د) اور (ع) کے تحت پیراگراف (الف) میں دی گئی اتھارتی اگر فنڈ منتقل کرتی ہے تو انہی اوقات اور مقاصد کے تحت پاکستان انسداد خانہ جنگی فنڈ کے لئے استعمال ہوگی۔(ج) دوسری اتھارٹیوں سے تعلقات۔ اس سب سیکشن کے تحت معاونت فراہم کرنے والی اتھارٹی اضافی طور پر دیگر ممالک کو بھی امداد کی فراہمی کا اختیار رکھے گی۔(د) نوٹیفکیشن۔ وزیر خارجہ سب

پیراگراف (اے) کے تحت فنڈز کی فراہمی سے کم از کم 15 روز قبل کانگریس کی کمیٹیوں کو تحریری طور پر فنڈز کی منتقلی کی تفصیلات سے آگاہ کریں گی۔(ر) نوٹیفکیشن کی فراہمی۔اس سیکشن کے تحت کسی نوٹیفکیشن کی ضرورت کی صورت میں کلاسیفائیڈ یا غیر کلاسیفائیڈ نوٹیفکیشن جاری کیا جائے گا۔ (س) کانگریسی کمیٹیوں کی وضاحت۔اس سیکشن کے تحت مجاز کانگریشنل کمیٹیوں سے مراد (1) ایوان نمائندگان کی آرمڈ سروسز کمیٹی اور خارجہ تعلقات کمیٹی (2) سینٹ کی آرمڈ سروسز اور خارجہ تعلقات کمیٹی ہے۔سیکشن 205..........فراہم کی گئی امداد کا سویلین کنٹرول..........ضروریات (1) مالی سال 2010ء سے مالی سال 2014ء کے دوران حکومت پاکستان کو سکیورٹی کیلئے فراہم کی گئی براہ راست نقد امداد پاکستان کی سویلین حکومت کے سویلین حکام کو فراہم کی جائے گی۔کیری لوگر بل کی سیکشن 205 کے تحت مخصوص امدادی پیکیج پر سویلین کنٹرول کی شرط.......... کیری لوگر بل میں سیکشن 205 کس تحت پاکستان کو امداد کی فراہمی کیلئے سویلین کنٹرول کی شرائط عائد کی گئی ہیں۔(ا) شرائط: (1) عمومی طور پر 2010ء سے 2014ء تک حکومت پاکستان کو امریکہ کی جانب سے ملنے والی سکیورٹی معاملات سے متعلقہ کیش امداد یا دیگر نان اسسٹنس (غیر امدادی) ادائیگیاں صرف پاکستان لی سویلین حکومت کی سویلین اتھارٹی کو دی جائے گی۔(2) دستاویزی کارروائی مالی سال 2014 -2010ء تک امریکی وزیر خارجہ وزیر دفاع کی معاونت اور تعاون سے اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ امریکہ کی جانب سے حکومت پاکستان کو دی جانے والی غیر امدادی (Non-Assistance) ادائیگیوں کی حتمی دستاویزات پاکستان کی سویلین حکومت کی سویلین اتھارٹی کو وصول ہو چکی ہیں۔(ب) شرائط میں چھوٹ: (1) سکیورٹی سے متعلق امداد، بل کے مطابق امریکی وزیر خارجہ وزیر دفاع سے مشاورت کے بعد ذیلی سیکشن (a) کے تحت سکیورٹی سے متعلق امداد پر عائد شرائط کو ختم کر سکتے ہیں تاہم اس کیلئے ضروری ہے کہ یہ سکیورٹی امداد امریکی بجٹ کے فنکشن نمبر 150 (بین الاقوامی معاملات) سے دی جا رہی ہو اور

امریکی وزیر خارجہ کانگریس کی متعلقہ کمیٹیوں کو اس امر کی یقین دہانی کرائیں کہ شرائط میں چھوٹ امریکہ کی قومی سلامتی کیلئے ضروری اور امریکی مفاد میں ہیں۔ (2) غیر امدادی (Non-Assistance) ادائیگیاں امریکی وزیر دفاع، وزیر خارجہ کی مشاورت سے ذیلی سیکشن (a) کے تحت ایسی غیر امدادی ادائیگیاں جو بجٹ فنکشن 050 (قومی دفاع) کے اکاؤنٹس سے کی جارہی ہوں، پر عائد شرائط کو ختم کر سکتے ہیں۔

تاہم اس چھوٹ کیلئے وزیر دفاع کو کانگریس کی متعلقہ کمیٹیوں کو یقین دہانی کرانا ہوگی کہ پابندیوں میں چھوٹ امریکہ کے قومی مفاد کیلئے اہم ہے۔ (ج) بعض مخصوص سرگرمیوں پر سیکشن (205) کا اطلاق۔ درج ذیل سرگرمیوں پر سیکشن 205 کے کسی حصے کا اطلاق نہیں ہوگا۔ (1) ایسی کوئی بھی سرگرمی جس کی رپورٹنگ 1947ء کے قومی سلامتی ایکٹ (50U.S.C 413 et Seq.) کے تحت کیا جانا ضروری ہے۔ (2) جمہوری انتخابات یا جمہوری عمل میں عوام کی شرکت کی فروغ کیلئے دی جانے والی امداد (3) ایسی امداد یا ادائیگیاں جن کا وزیر خارجہ تعین کریں اور کانگریس کی متعلقہ کمیٹیوں کو یقین دہانی کرائیں کہ مذکورہ امداد یا ادائیگیوں کو ختم کرنے سے جمہوریت حکومت اقتدار میں آگئی ہے۔ (4) مالی سال 2005ء میں رونلڈ ڈبلیو ریگن نیشنل ڈیفنس آتھورائزیشن ایکٹ کی سیکشن (208) (ترمیم شدہ) کے تحت ہونے والی ادائیگیاں (Public Law 108-375, 118 (5), Stat 2086) امریکی محکمہ دفاع اور وزارت دفاع اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مابین کراس سروسنگ معاہدے کے تحت کی جانے والی ادائیگیاں، (6) مالی سال 2009ء کیلئے ڈنکن ہنٹر نیشنل ڈیفنس آتھورائزیشن ایکٹ کی سیکشن (943) کے تحت کی جانے والی ادائیگیاں (Public Law 110-417, 112 Stat 4578) (د) ''اصطلاحات'' کی وضاحت رتعریف سیکشن 205 میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کی تعریف۔ وضاحت اس طرح ہے۔ (1) ''متعلقہ کانگریس کمیٹیوں'' سے مراد

ایوان نمائندگان اخراجات سے متعلق کمیٹیاں، آرمڈ سروسز اور فارن افیئرز کی کمیٹیاں سینٹ کی اخراجات سے متعلق کمیٹیاں، آرمڈ سروسز اور فارن افیئرز کمیٹیاں ہیں۔ (2) ''پاکستان کی سویلین حکومت'' کی اصطلاح میں ایسی پاکستانی حکومت شامل نہیں۔ جس کے باقاعدہ منتخب سربراہ کو فوجی بغاوت یا فوجی حکم نامے کے ذریعے اقتدار سے ہٹا دیا گیا ہو۔ عنوان III حکمت عملی، احتساب، مانیٹرنگ اور دیگر شرائط .... سیکشن 301 حکمت عملی رپورٹس .... (اے) پاکستان کی امداد سے متعلق حکمت عملی کی رپورٹ۔ اس ایکٹ کے نافذ العمل ہونے سے 45 روز کے اندر سیکرٹری خارجہ کانگریس کی متعلقہ کمیٹیوں کو پاکستان کی امداد سے متعلق امریکی حکمت عملی اور پالیسی کے حوالے سے رپورٹ پیش کرے گا۔ رپورٹ میں درج ذیل چیزیں شامل ہوں گی۔ (1) پاکستان کو امریکی امداد کے اصولی مقاصد .... (2) مخصوص پروگراموں، منصوبوں سیکشن 101 کے تحت وضع کردہ سرگرمیوں کی عمومی تفصیل اور ان منصوبوں، پروگراموں اور سرگرمیوں کے لئے مالی سال 2010ء سے 2014ء تک مختص کردہ فنڈز کی تفصیلات۔

(3) ایکٹ کے تحت پروگرام کی مانیٹرنگ آپریشنز، ریسرچ اور منظور کردہ امداد کے تجزیے کا منصوبہ۔ (4) پاکستان کے قومی، علاقائی، مقامی حکام، پاکستان سول سوسائٹی کے ارکان، نجی شعبہ، سول، مذہبی اور قبائلی رہنماؤں کے کردار کی تفصیلات جو ان پروگراموں، منصوبوں کی نشاندہی اور ان پر عملدرآمد میں تعاون کریں گے۔ جن کے لئے اس ایکٹ کے تحت امداد دی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ حکمت عملی وضع کرنے کے لئے ایسے نمائندوں سے مشاورت کی تفصیل: .... 5 اس ایکٹ کے تحت اٹھائے گئے اور اٹھائے جانے والے اقدامات سے یہ یقینی بنایا جائے گا کہ امداد افراد اور دہشت گرد تنظیموں سے الحاق رکھنے والے اداروں تک نہ پہنچے۔ 6: اس ایکٹ کے تحت پاکستان کو فراہم کردہ امداد کی سطح کا تخمینہ لگانے کیلئے اسے مندرجہ ذیل کیٹیگریوں میں تقسیم کیا گیا جسے میلینیم چیلنج اکاؤنٹ امداد (Assistance) کے لئے اہل امیدوار ملک کے تعین کے طریقہ

کار کے حوالے سے سالانہ معیاری رپورٹ (Criteria Report) میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ کیٹیگریز مندرجہ ذیل ہیں۔ (I) عوامی آزادی (II) سیاسی حقوق (III) آزادی اظہار رائے اور احتساب (IV) حکومت کی موثریت (V) قانون کی بالا دستی (VI) بدعنوانی پر قابو (VII) بیماریوں کی شرح (VIII) شعبہ صحت پر خرچ (IX) لڑکیوں کی پرائمری تک تعلیم مکمل کرنے کی شرح (X) پرائمری تعلیم پر بجٹ (XI) قدرتی وسائل کا استعمال (XII) کاروباری مشکلات کے خاتمے (XIII) لینڈ رائٹس اور ان تک رسائی (XIV) تجارتی پالیسی (XV) ریگولیٹری کوالٹی (XVI) مہنگائی پر قابو (XVII) مالی پالیسی 7: پاکستان کے پاس پہلے سے موجود ہیلی کاپٹرز کی تبدیلی اور اس حوالے سے تربیت اور ان کی درستگی کے لئے سفارشات اور تجزیہ بھی کیا جائے گا۔ (B) علاقائی حکمت عملی کی تفصیلی رپورٹ.........کانگریس کی فہم وفراست؛ یہ کانگریس کی فہم وفراست ہے کہ امریکی قومی سلامتی کے مقاصد کے حصول، پاکستان میں دہشت گردوں کی محفوظ پناہ گاہوں کے خاتمے کے لئے ایک تفصیلی ترقیاتی منصوبے کی ضرورت ہے۔ جس میں دیگر متعلقہ حکومتوں کے تعاون واشتراک سے قومی طاقت کے تمام عناصر کو اس مقصد کے لئے استعمال میں لایا جائے۔ پاکستان کی دیرپا خوشحالی اور سلامتی کے لئے بھی ضروری ہے کہ پاکستان، افغانستان اور بھارت کے مابین مضبوط تعلقات ہوں۔ علاقائی سلامتی کی تفصیلی حکمت عملی: پاکستان میں دہشت گردوں کی محفوظ پناہ گاہوں کے خاتمے کے لئے صدر پاکستانی حکومت اور دیگر علاقائی حکومتوں اور اداروں کے اشتراک سے علاقائی سلامتی کی حکمت عملی ترتیب دیں گے۔ پاک افغان سرحدی علاقوں فاٹا، صوبہ سرحد، بلوچستان اور پنجاب کے علاقوں میں اس علاقائی سلامتی کی حکمت عملی پر موثر عملدرآمد اور انسداد دہشت گردی کے لئے موثر کوششیں عمل میں لائی جائیں گی۔ 3 رپورٹ: عمومی طور پر اس ایکٹ کے لاگو ہونے کے 180 روز کے اندر اندر صدر علاقائی سلامتی کی حکمت عملی کے حوال سے رپورٹ کانگریس کمیٹی کو جمع کروائیں گے۔ جس کے مندرجات میں

لاقائی سلامتی کی حکمت عملی کی رپورٹ کی کاپی، اہداف کا تعین اور تجویز کردہ وقت اور حکمت عملی پر مل کے لئے بجٹ کی تفصیل شامل ہے۔ (ب) رپورٹ میں ریجنل سیکیورٹی کی جامع حکمت عملی کی یک نقل شامل ہوگی۔ جس میں اہداف سمیت حکمت عملی پر عملدرآمد کیلئے مجوزہ وقت اور بجٹ کی تفصیلات شامل ہوں گی۔ (C) مناسب کانگریسی کمیٹی کی تعریف.........اس پیراگراف کے طابق مناسب کانگریسی کمیٹی کا مطلب (i) ایوان نمائندگان کی کمیٹی برائے Appropriations، امور کمیٹی برائے مسلح افواج، کمیٹی برائے خارجہ امور اور مستقل سلیکٹ کمیٹی برائے انٹیلی جنس ہوگا اور (ii) سینٹ کی کمیٹی برائے Appropriations، کمیٹی برائے مسلح افواج، کمیٹی برائے خارجہ امور اور مستقل سلیکٹ کمیٹی برائے انٹیلی جنس ہوگا۔ (c) سکیورٹی میں مدد کے حوالے سے منصوبہ: اس قانون کے بنائے جانے کے 180 دن کے اندر وزیر خارجہ مناسب کانگریسی کمیٹی کے سامنے وہ منصوبہ پیش کریں گے جس کیلئے فنڈز مختص کئے جائیں گے اور یہ مالی سال 2010ء سے 2014ء تک ہر سال ہوگا، اس منصوبے میں یہ بتایا جائے گا کہ رقم کا استعمال کس طرح سے سیکشن 204 میں مذکورہ رقوم سے متعلقہ ہے۔ سیکشن 302: مانیٹرنگ رپورٹس (a) سیکشن 301 (اے) پر عمل کرتے ہوئے Pakistan Assistance Strategy Report پیش کئے جانے کے 180 دن کے اندر (ششماہی) اور بعد ازاں 30 ستمبر 2014ء تک ششماہی بنیادوں پر سیکرٹری خارجہ کی طرف سے سیکرٹری دفاع کے ساتھ مشاورت کے بعد مناسب کانگریسی کمیٹی کو رپورٹ پیش کی جائے گی۔ جس میں اس طرح (180 دنوں میں) فراہم کی گئی مدد ر معاونت کی تفصیلات ہوں گی۔ اس رپورٹ میں درج ذیل تفصیلات ہوں گی۔ (1) جس عرصے کیلئے یہ رپورٹ ہوگی اس عرصے کے دوران اس ایکٹ کے ٹائٹل ایک کے تحت کسی پروگرام، پراجیکٹ اور سرگرمی کے ذریعے فراہم کی گئی معاونت اور اس کے ساتھ ساتھ جس علاقے میں ایسا کیا گیا ہوگا اس کا حدود اربعہ اس رپورٹ میں شامل ہوگا اور اس میں رقم

کا بھی ذکر ہوگا جو اس کے لئے خرچ ہوگی، جہاں تک پہلی رپورٹ کا تعلق ہے تو اس میں مالی سال 2009ء میں پاکستان کی معاونت کیلئے فراہم کی گئی رقوم کی تفصیل ہوگی اور اس میں بھی ہر پروگرام، پراجیکٹ اور سرگرمی کے بارے میں بتایا جائے گا۔(2) رپورٹ کے عرصے کے دوران اس ایکٹ کے ٹائٹل ایک کے تحت پراجیکٹ شروع کرنے والے ایسے امریکی یا کسی اور ملک کے شہریوں یا تنظیموں کی فہرست بھی رپورٹ میں شامل ہوگی جو ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ رقم رفنڈز حاصل کریں گے اور یہ فہرست کسی کلاسیفائیڈ ضمیمہ میں دی جاسکتی ہے تاکہ اگر کوئی سکیورٹی رسک ہو تو اس سے بچا جاسکے اور اس میں اس کو خفیہ رکھنے کا جواز بھی دیا جائے گا۔(3) رپورٹ میں سیکشن 301 (اے) کی ذیلی شق (3) میں مذکورہ منصوبے کے بارے میں تازہ ترین اپ ڈیٹس رپیش رفت اور اس ایکٹ کے ٹائٹل ایک کے تحت دی گئی معاونت کے اثرات کی بہتری کے لئے اقدامات کی تفصیل بھی شامل ہوگی۔(4) رپورٹ میں ایک جائزہ بھی پیش کیا جائے گا جس میں اس ایکٹ کے تحت فراہم کی گئی معاونت کے موثر راثر پذیری کا احاطہ کیا گیا ہوگا اور اس میں سیکشن 301 (اے) کی ذیلی شق 3 میں بتائے گئے طریقہ کار کو مدنظر رکھ کر مطلوبہ مقاصد کے حصول یا نتائج کا جائزہ لیا گیا ہوگا اور اس سب سیکشن کے پیراگراف 3 کے تحت اس میں ہونیوالی پیش رفت یا اپ ڈیٹ بھی بیان کی جائے گی جو کہ یہ جانچنے کیلئے کہ آیا مطلوبہ نتائج حاصل ہوئے ہیں یا نہیں ایک منظم مربوط بنیاد فراہم کرے گی، اس رپورٹ میں ہر پروگرام اور پراجیکٹ کی تکمیل کا عرصہ بھی بتایا جائے گا۔(5) امریکہ کی طرف سے مالیاتی فزیکل، تکنیکی یا انسانی وسائل کے حوالے سے کوئی کمی وبیشی جو کہ ان فنڈز پر موثر استعمال یا مانیٹرنگ میں رکاوٹ ہوگی، کے بارے میں بھی اس رپورٹ میں ذکر کیا جائے گا۔(6) امریکہ کی دوطرفہ یا کثیر الطرفہ معاونت کے منفی اثرات کا ذکر بھی اس رپورٹ میں شامل ہوگا اور اس حوالے سے اگر کوئی ہوگی تو پھر تبدیلی کیلئے سفارشات بھی دی جائیں گی اور جس علاقے کیلئے یہ فنڈز یا معاونت ہوگی اس کی انجذابی صلاحیت

رگنجائش بھی رپورٹ میں مذکور ہوگی۔(7) رپورٹ میں اس ایکٹ کے ٹائٹل ایک کے تحت ہونے والے اخراجات کے ضیاع، فراڈ یا غلط استعمال کے حوالے سے کوئی واقعہ یا رپورٹ بھی شامل کی جائے گی۔(8) آن فنڈز کی رقم جو کہ سیکشن 102 کے تحت استعمال کیلئے مختص کی گئی اور جو کہ رپورٹ کے عرصے کے دوران انتظامی اخراجات یا آڈٹ یا سیکشن 103 یا 101 (سی) کی ذیلی شق 2 کے تحت حاصل اختیارات کے ذریعے استعمال کی گئی کی تفصیلات بھی رپورٹ میں شامل ہوں گی۔(9) سیکشن 101 (سی) کی ذیلی شق 5 کے تحت قائم رمقرر کردہ چیف آف مشن فنڈ کی طرف سے کئے گئے اخراجات جو کہ اس عرصے کے دوران کئے گئے ہوں گے جس کیلئے رپورٹ تیار کی گئی ہے۔اس رپورٹ میں شامل ہوں گے۔اس میں ان اخراجات کا مقصد بھی بتایا جائے گا اور اس میں چیف آف مشن کی طرف سے ایک لاکھ ڈالر سے زائد کے اخراجات کے وصول کنندگان کی فہرست بھی شامل ہوگی۔(10) اس ایکٹ کے ٹائٹل ایک کے تحت پاکستان کو فراہم کی گئی معاونت کا حساب کتاب (اکاؤنٹنگ) جو کہ سیکشن 301 (اے) کی ذیلی شق 6 میں دی گئی مختلف کیٹیگریز میں تقسیم کی گئی ہے کی تفصیل بھی رپورٹ میں بیان کی جائے گی۔(11) اس رپورٹ میں درج ذیل مقاصد کیلئے حکومت پاکستان کی طرف سے کی گئی کوششوں کے جائزہ بھی پیش کیا جائے گا۔(الف) فاٹا یا بندوبستی علاقوں میں القاعدہ، طالبان یا دیگر انتہا پسند اور دہشت گرد گروپوں کے خاتمے، ان کو غیر موثر یا شکست دینے کیلئے کی گئی کوششیں۔(ب) ایسی قوتوں کے پاکستان میں موجود محفوظ ٹھکانوں کے خاتمے کیلئے کی گئی کوششیں..........(ج) لشکر طیبہ اور جیش محمد کے تربیتی مراکز کی بندش (د) دہشت گرد اور انتہا پسند گروپوں کو ہر قسم کی مدد و تعاون کا خاتمہ (ر) ہمسایہ ممالک میں حملوں کی روک تھام کیلئے کوششیں راقدامات (س) مدارس کے نصاب کی نگرانی میں اضافہ اور طالبان یا دہشت گرد یا انتہا پسند گروپوں سے تعلق رکھنے والے مدارس کی بندش کیلئے کی گئی کوششیں۔(ش) انسداد منی لانڈرنگ قوانین اور دہشت گردی کے

انسداد کیلئے فنڈز کے استعمال میں بہتری یا اضافے کی کوششیں یا اقدامات مالیاتی ایکشن ٹاسک فورس کیلئے مبصر کا درجہ اور دہشت گردی کیلئے ماری وسائل کی فراہمی روکنے کیلئے اقوام متحدہ کے بین الاقوامی کنونشن پر عملدرآمد کیلئے کی گئی کوششیں۔(12) پاکستان کی طرف سے جوہری عدم پھیلاؤ (جوہری مواد اور مہارت) کیلئے کی گئی کوششوں کی جامع تفصیل بھی اس رپورٹ میں شامل ہوگی۔ (13) اس رپورٹ میں ایک جائزہ بھی پیش کیا جائے گا تاکہ آیا پاکستان کو فراہم کی گئی معاونت اس کے جوہری پروگرام کی توسیع میں بالواسطہ یا بلاواسطہ مددگار ثابت ہو رہی ہے یا نہیں۔ آیا امریکی معاونت کے انحراف یا پاکستان کے وسائل کی Realloction جو کہ بصورت دیگر پاکستان کے جوہری پروگرام سے غیر متعلقہ سرگرمیوں پر خرچ ہوں گے۔(14) رپورٹ میں سیکشن 202(بی) کے تحت مختص کئے گئے اور خرچ کئے گئے فنڈز کی جامع تفصیلات بھی شامل ہوں گی۔(15) اس رپورٹ میں حکومت پاکستان کا فوج پر موثر سویلین کنٹرول، بشمول سویلین ایگزیکٹو لیڈرز اور پارلیمنٹ کا فوجی رملٹری بجٹ کی نگرانی اور منظوری، کمانڈ کے تسلسل، سینئر فوجی افسروں کی ترقی میں عمل دخل اور سول انتظامیہ میں فوجی مداخلت کی تفصیلات بھی شامل ہوں گی۔

(b) حکومتی احتساب دفتر کی رپورٹس .... پاکستان معاونت لائحہ عمل رپورٹ: سیکشن 301 (اے) کے تحت پاکستان معاونت لائحہ عمل رپورٹ پیش کئے جانے کے ایک سال کے اندر کنٹرول جنرل آف امریکہ مناسب کانگریسی کمیٹی کو ایک رپورٹ پیش کرے گا جس میں درج ذیل تفصیلات مذکور ہوں گی۔(الف) پاکستان معاونت لائحہ عمل رپورٹ کا جائزہ اور اس حوالے سے رائے (ب) اس ایکٹ کے تحت مقاصد کے حصول کیلئے امریکی کوششوں کو موثر بنانے کیلئے اگر کنٹرولر جنرل کوئی اضافی اقدامات مناسب سمجھتا ہے تو وہ بھی بیان کئے جائیں گے۔(پ) آرمز ایکسپورٹ کنٹرول ایکٹ (22 یو ایس سی) کی شق 22 کے تحت دی گئی گرانٹ کے مطابق پاکستان کی طرف سے کئے گئے اخراجات کی مفصل رپورٹ بھی پیش کی جائے گی۔

اگرچہ اس وقت پاکستان میں کیری لوگر بل میں عائد سخت شرائط پر تند و تیز بحث جاری ہے اور حکومتی ایوانوں میں اس بات کا تجزیہ کیا جا رہا ہے کہ اس تباہ کن ناکامی کا اصل ذمہ دار کون ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بل کی منظوری کے آخری مراحل کے دوران امریکی ایوانوں میں پاکستان کے حق میں رائے ہموار کرنے کے لئے لاکھوں ڈالر کے خرچ سے ایک نئی امریکی فرم کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں حالانکہ یہ امر ابھی واضح نہیں کہ بل کی منظوری کے آخری مرحلہ پر اس فرم کی خدمات کس قدر کارگر ثابت ہوں گی۔

امریکہ میں پاکستان کے حق میں کام کرنے والی اس نئی فرم کا نام کیسڈی اینڈ ایسوسی ایٹس ہے مذکورہ فرم کو واشنگٹن میں لابنگ کرنے والی سب سے بڑی کمپنیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ پاکستان کو کیری لوگر بل کے ذریعے ملنے والی امداد میں کوآرڈینیٹر کا کردار ادا کرنے والی شخصیت میں رابن رافیل نئی ذمہ داریاں سنبھالنے سے پہلے اس کمپنی میں اہم حصہ دار تھیں تاہم اب بحیثیت کوآرڈینیٹر تعیناتی کے بعد ان کا کام پاکستان کو ملنے والی امداد کے صحیح استعمال کی مانیٹرنگ کرنا اور اس سلسلے میں امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کو رپورٹ پیش کرنا ہے۔

تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ کیری لوگر امدادی بل میں سخت شرائط عائد کئے جانے پر پاکستان کی مایوسی کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ بل کی منظوری کے آخری مرحلہ پر حکومت پاکستان نے موجودہ لابنگ فرم مارک اے سیگل کی خدمات ترک کر دی ہیں۔ اس فرم کے مالک مارک سیگل شہید محترمہ بھٹو کے ذاتی دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جنہوں نے ان کے ساتھ مشترکہ طور پر ایک کتاب بھی لکھی جو ان کی المناک موت کے بعد شائع ہوئی۔ لابنگ کی خدمات انجام دینے والی نئی فرم کیسڈی کے ایک عہدیدار نے بتایا کہ پاکستان کے ساتھ ان کا معاہدہ سالانہ سات لاکھ امریکی ڈالر میں ہوا ہے جبکہ دیگر اخراجات اس کے علاوہ ہونگے۔ اس طرح ان اخراجات کی مالیت کئی لاکھ ڈالر تک پہنچ جائے گی۔ کیسڈی ایسوسی ایٹس نے امریکی محکمہ انصاف کے پاس پاکستان کی

لابنگ فرم کی حیثیت سے 14 جولائی 2009ء کو اپنی رجسٹریشن کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فرم امریکہ میں سرکاری اور نجی شعبوں میں فیصلہ ساز شخصیات اور اداروں میں پاکستان کی پوزیشن کی جانچ کرتی ہے اور پاکستان کے مقاصد اور مفادات کے متعلق امریکی حکومت، قانون ساز اداروں کے عہدیداروں کو نہ صرف جانکاری دیتی ہے بلکہ امریکی حکومت کی پالیسی کو پاکستان کے مقاصد اور مفادات سے ہم آہنگ کرنے کے لئے لابنگ کرنے کی ذمہ داری نبھاتی ہے۔ یہ فرم نجی شعبہ میں امریکی صنعتی اداروں کو پاکستان کے قریب لانے کے علاوہ امریکی حکومت کی پالیسیوں اور امداد دینے کے لئے امریکی حکومت کی ترجیحات سے پاکستان کو آگاہ رکھتی ہے۔

خیال ہے کہ ایسے وقت جب کیری لوگر بل امریکی ایوانوں میں منظوری کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اس وقت نئی امریکی لابنگ فرم کی خدمات حاصل کرنے سے پاکستان کے اس زمرے میں اٹھنے والے مصارف میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا حالانکہ یہ بات واضح نہیں کہ اب تک اس فرم کی خدمات نے پاکستان کیلئے کون سے فوائد کے حصول کو ممکن بنایا ہے۔ اگرچہ موجودہ لابنگ فرم کے مالک مارک سیگل کا کہنا ہے کہ کیری لوگر بل کی منظوری پاکستان کے لئے ایک بڑی کامیابی ہے روزنامہ دی نیوز اسلام آباد کے پاس یہ بات آن دی ریکارڈ ہے کہ انہوں نے جولائی میں اخبار مذکورہ کے سامنے دعویٰ کیا تھا کہ ان کی کمپنی نے پاکستان کے لئے امدادی بل منظور کرانے میں مدد دی۔ جس کے نتیجے میں پاکستان کو ملنے والی غیر فوجی امداد تین گنا ہو کر پانچ سال میں سات اعشاریہ پانچ ارب ڈالر تک جا پہنچے گی۔ انہوں نے کہا تھا کہ بھارتی لابی کی جانب سے بعض ارکان کانگرس کو سخت شرائط عائد کرنے کیلئے تیار کیا گیا تھا لیکن ان کی کمپنی نے یہ کوششیں ناکام بنا دیں اگر کوششیں کامیاب ہو جاتیں تو بھارت کے مقابلے میں پاکستان کو دفاع کے معاملے میں مشکلات پیش آ سکتی تھیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے پاکستان کے حریفوں اور امریکہ میں پاکستان کے خلاف پراپیگنڈے

کا توڑ بھی کیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ”انہوں نے پاکستان کیلئے پیش ایکٹ بل منظور کروانے میں بھی مدد کی جس کے ذریعے پاکستان میں صحت کی سہولتوں اور لڑکیوں کی تعلیم کیلئے امداد کا حصول ممکن ہوا“ جولائی کے مہینے میں مارک سیگل کی جانب سے دیا گیا بیان اس ہفتے غلط ثابت ہوا جب امریکی سینٹ نے کڑی شرائط عائد کرتے ہوئے پاکستان کیلئے کیری لوگر بل کی منظوری دے دی۔ اس بل میں امداد کی شرائط توقعات سے کہیں زیادہ سخت ثابت ہوئی ہیں ایک ماہر تجزیہ نگار نے اس موقع پر کہا ہے کہ مسٹر سیگل کی لابنگ کی کوششیں بری طرح ناکام ہو چکی ہیں۔ اس طرح مارک سیگل نے فاٹا میں ری کنسٹرکشن اپر چیونٹی زونز (Roz) کے قیام سے متعلق روزنامہ دی نیوز کو بتایا کہ امریکی لیبر تنظیموں کی جانب سے سخت مخالفت کے باوجود ہم نے ارکان کانگریس سے براہ راست رابطہ کر کے انہیں ”آراوزیز“ کے منصوبے کو کیری لوگر بل میں شامل کرنے اور بل ایوان کی رولز کمیٹی میں پیش کرنے کیلئے کہا جس کی وجہ سے پورے ایوان سے اس بل کی منظوری ہوئی۔

مارک سیگل کے مطابق اس قانون کے ذریعے پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقوں میں ری کنسٹرکشن اپر چیونٹی زونز (آراوزیز) کا قیام ممکن ہو گا۔ امریکی سینٹروں کینٹ، ویل، کینزی اور پیچ کی جانب سے بھی اس نوعیت کے بل سینٹ میں زیر غور ہیں روز Rozs کے قیام سے پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقوں میں تیار کی گئی ٹیکسٹائل مصنوعات، دستکاریوں، کارپٹ، قیمتی پتھر اور دوسری اشیاء کو امریکی ڈیوٹی فری مارکیٹ تک رسائی حاصل ہو گی امریکہ کی جانب سے اردن، مصر اور بعض دیگر ملکوں میں ایسے منصوبوں پر عمل کیا جا رہا ہے ہم نے ان منصوبوں کو معاشی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کیلئے کام کیا ہے۔ جس کا مقصد علاقے میں سیاسی استحکام پیدا کرنا ہے ہم امریکی انتظامیہ پر اس منصوبے کو بلوچستان تک پھیلانے کیلئے زور دے رہے ہیں۔

مارک سیگل کے بلند بانگ دعوؤں کی قلعی اس وقت کھل گئی جب اس ہفتے کیری لوگر بل کی سینٹ سے منظوری کے بعد بلی تھیلے سے باہر آ گئی جس میں ری کنسٹرکشن اپر چیونٹی زونز

(آراوزیز) کے قیام کا ذکر تک نہ تھا مارک سیگل نے ان دعوؤں کے عوض پاکستان سے جو اجرت حاصل کی اس کی ایک جھلک بھی ہوش اڑا دینے کیلئے کافی ہے۔ انہوں نے امریکی محکمہ انصاف کے پاس پاکستان سے ڈالر کی صورت میں بطور معاوضہ حاصل کی گئی رقم کی جو تفصیلات جمع کروائی ہیں ان میں گاڑی کی پارکنگ فیس کے علاوہ پھولوں کی خریداری فرنیچر کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی حتیٰ کہ پاکستان سے آنے والے سفارتکاروں کیلئے مہنگے داموں ہوائی سفر کے ٹکٹ تک شامل ہیں۔ ان اکاؤنٹس کی تفصیلات امریکی محکمہ انصاف کی ویب سائٹ فارن ایجنٹس رجسٹریشن ایکٹ (FARA) پر دستیاب ہیں۔ پاکستان امریکہ میں لابنگ کیلئے کس قدر کثیر سرمایہ خرچ کرتا ہے اور اس کام کیلئے کتنی امریکی فرموں کے اخراجات پورے کئے جاتے ہیں۔ اس کی تفصیل اس ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔ بعض فرموں کی جانب سے محکمہ انصاف کے پاس رجسٹریشن تو کرائی گئی ہے اور پاکستان سے حاصل ہونے والی رقم کی تفصیل بھی دی گئی ہے لیکن اس کے بدلے پاکستان کو دی جانے والی خدمات کا کوئی ذکر نہیں اس امر کی تفصیل اجمالاً درج ذیل ہے۔ (1) برسن مارسٹیلر، ورمونٹ ایونیو، چھ ماہ کیلئے حاصل کردہ رقم 119,946 ڈالر، فرم کی نوعیت میڈیا ریلیشنز، پاکستان کیلئے خدمات کا ذکر نہیں۔

2۔ ڈیوی اینڈلی بیوف نیویارک ایونیو چھ ماہ کیلئے حاصل کردہ رقم .... تین لاکھ ڈالر پاکستان کی وزارت تجارت کیلئے خدمات

3۔ جے ڈبلیو ایشیا ٹک اے بے این ایمرو بنک بلڈنگ کراچی .... حاصل کردہ رقم کا ذکر نہیں شعبہ ایڈوائزنگ حکومت پاکستان کیلئے خدمات کا ذکر نہیں۔

4۔ راک لارڈ سٹریٹیجی زساؤتھ واشنگٹن، حاصل کردہ رقم کا ذکر نہیں کام کی نوعیت پی آئی اے کیلئے قانونی اور دیگر خدمات۔

(نومبر 2009ء)

لٹ کے کھا گئے

کیری لوگر بل پر بہت باتیں ہو چکیں لیکن جیسا کہ آغاز ہی میں سیانوں نے کہہ دیا تھا کہ یہ بل امریکہ نے تیار کیا ہے گو کہ اس کی تیاری میں بھارتی اور کچھ ناخلف پاکستانیوں نے بھی اپنا حصہ بقدر جثہ ڈالا ہے۔ اب معمول کے مطابق ہمارے کچھ سیاستدان اس پر شور و غوغا کر کے اپنا قد بڑھانے کی کوشش تو کریں گے لیکن بالآخر وہ بھی اسی تنخواہ پر نوکری کرنے پر رضامند ہو جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔

مسلم لیگ (ن) نے حسب سابق مشرف کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعہ 6 کے تحت مقدمہ چلانے کے معاملے کی طرح اس مسئلے پر بھی خاصی سرگرمی دکھائی۔ ٹی وی چینلز اور اسمبلی وزرا پر خطابت کے جوہر دکھائے لیکن آخر کار امریکہ، لندن کے مختصر دوروں اور امریکی زعما خصوصاً سینیٹر کیری لوگر سے ملاقات کے بعد مشرف کی پھانسی کے معاملے کی طرح اس مسئلے پر بھی ”پرانی تنخواہ پر کام کرتے رہنے“ کی پالیسی پر عمل پیرا ہو گئے۔ اب کبھی کبھی سیاسی کڑھی میں ابال آتا ہے تو میڈیا کا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ بیانات دے کر اپنی ”اصولی سیاست“ کا ڈھول پیٹنے لگتے ہیں۔

ہمارے ہر اس سیاستدان کو جو اقتدار کے ایوانوں سے دھکے کھا کر نکل آیا ہو، سلطان سے

غریب عوام کی فکر بہت پریشان رکھتی ہے۔ میاں نواز شریف نے ایک پریس کانفرنس میں یہ انکشاف کیا ہے کہ اس وقت پاکستان پر اندرونی اور بیرونی قرضوں کے بوجھ کی مالیت 8 ہزار ارب روپے تک پہنچ چکی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جب ان کی حکومت برخاست کی گئی تو پاکستان پر قرضوں کا بوجھ 3 ہزار ارب روپے سے کم تھا اور اب قرضوں کا بوجھ اتارنے کے لئے قوم کو خود انحصاری اپنانی ہوگی اور ہر شخص کو ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ این آر او کے متعلق انہوں نے حکومت کو تنبیہہ کی کہ وہ اس بل کو پارلیمنٹ سے منظور نہ کروائے اگر ایسا کیا گیا تو کرپشن کو قانونی شکل حاصل ہو جائے گی اور پاکستان پوری دنیا میں بدنام ہوگا۔ اس کالے قانون کو پارلیمنٹ سے منظور کروانا پاکستان پر بدنما داغ ہوگا۔ ایسی ہی باتیں وزیر اعلیٰ پنجاب نے بھی کی ہیں۔ علاوہ ازیں مسلم لیگ (ق) کے رہنماؤں نے بھی اس بل کی پارلیمنٹ میں مخالفت کرنے کا عندیہ دیا ہے اور این آر او کو صرف پرویز مشرف کی ذاتیات سے منسوب کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس آرڈیننس کو جاری کرنے میں مسلم لیگ (ق) کا کوئی عمل دخل نہ تھا اور این آر او پیپلز پارٹی اور پرویز مشرف کے درمیان معاہدے کا نتیجہ ہے۔ مقام افسوس کہ اس وقت ہمارا ملک جو ہر قسم کے قدرتی وسائل سے مالا مال ہے اور جس کے عوام محنت کش اور عظیم ہیں۔ اس کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ مقروض ملکوں میں ہو گیا ہے اور اس وقت آئی ایم ایف کے قرضوں میں پوری طرح جکڑا جا چکا ہے۔ پاکستان میں غیر ملکی قرضوں کی ریل پیل ہے۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 2008ء میں پاکستان نے ایشیائی ترقیاتی بینک سے 1.7 ارب ڈالر کا ریکارڈ قرضہ حاصل کیا اور 1966ء سے لے کر 2007ء تک ایشیائی ترقیاتی بینک سے حاصل کردہ قرضوں کی مالیت 9.8 ارب ڈالر تھی جو 2008ء تک 14 ارب ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔ ملک اس وقت ایشیائی ترقیاتی بینک، آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور دیگر بین الاقوامی اداروں کا تقریباً 60 ارب ڈالر کا مقروض ہے اور یہ قرضہ متواتر سود کی صورت میں بڑھتا چلا جا رہا ہے اور ہماری حکومت کا سہ گدائی لے کر در در گھوم

رہی ہے اور اس طرح پوری قوم قرضوں کے بوجھ میں بری طرح جکڑی جا چکی ہے اور اس وقت پاکستان کا ہر شہری 60 ہزار روپے کا مقروض ہے۔ پاکستان اس وقت تاریخ کے انتہائی نازک دور سے گزر رہا ہے۔ اس کی معیشت تقریباً تباہ ہو چکی ہے۔ بجلی و گیس کی لوڈشیڈنگ اور عدم دستیابی، پٹرول کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ کی وجہ سے پاکستان کی معیشت کا پہیہ مکمل طور پر جام ہو چکا ہے۔ جس سے پاکستان کا ہر تیسرا شخص بیروزگار ہو گیا ہے اور نوبت فاقہ کشی تک پہنچ چکی ہے۔ پاکستان کی آدھی آبادی خط غربت سے کم سطح پر زندگی گزار رہی ہے لیکن حکومت اپنی عیاشیوں پر اخراجات میں متواتر اضافہ کئے جا رہی ہے۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کے اہم رہنماؤں نے اپنے آپ کو حفاظتی کٹہرے میں بند کر لیا ہے اور وہ اتنے خوفزدہ ہو چکے ہیں کہ عوام کا سامنا کرنے سے پہلو تہی کر رہے ہیں۔ بااثر افراد نے اپنی حفاظت کے لئے سرکاری خرچہ پر ہزاروں اہلکاروں کو تعینات کر رکھا ہے۔ سرکاری جہاز اور ہیلی کاپٹرز غیر ضروری تقریبات پر استعمال کئے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ عوامی مسائل کم ہونے کے بجائے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ کرپشن عروج پر ہے۔ چھوٹی سطح سے اوپر تک ہر بااثر شخص اپنا حصہ وصول کر رہا ہے، عوام کا کوئی پرسان حال نہ ہے۔ بے ضابطگیوں کے حوالے سے 2007-2008ء کی ایک رپورٹ کے مطابق دفاعی پیداوار اور پی آئی اے میں 1 کھرب 60 ارب 32 کروڑ روپے کی کرپشن ہوئی۔ ریلوے میں 14 ارب 39 کروڑ روپے، اسٹیٹ لائف میں 1 ارب 80 کروڑ روپے، بورڈ آف ریونیو میں 1 کھرب 1 ارب روپے کی کرپشن کے ثبوت منظر عام پر آ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں وزارت تجارت کابینہ ڈویژن، نیشنل پاور ریگولیٹری اتھارٹی، وزارت خزانہ اور دیگر محکمے بھی اربوں روپے کی کرپشن میں ملوث ہیں، لیکن مقام افسوس کہ حکومت وقت این آر او کا سہارا لے کر پارلیمنٹ میں اس بل کو منظور کروا کر کرپشن میں ملوث لوگوں کو تحفظ دینے کی کوشش کر رہی ہے۔

یہ امر حیران کن ہے کہ میاں نواز شریف جنہوں نے ہر شہری سے ٹیکس ادا کرنے کی اپیل کی

ہے، نے قومی اسمبلی کے امیدوار کی حیثیت سے اپنے گوشوارے جمع کراتے ہوئے جو اثاثہ جات ظاہر کئے ہیں وہ بھی غور طلب ہیں جن میں انہوں نے صرف چند سو روپے انکم ٹیکس ادا کرنے کا لکھا ہے۔ علاوہ ازیں اپنے آپ کو رشتے داروں کا کروڑوں روپے کا مقروض بتایا ہے۔ یہی حال ہمارے صدر محترم اور دیگر بااثر حکام کا ہے جو پاکستان سے لوٹ مار کر کے اپنا سرمایہ بیرون ملک منتقل کررہے ہیں۔ مخدوم جاوید ہاشمی نے جو کہ ان کی پارٹی کے اہم رہنما ہیں نے تصحیح فرمایا تھا کہ اگر نواز شریف، زرداری اور دیگر سیاستدان غیر ملکوں میں جمع شدہ اپنا سرمایہ واپس لے آئیں تو پاکستان سے نہ صرف تمام قرضوں کا بوجھ اتر سکتا ہے بلکہ اس ملک کا شمار ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں ہوسکتا ہے۔ اس وقت سیاستدانوں، بیوروکریٹس، فوجی حکام اور دیگر افراد کا غیر ملکوں میں محفوظ سرمائے کی مالیت 200 ارب ڈالر کے قریب ہے جبکہ پاکستان 60 ارب ڈالر بیرونی قرضوں کا مقروض ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ سیاستدان اور دیگر افراد اپنا غیر ملکوں میں محفوظ سرمایہ فوری طور پر واپس لائیں۔ پاکستان کے بڑے سرمایہ کار میاں منشاء نے 1 ارب ڈالر ملک میں لانے کی خوشخبری دی ہے لیکن ہمارے دونوں بڑی جماعتوں کے رہنما جو پاکستان کے دوسرے اور چوتھے امیر ترین افراد ہیں نے ابھی تک غیر ملکوں میں محفوظ سرمایہ واپس لانے کی کوئی حامی نہیں بھری۔ مقام افسوس یہ سب کچھ صرف پاکستان میں ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی دیگر ملک کے سیاستدان ایسا نہیں کرتے۔

ہمارے ان محترم و معزز سیاسی قائدین پر انصار عباسی کا کالم ''دروغ برگردن راوی'' کے ساتھ پیش ہے ملاحظہ فرمائیں۔ انصار عباسی لکھتے ہیں: ''سیاست کے لئے پاکستان''! گزشتہ دنوں جیو نیوز پر چلنے والی ایک خبر کے مطابق سابق وزیر اعظم اور مسلم لیگ ن کے قائد نواز شریف نے قومی اسمبلی کے حلقہ 123 میں داخل کرائے گئے کاغذات نامزدگی میں ظاہر کیا ہے کہ ان کے بینک اکاؤنٹس میں صرف 5225 روپے ہیں اور انہوں نے 2004ء سے 2006ء تک کوئی انکم ٹیکس نہیں دیا۔ کاغذات نامزدگی میں جو مالی گوشوارے دیئے گئے ہیں ان کے مطابق انہوں نے

چوہدری شوگر ملز، رمضان شوگر ملز اور عباس اینڈ کمپنی میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے اور وہ 135 اپر مال روڈ لاہور کی پراپرٹی کے مالک ہیں۔ رائے ونڈ روڈ اور منڈیالی تحصیل فیروز والا ضلع شیخوپورہ میں ان کی 6 لاکھ 40 ہزار 965 روپے کی زرعی اراضی بھی ہے اور اسی طرح ان کے اثاثہ جات کی مالیت ایک کروڑ 85 لاکھ 37 ہزار ایک سو روپے ہیں۔ کاغذات نامزدگی کے مطابق میاں نواز شریف کے پاس 8 لاکھ 96 ہزار 425 روپے نقد ہیں جبکہ پانچ ہزار 225 روپے بینک اکاؤنٹ میں موجود ہیں۔ کاغذات نامزدگی میں یہ بھی لکھا گیا کہ میاں نواز شریف نے اپنی اہلیہ سے 16 لاکھ، صاحبزادی مریم سے 22 لاکھ، صاحبزادے حسین نواز سے 21 لاکھ اور بھائی عباس شریف سے 25 لاکھ روپے قرض لے رکھا ہے۔

قومی احتساب بیورو کی تحقیقات کے ریکارڈ میں موجود صدر آصف علی زرداری اور ان کی مرحومہ زوجہ اور سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے انکم ٹیکس گوشوارے برائے سال 1993-94ء سے 1996-97ء بھی قابل غور ہیں۔ ان گوشواروں کے مطابق صدر آصف علی زرداری نے 1992-93ء میں صرف 120,318 روپے کل آمدنی دکھائی اور صرف 2,621 روپے انکم ٹیکس ادا کیا۔ اس سال بے نظیر بھٹو صاحبہ نے اپنی کل آمدنی محض 55,806 روپے دکھائی اور صرف 1,216 روپے ٹیکس ادا کیا۔ سال 1993-94ء میں زرداری صاحب کی 142,947 روپے آمدنی تھی جس پر انہوں نے 3,142 روپے ٹیکس ادا کیا۔ اسی سال بے نظیر بھٹو صاحبہ نے 1,038,982 روپے اپنی آمدنی بتائی اور 14,842 روپے ٹیکس ادا کیا۔ سال 1994-95ء میں صدر زرداری کی سالانہ کل آمدنی 303,163 روپے تھی جس پر انہوں نے 6,492 روپے حکومت کو ٹیکس ادا کیا۔ سال 1995-96ء میں صدر زرداری نے اپنی کل آمدنی 417,212 روپے ظاہر کی۔ جس پر انہوں نے حکومت پاکستان کو 8,452 روپے ٹیکس کے طور پر ادا کیا۔ سال 1996-97ء میں صدر زرداری نے کل آمدنی 495,044 روپے ظاہر کی۔ جس پر انہوں نے

9,191 روپے ٹیکس ادا کیا۔ اس سال بے نظیر بھٹو صاحبہ نے اپنی کل آمدنی 439,062 روپے ظاہر کی اور 8,152 روپے حکومت پاکستان کو انکم ٹیکس کی مد میں ادا کیئے۔ نیب کے ریکارڈ کے مطابق اپنے کل اثاثہ جات کے متعلق صدر زرداری نے 94-1993ء میں ان کی مالیت 3,892,418 روپے دکھائی جبکہ اسی سال محترمہ بے نظیر بھٹو نے 4,570,738 روپے کل اثاثہ جات دکھائے۔ 95-1994ء صدر زرداری نے 12,175,771 روپے اور بے نظیر صاحبہ نے 14,248,194 روپے کے کل اثاثہ جات ظاہر کیئے۔ 96-1995ء میں صدر زرداری کے کل اثاثہ جات کی مالیت 10,830,565 روپے اور بے نظیر بھٹو کی 16,525,660 روپے دکھائی گئی جبکہ 97-1996ء میں بڑھ کر صدر زرداری کے اثاثہ جات 12,765,705 روپے تک پہنچ گئے اور بے نظیر بھٹو صاحبہ کے کل اثاثہ جات 18,736,892 روپے۔ یاد رہے کہ ان اثاثوں میں صدر زرداری اور بے نظیر بھٹو صاحبہ کے ملک کے اندر اور ملک سے باہر تمام پیسہ اور جائیداد شامل کی گئی تھیں۔ ان تفصیلات کے مطابق صدر زرداری اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے پاس 97-1996ء میں کل تین کروڑ اور تقریباً 14 لاکھ مالیت کے اثاثے تھے۔

آج ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ 2009ء میں جمع کرائے گئے اپنے ٹیکس گوشواروں میں جناب صدر آصف علی زرداری اور محترم نواز شریف صاحب نے حکومت پاکستان کو کتنا کتنا ٹیکس ادا کیا اور اپنے کل اثاثوں کی کتنی مالیت ظاہر کی۔ بظاہر صدر زرداری اور میاں نواز شریف کا شمار امیر ترین پاکستانیوں میں ہوتا ہے اور ان کے اثاثوں کی موجودہ مالیت بلاشبہ اربوں میں ہے۔ ایک طرف صدر زرداری کے اثاثوں کا بڑا حصہ اس ملک سے باہر ہے جس کے وہ اعلیٰ ترین حکمران ہیں۔ دوسری طرف میاں نواز شریف صاحب کے اثاثوں کا بھی ایک خاطر خواہ حصہ ملک سے باہر ہے جبکہ ان کے دونوں بیٹوں حسین نواز اور حسن نواز نے پاکستان سے پیسہ لے جا کر سعودی عرب اور برطانیہ کو اپنے کاروبار کے لئے چنا۔ صدر زرداری کے تینوں بچے بھی ملک سے باہر ہیں۔ ایک دبئی

میں اور دو برطانیہ میں زیر تعلیم ہیں۔

اطلاعات کے مطابق پاکستانی سیاست کا ایک اور اہم مہرہ چوہدری شجاعت حسین اور ان کے چچازاد چوہدری پرویز الٰہی نے بھی حالیہ سالوں میں اپنا سرمایہ اسپین بھیجا اور وہاں کاروبار کر رہے ہیں۔ چوہدری برادران کے سیاسی آقا اور بھگوڑے ڈکٹیٹر جنرل (ر) مشرف جن کا تعلق ایک Lower middle class خاندان سے تھا نے آج کروڑوں روپے کا لندن کے مہنگے ترین علاقہ میں فلیٹ خرید لیا اور ایک بیرونی جریدے کے مطابق ایک بین الاقوامی Food chain میں پیسہ لگایا۔ مشرف کی طرح ان کا بھگوڑا وزیر اعظم شوکت عزیز بھی اپنی تمام تر دولت کے ساتھ برطانیہ میں مکمل سکونت اختیار کیے ہوئے ہے۔ ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین پچھلے کئی سالوں سے برطانیہ میں قیام پذیر ہیں۔ نہیں معلوم ان کی ذات کی جانب سے پاکستان کو کتنا ٹیکس ادا کیا گیا اور انہوں نے یہاں کتنی سرمایہ کاری کی۔ اگر چہ الطاف حسین کا شمار سرمایہ کار اور ارب پتی سیاستدانوں میں نہیں ہوتا مگر اسلام آباد میں ایک حکومتی وزیر کا حوالہ دیتے ہوئے ایک ذریعے نے بتایا کہ الطاف حسین نے لندن میں اپنے ایک خاندانی جھگڑے کے عدالت کے باہر تصفیہ کے لئے 15 لاکھ برطانوی پاؤنڈ ادا کیئے۔ اگر یہ اطلاعات غلط اور بے بنیاد ہیں تو امید کی جاتی ہے کہ ایم کیو ایم صورتحال کی وضاحت کرے گی۔

اب جبکہ ملک کے بڑے بڑے سیاستدان برائے نام ٹیکس دیں اور اپنے سرمائے اور کاروبار کے لیے پاکستان پر اعتماد نہ کریں اور اس سلسلے میں غیر ممالک کا انتخاب کریں تو پھر عام پاکستانی ٹیکس کیوں دے اور بیرون ملک سے کوئی سرمایہ دار پاکستان کیونکر آئے گا۔ صدر زرداری بیرونی سرمایہ کاری کے لئے اکثر بیانات دیتے رہتے ہیں اور میاں نواز شریف امریکی اور بیرونی قرضوں کے خلاف قوم کو اٹھ کھڑا ہونے کا درس دے رہے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں لیڈر اور دوسرے سیاستدان اپنا سرمایہ پاکستان کے اندر لائیں گے۔ کیا وہ اپنے بچوں سے کہیں گے کہ

ملک کے اندر سرمایہ کاری کریں اور اپنی حیثیت کے مطابق پاکستان کو ٹیکس دیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو عام پاکستانی اور ٹیکس دہندگان کیا یہ سوچنے پر برحق بجانب ہوں گے کہ وہ کیوں ٹیکس ادا کریں اور یہاں کاروبار کے لئے سرمایہ کاری کریں۔ اگر پاکستان کی فضا ایک عام کاروباری اور سرمایہ کار کے لئے مناسب نہیں تو یہ سیاستدان اور حکمران اس کو بہتر بنانے میں کیسے مخلص ہو سکتے ہیں۔ جب وہ اپنے سرمائے اور کاروبار کیلئے دوسرے ممالک کو محفوظ سمجھتے ہوں۔ یہاں تو ہمارا ماضی اور حال ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارے حکمران اور سیاستدان غریب عوام کے خون پسینے کی کمائی سے دیے گئے ٹیکسوں کو نہ صرف بیرونی دوروں اور اپنی عیاشیوں پر خرچ کرتے ہیں بلکہ قوم کی دولت سے اربوں کروڑوں کی لوٹ کھسوٹ میں کھلے عام اور بغیر کسی ڈر وخوف کے ملوث ہوتے ہیں۔ ہم عوام کے ساتھ جینے مرنے کا قصد کرنے والے سیاستدانوں کو اپنے قول وفعل کا تضاد ختم کرنا ہوگا اور ان کو پاکستان کو اپنا پاکستان سمجھنا ہوگا۔ خدارا ہمیں محض نعرے مت دو۔

اس مرحلے پر ہماری خصوصاً میاں صاحب سے، چوہدری صاحبان سے، زرداری صاحب سے عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ غیر ممالک میں موجود اپنے سرمائے کا کم از کم نصف پاکستان لے آئیں۔ انشاء اللہ یہ ملک قائم ودائم رہے گا اور آپ کی بادشاہتیں بھی وقفے وقفے سے چلتی رہیں گی۔

(دسمبر 2009ء)

القاعدہ نہیں، سونے کے ذخائر

چندروز قبل امریکی اخبار ''واشنگٹن پوسٹ'' نے اپنے نمائندے کے حوالے سے ایک رپورٹ شائع کی ہے کہ طالبان نے بلوچستان میں ملا عمر کی سربراہی میں ''طالبان کوئٹہ شوریٰ'' بنالی ہے جو افغانستان میں ہونے والی دہشت گردی کی حالیہ تمام کارروائیوں کی منصوبہ ساز اور خالق ہے۔ جس کی وجہ سے امریکی حکام بلوچستان پر ڈرون حملوں کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔ مذکورہ اخبار نے واضح طور پر لکھا کہ امریکہ بلوچستان کو اپنا ٹارگٹ بنا سکتا ہے، اس کے بعد ملک بھر میں بلوچستان پر ڈرون حملوں کے امکانات کے حوالے سے اخبارات میں بیان بازی اور مکالموں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے جب مغربی ذرائع ابلاغ نے ملا عمر کی کوئٹہ یا بلوچستان میں موجودگی پر مبنی خبریں شائع کی ہوں، تاہم ماضی میں امریکی حکومت نے اس طرح کے پروپیگنڈے پر کبھی کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن اب امریکی حکام کی طرف سے آنے والے بیانات صورت حال کی سنگینی کا پتہ دیتے ہیں۔ جن میں یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ ''طالبان اور القاعدہ نے بلوچستان میں محفوظ پناہ گاہیں بنالی ہیں جن کے خلاف کارروائی کے لئے سنجیدگی سے غور کیا جارہا

ہے"، جس تنظیم کو کوئٹہ شوریٰ کا نام دیا گیا ہے، اس نے اپنے لئے نام "تحریک طالبان بلوچستان" اختیار کیا تھا، یہ نام نہاد تنظیم اس وقت سامنے آئی جب 4 مارچ 2009ء کو کسی گمنام آدمی نے "انجینئر اسد" کے نام سے بلوچستان میں طالبان تحریک کی موجودگی اور اس کے منصوبوں کا انکشاف کیا۔ مغربی ذرائع ابلاغ نے اسے خوب اچھالا، 14 مارچ کو امریکہ کے وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے پریس کانفرنس کے دوران بلوچستان میں طالبان تحریک سے متعلق سوال کے جواب میں کہا:

"WELL, I THINK WE ALL HAVE A CONCERN ABOUT THE (QUETTA SHURA) AND THE ACTIVITIES OF THE TALIBAN IN THAT AREA, BUT I THINK THIS IS PRINCIPALLY A PROBLEM AND A CHALLENGE FOR THE PAKISTANIS TO TAKE ON. AND AS WE HAVE INDICATEC, WE ARE PREPARED TO DO ANYTHING TO HELP THEM"

اس پریس کانفرنس کے ذریعے دو چیزیں سامنے آئیں۔ ایک تو یہ کہ بلوچستان میں جو بھی کارروائی ہوگی پاکستان خود کرے گا۔ یعنی امریکہ نے بلوچستان پر از خود حملوں سے واضح طور پر انکار کر دیا، دوسرا رابرٹ گیٹس نے "تحریک طالبان بلوچستان" کو "کوئٹہ (بلوچستان) شوریٰ" کہہ کر پکارا، ایسا اتفاقاً ہو گیا یا خاص مقصد کے لئے کیا گیا تھا۔ تاہم بلوچستان کے طالبان کی فرمانبرداری دیکھئے۔ انہوں نے اپنے لئے یہی نام پسند کر لیا۔ خیر رابرٹ گیٹس کی پریس کانفرنس کے جواب میں "نیویارک ٹائمز" نے تین روز بعد 17 مارچ کو شہ سرخی کے ساتھ تفصیلی خبر شائع کی کہ امریکہ ڈرون حملوں کو بلوچستان تک وسعت دینے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ اگر یہ خبر پاکستانی عوام و حکومت کا ردعمل جاننے کے لئے لگائی گئی تو پھر یقیناً پاکستانی عوام کا اجتماعی ردعمل

انتہائی شدید تھا۔ (اب اس طرح کا ردعمل دکھائی نہیں دے رہا جو کہ خطرناک اور پوری قوم کے لئے لمحہ فکریہ ہے) حکومت بشمول اپوزیشن نے نیویارک ٹائمز کی خبر کو پاکستان میں طویل عرصے کے بعد آنے والی جمہوریت کے خلاف گہری سازش قرار دے دیا۔ علاوہ ازیں بلوچستان کی صوبائی اسمبلی نے قرارداد منظور کر دی کہ اگر کوئی ڈرون طیارہ بلوچستان میں داخل ہوا اسے گرا دیا جائے گا۔ بہرحال امریکی وزارت خارجہ نے نیویارک ٹائمز کی خبر کو اخبار کی اختراع قرار دیتے ہوئے واضح کیا کہ امریکہ بلوچستان میں ڈرون بھیجنے کا ارادہ نہیں رکھتا اور بلوچستان اسمبلی کے تحفظات دور کرنے کے لئے اسلام آباد میں تعینات خاتون امریکی سفیر ANNE PATTERSON فوری طور پر کوئٹہ پہنچی۔ وہاں اس نے بلوچستان کے وزیر اعلیٰ نواب اسلم رئیسانی سے ملاقات کی۔ بعد ازاں امریکی سفارت خانے سے ایک ہینڈ آؤٹ جاری کیا گیا کہ

"مذکورہ ملاقات UNHCO کے کوئٹہ میں نمائندے جان سولیکی کی رہائی کے حوالے سے تھی اور اس ملاقات کا "طالبان قیادت" کی بلوچستان میں موجودگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

یہاں جان سولیکی کے کوئٹہ سے اغوا کا ذکر کرتا چلوں جس کی 2 فروری 2009ء کو دن دیہاڑے اغوا سے لے کر 65 دن بعد رہائی تک کی پراسرار کہانی کسی بھی طرح داستان طلسم ہوشربا سے کم نہیں۔ اندازہ لگایئے پروپیگنڈہ طالبان کے امیر ملا عمر کی کوئٹہ میں موجودگی اور کوئٹہ شوریٰ کا تھا۔ لیکن امریکی شہریت رکھنے والے کٹر یہودی جان سولیکی کا اغوا علیحدگی پسند بلوچوں کے حصہ میں آیا۔ جو اس کے بدلے 41 بلوچ خواتین کی رہائی کا مطالبہ کرتے رہے اور اس مضحکہ خیز مطالبے کو پورا نہ ہونے پر یرغمالی کو قتل کی دھمکیاں دی جاتی رہیں اور مدت مطالبہ میں اضافہ بھی جاری رہا۔

آخر کار دو ماہ پانچ دن بعد جان سولیکی کی رہائی عمل میں آئی تو اس کی صحت دیکھ کر خود مغربی دانشور و تبصرہ نگار کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "لگتا ہے جان سولیکی بھی رخصت پر تھا"

واپس آتے ہیں موجودہ صورت حال کی طرف، کیا واقعی بلوچستان میں طالبان یا کوئٹہ شوریٰ نامی کوئی تنظیم موجود ہے یا یہ سب کچھ فریب، جھوٹ اور ڈھکوسلے پر مبنی ہے؟ اور کیا واقعی امریکہ بلوچستان میں ڈرون حملوں کی تیاری کر رہا ہے؟ اس حوالے سے ''ایشیا ٹائمز'' نے اپنی رپورٹ میں دعویٰ کیا ہے کہ مسئلہ بلوچستان میں القاعدہ قیادت یا طالبان کی موجودگی کا نہیں بلکہ سارا معاملہ امریکی معیشت کی بحالی کا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ امریکی معیشت کا دارومدار جدید ٹیکنالوجی کی حامل عسکری صنعت اور اسلحہ سازی پر ہے۔ جس کے ساتھ دیگر بہت سے کاروبار وابستہ ہیں۔ ایک طرف عالمی کساد بازاری اوپر سے عراق میں جنگ بندی کے بعد امریکی فوج کے انخلاء نے امریکہ کی دفاعی پیداواری صنعت کو مزید پستی میں دھکیل دیا ہے۔ جس کے بعد اوبامہ انتظامیہ دباؤ میں ہے کہ وہ گرتی ہوئی دفاعی صنعت کو سہارا دے اور جنگ کے لئے نیا میدان تلاش کرے۔ ورنہ جنگ و جدل سے منسلک لاکھوں امریکیوں کی نہ صرف روزی بند ہو جائے گی ساتھ ہی جدید ٹیکنالوجی پر پیش رفت کو بھی دھچکا لگے گا۔ ''ایشیا ٹائمز'' کے مطابق پینٹا گون نے دو سال قبل ''سان ڈیاگو'' میں واقعہ بغیر پائلٹ طیارے بنانے والے ادارے ''جنرل اٹامک کمپنی'' کو ایسے ڈرون بنانے کا آرڈر دیا تھا جو زیادہ طویل عرصے تک فضا میں پرواز کر سکے۔ اس میں نصب کیمروں کی پکچر کوالٹی پہلے سے بہتر ہو اور یہ ڈرون طیارے زیادہ تعداد اور وزن کے بم و میزائل اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، ایک طرف تو اس پروجیکٹ کو منافع بخش سمجھتے ہوئے بڑے امریکی کنسورشیم نے اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کر دی، دوسری طرف عراق سے فوجی انخلاء کے بعد وہاں ڈرون طیاروں کی پروازوں کا سلسلہ جو کہ 16 سے 20 گھنٹے یومیہ پر محیط تھا وہ بند ہوا تو ساتھ ہی امریکہ میں بیٹھ کر سیٹلائٹ کے ذریعے پروازوں کو کنٹرول کرنے کا دورانیہ بھی نصف ہو گیا۔ اسی طرح قبل ازیں عراق و افغانستان علاوہ ازیں پاکستان میں پروازوں کے دوران ہر ماہ 16 ہزار گھنٹوں کی ویڈیو فلم تیار کی جاتی تھی۔ تاہم عراق سے فوجوں کی واپسی کا عمل شروع ہوتے ہی پینٹا گون نے

ڈرون طیاروں کی خریداری کے نئے آرڈر گھٹا کر آدھے کر دیئے۔ جس پر کنسورشیم سے منسلک امریکی سرمایہ کاروں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا اور ساتھ ہی تجویز پیش کر دی کہ پاکستان میں ڈرون آپریشنز بڑھائے جائیں۔ امریکی بااثر سرمایہ کاروں کے دباؤ میں آ کر امریکی کانگریس کی دفاعی کمیٹی نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا کہ پاکستان میں ڈرون حملوں کا دائرہ بڑھایا جائے۔ ''ایشیا ٹائمز'' کے مطابق اگر صدر اوبامہ بلوچستان میں ڈرون حملوں کا اجازت نامہ جاری کر دے تو اس طرح ایک تو ڈرون طیاروں سے منسلک صنعت کو سہارا مل جائے گا، دوسرا امریکہ کو جدید ٹیکنالوجی کی آزمائش کا موقع ملے گا۔ کیونکہ بلوچستان میں مسافت زیادہ ہونے کی وجہ سے طیاروں کی پرواز کا دورانیہ بڑھ جائے گا اور صوبہ سرحد میں مٹی کے اینٹوں سے تیار شدہ گھروں کی نسبت کوئٹہ میں ان طیاروں کو پختہ گھروں اور سنگلاخ چٹانوں کا سامنا ہو گا۔ جن کے لئے زیادہ وزن اور طاقت کے بم یا گائیڈڈ میزائل اٹھانے والے ڈرون درکار ہوں گے۔ بہرحال مندرجہ بالا نقطہ نظر ''ایشیا ٹائمز'' کا ہے، تاہم بعض عالمی مبصرین امریکہ کی بلوچستان میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کا اصل سبب گوادر کی بندرگاہ اور ضلع دالبندین ونوشکی (چاغی) میں پائے جانے والے سونے کے ذخائر کو قرار دیتے ہیں۔

قارئین کو یاد ہو گا صوبہ بلوچستان میں غربت و پسماندگی کے نام پر حالیہ شورش کی ابتدا 2002ء میں اس وقت ہوئی۔ جب ایک معاہدے کے تحت چین نے گوادر کے ساحل پر بندرگاہ کی تعمیر کا آغاز کیا، کیونکہ قدرتی گہرے سمندر کے ساحل پر بندرگاہ کی تعمیر ہمارے کسی ہمسائے کو قبول نہیں تھی۔ جبکہ بہت سے ملکوں کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھنے والے گوادر کے ساحلوں تک پہنچنے کی کوشش میں سوویت یونین جیسا طاقتور ملک خواب کی طرح بکھر گیا۔ گوادر بندرگاہ کی تعمیر پر بھارت سب سے زیادہ ناخوش تھا۔ بھارتی ایماء پر چند قوم پرست سرداروں نے مخالفت کا وہ انداز اور موقف اپنایا جو کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے خلاف چند معروف وڈیروں نے اختیار کیا تھا اور آخرکار

پاکستانی زراعت و معیشت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت رکھنے والے اس اہم منصوبے کو سرد خانے ڈلوانے میں کامیاب ہو گئے۔ جبکہ تمام تر مخالفتوں، رکاوٹوں کے باوجود بندرگاہ کی تعمیر متعین کردہ مدت سے بھی پہلے مکمل ہو گئی۔ گو اس کے لئے چین کو اپنے بہت سے شہریوں و انجینئروں کی جانوں کی قربانی دینی پڑی۔ بھارت کی طرف سے ہمسایوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا یہ عالم ہے کہ 28 مئی 2008ء کو بھارتی لوک سبھا (پارلیمنٹ) سے طویل بحث مباحثے کے بعد ایک قرارداد منظور کرائی گئی جس میں گوادر بندرگاہ کو بھارتی سلامتی کے لئے خطرناک قرار دیتے ہوئے اس کے تدارک کا فیصلہ کیا گیا۔

یہ تدارک مختلف طرح کے حملوں کی صورت میں تھا۔ مثلاً بلوچستان میں مسلح مداخلت آباد کاروں کا قتل، علیحدگی پسندوں کی طرف سے اہم سرکاری و دفاعی تنصیبات پر حملے، صوبہ سرحد قبائلی علاقوں میں دہشت گردوں کی عسکری و مالی امداد اور پاکستان کے طول و عرض میں دھماکوں، خودکش حملوں کو فروغ دیا گیا، بھارتی سازشیں اپنی جگہ، امریکہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ چین کی معاشی و دفاعی ''لائف لائن'' گوادر تک دراز ہو جائے۔

اب آیئے سونے کے ذخائر کی طرف، بلوچستان میں ایکوڈیک ضلع چاغی کا پسماندہ ترین علاقہ ہے۔ ایک سروے کے مطابق دنیا کے دوسرے بڑے ذخائر پاکستان کے ان دور دراز اور پسماندہ ترین علاقوں میں موجود ہیں جہاں سے سونا نکالنے کا کام 2006ء سے جاری ہے۔ سونا نکالنے کا ٹھیکہ ابتدا میں کینیڈا کی کمپنی ''بیرک گولڈ'' کو دیا گیا تھا، جس نے کچھ عرصہ بعد ''ایکوڈیک پروجیکٹ'' کے نام سے سونے کی کانیں آسٹریلیا کی کمپنی ''ٹیتھیان کاپر'' اور چلی کی کمپنی ''انٹوفیگسٹا'' کو بیچ دیں (یہودی مالکان کی یہ دونوں کمپنیاں امریکہ میں رجسٹرڈ ہیں) جبکہ اکثریتی ''شیئرز'' یا مالکانہ حقوق ''بیرک گولڈ'' کمپنی کے سربراہ ''جارج والیکسی'' نے اپنے پاس رکھے۔ دنیا کے سامنے بلوچستان میں سونے و تانبے کی موجودگی کا انکشاف اس وقت ہوا۔ جب 11 مئی

2006ء کو امریکی اخبار ''واشنگٹن پوسٹ'' نے ''بیرک گولڈ'' کمپنی کے سربراہ ''جارج والیکسی'' کی پریس کانفرنس شائع کی۔ جارج نے میڈیا کو بتایا کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے سونے اور تانبے کے ذخائر پاکستان میں موجود ہیں جن کا ایک حصہ بیرک گولڈ نے خرید لیا ہے۔ اس کے باوجود کہ پاکستان کے ان علاقوں کو القاعدہ و طالبان کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔

بعد ازاں منظر عام پر آنے والی رپورٹس کے مطابق یہودیوں کی ایکوڈیک میں آمد کے ساتھ ہی ان کے مقامی بلوچ آبادی سے جھگڑے شروع ہو گئے۔ جھگڑے کی وجہ یہ تھی کہ بیرک گولڈ کے امریکی مالکوں نے پروجیکٹ پر کام کرنے والے مقامی افراد کو فارغ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جھگڑا بڑھا تو ان آبادیوں کو القاعدہ و طالبان کی پناہ گاہیں قرار دے دیا گیا۔ اس پر بھی چاغی کے غریب لوگ اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوئے تو پروجیکٹ پر کام کرنے والے امریکیوں نے اپنی سکیورٹی کے لئے ''بلیک واٹر'' (XE) سے معاہدہ کر لیا۔ جس کے فوراً بعد بلیک واٹر کے مسلح دستوں نے ایکوڈیک پہنچ کر سونا نکالنے کے پروجیکٹ کو اپنے حصار میں لے لیا۔ یہ بلیک واٹر سکیورٹی کے مسلح افراد کی پاکستان میں براہ راست پہلی آمد تھی۔ ان مسلح افراد نے پروجیکٹ کے گرد خاردار تاریں بچھا کر اس کے اندر ''ہیلی پیڈ'' اور چھوٹے طیاروں کی ''لینڈنگ'' اور ''ٹیک آف'' کے لئے ''موبائل رن وے'' بھی تعمیر کر لیا (کیا بلیک واٹر سکیورٹی کے مسلح افراد یا سونے کی کانوں پر کام کرنے والے دیگر غیر ملکی حکومت پاکستان کی اجازت سے آتے جاتے ہیں یا قریب ہی واقع سرحد سے پار افغانستان میں موجود فوجی اڈوں سے براہ راست ان کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس کا علم ہماری وزارت داخلہ و خارجہ کو ہو گا یا پھر بلوچستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی اس کے بارے میں بہتر جانتی ہو گی۔ جس نے غیر ملکی کمپنیوں کو سونا نکالنے کی اجازت دی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ بلوچستان دوہرے مسائل کا شکار ہو چکا ہے۔ جبکہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ دونوں مسائل خود ساختہ اور ان کے

پیچھے بیرونی سازشیں کارفرما ہیں۔ پہلا مسئلہ بلوچ عوام کی پسماندگی اور معاشی محرومیوں کا ہے جن سے کسی صورت انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ بلوچستان کے جتنے بڑے قبائل ہیں ان کے سردار یا مقتدر افراد 1947ء سے ہی اقتدار کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ خوشحالی ان کے گھر کی لونڈی ہے تو خوش قسمتی پیدا ہوتے ہی روح کی طرح ان میں تحلیل ہوجاتی ہے۔ صحت ہو یا تعلیم ہو یا دیگر سہولتیں یہ ہمہ وقت ان کے در پر حاضر رہتی ہے۔ ان کے برعکس غریب کا مقدر اس کے پیدا ہوتے ہی پھوٹ جاتا ہے۔ بیماری، جہالت، لاچاری، افلاس و پسماندگی نسل در نسل ان کا پیچھا کرتی ہے۔ صرف بلوچستان ہی کیوں دیگر صوبوں کا بھی یہی عالم ہے جہاں کا حکمران طبقہ خود تو بیرون ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے ڈگریاں حاصل کرتا ہے اور اپنے دائرہ اختیار میں آباد غریبوں کو عام انسانی ضروریات کی سہولتیں دینے کو بھی تیار نہیں ہوتا اور چاہتا ہے کہ غریب کولہو کے بیل کی طرح اس تک پہنچنے نہ پائے، بہرحال یہ سلسلہ شاید اس طرح چلتا رہے گا۔ بلوچستان میں ہر بار اٹھنے والی تشدد کی لہر کو غریب بلوچ عوام کی طرف سے محرومیوں کا ردعمل قرار دے کر بڑے بڑے سردار، اقتدار کے ایوانوں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ رہ گئی کوئٹہ شوریٰ یا بلوچستان میں القاعدہ و طالبان قیادت کی موجودگی کا حالیہ شور تو یہ پاکستان کو کیری لوگر بل پر راضی کرنے اور بلیک واٹر (XE) کی موجودگی کو برداشت کرانے کے لئے دباؤ کا ہتھکنڈہ ہے۔ امریکہ جو خود افغانستان میں اپنی تمام تر جدید جنگی مشینری اور نیٹو افواج کی معاونت کے باوجود شکست سے دوچار ہے، ساتھ ہی تسلیم کرتا ہے کہ افغانستان کا ستر فیصد علاقہ طالبان کے قبضے و کنٹرول میں ہے تو پھر طالبان یا القاعدہ قیادت کو بھی وہیں افغانستان میں موجود ہونا چاہیے۔ ہمیں عالمی رائے عامہ کو بتانا ہوگا کہ اگر سوویت یونین کے خلاف جنگ کے دوران طالبان کو افغانستان سے باہر نکل کر روپوش ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ جس کی تین لاکھ فوج برسرِ پیکار تھی اور وہ خطے کو اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے جبکہ پورا افغانستان ان کی دسترس میں تھا۔ وہ طالبان سات سمندر پار سے

آئے امریکیوں کے ڈر سے (جن کی نہ تو تعداد روسی فوج کے برابر ہے نہ ہی وہ افغانستان کے پہاڑی پیچ و خم سے واقف ہیں) کیوں مفرور ہوں گے۔ ہمیں خطے میں بڑھتی ہوئی امریکی مداخلت کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے، لیکن اس کے لئے امداد کے نام پر ملنے والی امریکی بھیک کو غیرت مند قوم کی طرح مسترد کرنا ہوگا۔

(دسمبر 2009ء)

30ارب کے نئے ٹیکس

ملک میں بجلی، گیس اور پانی کے بحرانوں کے بعد اب کھانے پینے کی اشیاء کے بحرانوں نے بھی جنم لینا شروع کر دیا ہے۔ گزشتہ کئی ماہ سے چینی کی قیمتوں میں اضافے کے بعد عوام نے احتجاج شروع کیا تھا۔ میڈیا میں آنے کے بعد سپریم کورٹ آف پاکستان نے معاملے کا نوٹس لیتے ہوئے ملک بھر میں چینی 40 روپے کلو فروخت کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔ بعدازاں مل مالکان اور حکومت کے مابین معاہدہ بھی ہوا جو سپریم کورٹ میں پیش کیا گیا۔ معاہدے میں کہا گیا تھا کہ حکومت اور مل مالکان مل کر چینی کی 40 روپے کلو فروخت کو یقینی بنائیں گے۔ پھر صوبائی حکومتوں نے باقاعدہ نوٹیفکیشن بھی جاری کر دیا، مگر چینی 40 روپے کلو تو کیا فروخت ہوتی، مارکیٹ سے غائب ہی ہو گئی جبکہ اس سے قبل مارکیٹ میں چینی 48 تا 55 روپے عام دستیاب تھی اور اب اگر کہیں ملتی بھی ہے تو 80 تا 100 روپے کلو ملتی ہے۔ بعض علاقوں میں تو چینی سرے سے ہے ہی نہیں۔ ان حالات میں وفاقی حکومت نے 10 لاکھ ٹن چینی درآمد کرنے کا اعلان کیا ہے جبکہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے حکم سے پہلے صوبہ سندھ کی 31 شوگر ملوں نے 09-2008ء میں 9 لاکھ 82 ہزار میٹرک ٹن چینی تیار کی تھی اور کچھ دن قبل تک شوگر ملوں کے پاس 32 ہزار 166

میٹرک ٹن چینی موجود تھی مگر سپریم کورٹ کا فیصلہ آنے کے بعد اچانک غائب ہو گئی اور بدترین بحران پیدا ہو گیا، جو اب تک جاری ہے۔ قبل ازیں مشرف دور میں بھی چینی کا بحران پیدا ہو گیا تھا اور اس وقت بھی چینی کی صنعت پر سیاستدانوں کی اجارہ داری واضح ہو گئی تھی اور وزراء اور پارلیمان کے ارکان نے شوگر ملوں کے مالک ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چینی کی قیمتیں بڑھانے کے لیے چینی کا ذخیرہ شروع کیا تھا، پھر معلوم ہوا کہ چینی کے بحران میں سیاستدان ملوث ہیں اور واقعی ان مل مالکان کو حکومت نے تحفظ فراہم کیا تھا کیونکہ جب نیب نے چینی بحران کی تحقیقات شروع کیں تو حکومت نے تحقیقات رکوا دیں۔ اب اس حکومت میں شامل کئی وزراء اور ارکان پارلیمان کی بھی شوگر ملیں ہیں تو کیا اب بھی چینی کے جاری بحران کے پسِ پشت مل مالکان اور حکومت کے کارندوں کا ہی ہاتھ ہے۔ اس سوال کا جواب اس حقیقت سے مل سکتا ہے کہ شوگر مل مالکان کا کہنا ہے کہ ہم نے چینی کا ذخیرہ نہیں کیا اور ڈیلروں کو 35 روپے کلو کے حساب سے چینی دے رہے ہیں۔ دوسری طرف ڈیلروں کا کہنا ہے کہ وہ دکانداروں کو 39 روپے فی کلو چینی فروخت کر رہے ہیں مگر دکاندار من مانے داموں فروخت کر رہے ہیں جبکہ دکانداروں کا کہنا ہے کہ ڈیلر چینی 55 روپے سے 60 روپے تک دے رہے ہیں۔ اس لیے ہم 75 روپے سے 80 روپے فروخت کر رہے ہیں۔ معاملے کا ایک اور رخ دیکھیں تو حکومت دکانداروں کو تو دور کی بات یوٹیلٹی سٹوروں پر چینی کی فراہمی میں ناکام ہو چکی ہے۔ جن یوٹیلٹی سٹوروں پر چینی تھوڑی بہت دستیاب ہے وہاں بھی یا تو دکانداروں کو فروخت کی جاتی ہے یا پھر صبح سے شام تک لوگ لمبی قطاروں میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور پھر جب ان کی باری آتی ہے تو یوٹیلٹی سٹور والے کہہ دیتے ہیں کہ چینی ختم ہو گئی پھر لوگ احتجاج پر مجبور ہو جاتے ہیں جس پر انہیں پولیس کی لاٹھیاں بھی کھانی پڑ رہی ہیں۔

وزیر اعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ کے آبائی ضلع خیر پور میں بھی چینی کا بحران موجود ہے۔ چینی کی

قیمت تھوک اور خوردہ فی کلو 65 سے 80 روپے مقرر کی گئی ہے مگر وہ ان قیمتوں پر دستیاب نہیں۔ متعدد علاقوں میں تو چینی سرے سے غائب ہے جبکہ ناجائز منافع خور ذخیرہ اندوزی میں مصروف ہیں۔

روز نامہ ''اسلام'' کے ایک سروے کے مطابق خیر پور میں دکانوں پر چینی 65 روپے سے 80 روپے فی کلو فروخت ہو رہی ہے جبکہ کئی علاقوں میں 90 روپے فی کلو بھی وصول کر رہے ہیں جبکہ دکانداروں کے پاس کوئی بھی سرکاری ریٹ لسٹ یا پرائز کنٹرول کمیٹی کا جاری کردہ کوئی لیٹر نہیں ہے۔ دوسری طرف چینی کی قیمتوں میں اضافے کے بعد چائے کی قیمتیں بھی آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں۔ ہوٹلوں پر چائے کا فی کپ 15 روپے سے 20 روپے کا ہو گیا ہے جبکہ گڑ کے استعمال میں اضافے کے ساتھ ہی ان کی قیمتیں بھی بڑھ گئی ہیں۔ کیک، بسکٹ و دیگر میٹھی چیزوں کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ اس وقت خیر پور میں عمدہ گڑ 65 روپے فی کلو اور ادنیٰ 55 روپے کلو کی فروخت جاری ہے۔ جس سے شہری سخت پریشان ہیں۔ خیر پور ضلع کے دوسرے متعلقہ ہیڈ کوارٹروں اور چھوٹے بڑے شہروں، گمبٹ، کنگری، کوٹ ڈی جی، کنب، رانی پور، ٹنڈو مستی، پریالو، ببرلو، چونڈکو، فیض گنج، پکا چانگ، سیٹھارجہ، ہنگورجہ، ٹالپر وڈا، یوز دار وڈا، راھوجا، کوٹ میر محمد، کھبڑا، اگڑا، سوبھو ڈیرو و دیگر کتنے ہی علاقوں میں چینی عوام کی پہنچ سے باہر ہو گئی ہے۔ اکثر 80 یا 90 روپے کلو فروخت ہو رہی ہے اور حیرت اور تشویش کی بات یہ ہے کہ حکومت اور ضلع انتظامیہ اس صورت حال پر بالکل خاموش ہیں اور خیر پور کے عوام یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگانے والوں نے عوام کو بھوک، بدحالی، گیس، بجلی، پانی، چینی اور آٹے کے بحرانوں کے علاوہ کچھ نہیں دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس وقت عوام کو روڈ رستے نہیں، کھانے کے لیے دو وقت کی روٹی چاہیے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اقتدار سے قبل عوام سے شہید بے نظیر بھٹو کے نام پر ووٹ لینے والے سیاستدانوں نے عوام کو بھلا دیا ہے اور اب صرف اپنی کرسی بچانے کے

چکر میں لگے ہوئے ہیں۔ خیر پور کے سماجی، مذہبی و دیگر لوگوں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے منشور پر عمل پیرا ہو کر عوام کی خدمت کریں تاکہ عوام میں جو محترمہ کے لیے جذبات تھے۔ وہ ان حکمرانوں کے لیے بھی پیدا ہوں ورنہ آئندہ پاکستان پیپلز پارٹی کا نام بھی ڈھونڈنے سے کہیں نہ ملے گا۔

کسی بھی ترقی پذیر ملک کے لئے سب سے آسان کام عالمی مالیاتی اداروں سے اپنے قومی تشخص کو گروی رکھ کر اس سے قرض لینا ہوتا ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے ادارے تو ہر وقت اس تاک میں رہتے ہیں کہ کس وقت ہم جیسا ملک ان سے قرض کے لئے رجوع کرے اور پھر وہ ہمیں اپنے چنگل میں پھنسائیں۔ بیروزگاری، بھوک، افلاس اور مہنگائی سے تنگ پاکستانی عوام ان غیر ملکی آقاؤں کے نہ صرف شکنجے میں ہیں بلکہ اب تو ان کا مستقبل بھی ان کے رحم و کرم پر ہی ہے۔ ویسے بھی اس صورتحال میں جہاں ہر روز خودکش حملے ہوتے ہوں، روزانہ بم دھماکوں کی آوازیں سنی جاتی ہوں، وہاں سترہ کروڑ عوام صرف صبر کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں؟ اب ان صبر کے مارے عوام کے لئے بجلی اور پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں اضافے کی نوید کے بعد نئی خبر یہ ہے کہ ان کو رواں مالی سال میں پچیس سے تیس ارب روپے مالیت کے اضافی ٹیکس بھی ادا کرنے ہوں گے اور یہ فیصلہ چونکہ غیر ملکی آقاؤں کا ہے۔ اس لئے اب اس کے ٹلنے کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔

جب کوئی حکومت بجٹ میں اپنے میزانیے پیش کر چکی ہو اور اس کے بعد دوبارہ اس پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس میں رد و بدل کرے، بالخصوص ٹیکس کے اہداف بڑھائے جائیں تو اس کو عوامی زبان میں منی بجٹ کہا جاتا ہے۔ ویسے تو ہم جہاں رہتے ہیں وہاں ہر روز ہی منی بجٹ آتا ہے۔ کبھی پٹرولیم مصنوعات میں اضافے کی صورت میں اور کبھی گیس و بجلی کے نرخ میں اضافے کی صورت میں یا پھر کبھی روزمرہ اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں یکدم اضافے کی صورت میں۔ کبھی

کبھی تو یہ بن بلائے مہمان کی صورت میں بھی سامنے آ جاتا ہے۔ جیسے گزشتہ دنوں چیئر مین ایف بی آر جو اس وقت آئی ایم ایف سے مذاکرات کرنے دبئی گئے ہوئے ہیں، نے اپنے ادارے کی کارکردگی کا اعتراف کرتے ہوئے رواں مالی سال میں پچیس سے تیس ارب روپے کے نئے ٹیکس لگانے کا اعلان کیا ہے۔ جس کی وجہ انہوں نے رواں مالی سال کے پہلے چھ ماہ میں 690 ارب روپے کے ٹیکسوں کے ہدف کا حاصل نہ ہونا بتائی ہے۔ وفاقی حکومت کی جانب سے لگائے جانے والے ان نئے ٹیکسز کا جواز اس بات کو بنایا جا رہا ہے کہ جب فوجی آپریشن شروع کیا گیا تھا تو بجٹ میں اس پر ہونے والے اخراجات کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے رواں مالی سال کے چھ ماہ کے ٹیکس اہداف وصول نہ ہونے کے امکانات ہیں۔ یہ نوید سنانے کے بعد ایف بی آر کے چیئر مین غیر ملکی آقاؤں سے بات کرنے کے لئے دبئی روانہ ہو گئے۔ جس میں یکم جنوری 2010ء سے وفاقی سطح پر لگائے جانے والے ویلیو ایڈیڈ ٹیکس کے نفاذ پر بات چیت کی جائے گی۔ یہ ویلیو ایڈیڈ ٹیکس بھی رواں سال پیش کئے گئے بجٹ کے میزانیے میں شامل نہیں تھا مگر کیا اس سے حاصل ہونے والی اربوں روپے کی رقم ایف بی آر عوامی فلاح و بہبود پر خرچ کرے گا یا پھر یہ ہمارے حکمرانوں کی شاہ خرچیوں کی نذر ہو جائے گا؟ اگر ایف بی آر کے چیئر مین ان نئے ٹیکسز کی نوید سنانے کے بجائے کھربوں روپے کی اس ٹیکس چوری کو روک سکتے جو ہمارے قومی تشخص کو بھی متاثر کر رہی ہے، تو بہتر تھا۔ ایف بی آر کے اعداد و شمار کے مطابق سترہ کروڑ آبادی کے اس ملک میں صرف بائیس لاکھ افراد ایسے ہیں جو نیشنل ٹیکس نمبر رکھتے ہیں اور ان بائیس لاکھ افراد میں سے بھی پچاس فیصد سے زائد تعداد سروس سیکٹر سے وابستہ افراد کی ہے۔ ان بائیس لاکھ افراد میں سے بھی دس لاکھ افراد ایسے ہیں جو کئی سالوں سے اپنے سالانہ گوشوارے بھی جمع نہیں کرا رہے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے تو یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ تمام ٹیکسوں کا بوجھ غریب عوام پر ہی ہے کیونکہ وہ پینے کے پانی کے علاوہ بچے کیلئے خریدی جانے والی کتاب اور پنسل پر بھی جی ایس ٹی کی ادائیگی کرتے ہیں۔

ظلم تو یہ ہے کہ ان بڑی بڑی مچھلیوں کو ٹیکس نیٹ میں لانے کے بجائے براہ راست ان ہی افراد کو نشانہ بنایا جا رہا ہے جو پہلے ہی ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ امیر طبقے کے اثاثے وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتے جا رہے ہیں مگر ان کی جانب سے ٹیکس کی ادائیگی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان میں سب سے زیادہ ٹیکس چوری سیلز ٹیکس ریفنڈ اور درآمدی اشیاء کی ویلیوایشن میں ہوتی ہے۔ جس سے قومی خزانے کو سالانہ کھربوں روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ اس کی روک تھام کیلئے مؤثر پلان کی ضرورت ہے۔ ٹیکس ماہرین کے مطابق اگر ایف بی آر صرف ٹیکس چوری پر قابو پالے تو حکومت کو آئندہ دس سال تک نئے ٹیکس لگانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی مگر ٹیکس چوری میں براہ راست ٹیکس افسران بھی ملوث ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کی روک تھام ناممکن دکھائی دیتی ہے۔ اب تو حال یہ ہے کہ ایف بی آر میں جو چند ایماندار افسران بچے ہوئے تھے۔ وہ بھی اپنی جان بخشی کر کے دیگر محکموں میں ڈیپوٹیشن پر چلے گئے ہیں کیونکہ جہاں میرٹ کو نظر انداز کیا جا رہا ہو اور تمام فیصلے غیر ملکی آقاؤں کو ہی کرنا ہوں وہاں قوم کا دکھ رکھنے والا کوئی افسر کیسے اپنے فرائض انجام دے سکتا ہے۔

عالمی مالیاتی اداروں کے دباؤ پر لگائے جانے والے تیس ارب روپے کے ان نئے ٹیکسز کا نفاذ عام آدمی کو برداشت کرنا پڑے گا جبکہ آئندہ سال 2010ء سے ویلیو ایڈیڈ ٹیکس کا نفاذ براہ راست عوام پر بجلی بن کر گرایا جائے گا کیونکہ یہ ٹیکس جی ایس ٹی طرز کی طرح کا ٹیکس ہوگا جو تمام روزمرہ اشیائے صرف پر لگے گا۔ لامحالہ اس ٹیکس کے نفاذ سے ملک میں جہاں مہنگائی کی شرح بڑھ جائے گی وہیں سیلز ٹیکس کی طرح اس میں بھی ٹیکس چوروں کو چوری کے لیے نئے راستے مل جائیں گے۔ ویلیو ایڈیڈ ٹیکس کے لیے ابھی شرح کو فائنل نہیں کیا گیا ہے تاہم توقع کی جا رہی ہے یہ ٹیکس کم از کم دس فیصد ہوگا۔ جس کے نفاذ کے بعد پاکستانی عوام کی پہلے سے جہنم زندگی میں نئے عذاب نازل ہوں گے اور وہ زندہ درگور ہو کر رہ جائیں گے۔

(جنوری 2010ء)

بینک ڈکیتی اور FIA کا کردار

11 دسمبر کو سپریم کورٹ کے ازخود نوٹس پر پنجاب بینک فراڈ کیس کی سماعت کرتے ہوئے چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس افتخار احمد چوہدری کی سربراہی میں تین رکنی بنچ نے ایف آئی اے کے ڈائریکٹر جنرل طارق کھوسہ کی وزیراعظم مخدوم سید یوسف رضا گیلانی کے حکم پر تبدیلی کا نوٹس لیتے ہوئے ریمارکس دیتے ہوئے کہا کہ ''طارق کھوسہ کو تبدیل کر کے اچھے کام کی سزا دی گئی۔ حکومت نے اچھا پیغام نہیں دیا لیکن عدالت بے یار و مددگار نہیں۔'' عدالت عالیہ نے کہا کہ کمشنر اسلام آباد کے اعتراف جرم کے باوجود اسے گرفتار نہیں کیا گیا۔

طارق کھوسہ جو بے رحمی کی حد تک ایماندار آفیسر مانے جاتے ہیں کا گناہ کیا تھا؟ صرف یہ کہ انہوں نے سٹیل مل سے پنجاب بینک تک کے لیٹروں، قوم کا خون پینے اور ہڈیاں چبانے والے مہذب اور اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز بعض جرائم پیشہ سیاستدانوں کے پروردہ ملزمان کو عدالت کے کٹہرے تک پہنچایا تھا۔ ان کی مساعی سے پنجاب بینک سے 9 ارب روپے کا فراڈ کر کے فرار ہونے والے ہمیش خان کو بالآخر امریکہ میں گرفتار کیا گیا۔ ظاہر ہے اب وہ ''عوامی ووٹوں سے منتخب عوامی جمہوری حکومت'' کے لئے ناقابل برداشت ہو رہے تھے۔ طارق کھوسہ انتہائی طاقتور

نصیت اربوں روپے کی منی لانڈرنگ، انسانی سمگلنگ، بینک فراڈ، قومی خزانے کی لوٹ کھسوٹ ر دیگر جرائم میں ملوث مجرمان اور ان کے ساتھیوں کے لاینحل مسائل پیدا کر رہے تھے۔ طارق کھوسہ اور ان کی ٹیم کچھ اعلیٰ سطح کی کریمنل تفتیش کر رہے تھے۔ جن میں ملک کے بڑے نام بھی ث ہیں جبکہ کھوسہ لائن پر آنے سے مسلسل انکاری تھے۔ ایک ذریعے کے مطابق وزیراعظم بھی گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے کھوسہ کو ہٹانے کا دباؤ ڈالتے آ رہے تھے جبکہ کھوسہ بڑی مچھلیوں کو پکڑنے کے ریب پہنچ گئے۔ ان کی تبدیلی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کا چیف ایگزیکٹو کتنا آزاد ہے۔ اعلیٰ ریعے نے دعویٰ کیا ہے کہ ایک فیکٹر جس نے کھوسہ کے جلد ہٹائے جانے میں کام کیا۔ وہ یہ کہ ارق کھوسہ ایک وزیر مملکت کی گرفتاری کی اجازت لینے کیلئے وزیراعظم سیکرٹریٹ پر زور دے ہے تھے۔ جس کی ایکسچینج فرم 20 ارب روپے کی منی لانڈرنگ میں ملوث پائی گئی تھی۔ وزیراعظم کے اونٹ کے لئے آخری تنکا یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ ایف آئی اے کی ٹیم نے پاکستان سٹیل ملز ں مالی بے قاعدگیوں کے ثبوت حاصل کر لئے تھے اور اپنی رپورٹ سپریم کورٹ میں جمع کرا دی۔ رائع کا کہنا ہے کہ کھوسہ اب قانون پر عمل کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے سٹیل ملز کے تمام ان افسروں کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ جو انکوائری رپورٹ میں قصوروار پائے گئے ہیں۔ ان میں سٹیل ملز کا سابق چیئرمین بھی شامل ہے۔ جس کو وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے قومی اسمبلی میں پنی تقریر کے دوران ''ڈس مس'' کر دیا تھا۔ ہٹایا جانے والا چیئرمین اسلام آباد میں بہت سے طاقت ر عہدوں پر براجمان افراد کا قریبی دوست بتایا جاتا ہے۔ ہائی پروفائل کیسوں کی تحقیقات کے دوران ڈی جی ایف آئی اے کی تبدیلی نے نہ صرف مختلف حلقوں کو حیران کر دیا بلکہ نئے ایف آئی ے چیف کا عزم سوالیہ نشان ہوگا جبکہ ادارے کی ساکھ پہلے ہی کمزور پڑ چکی ہے۔

طارق کھوسہ کی جگہ ظفر اللہ خان کو لایا گیا ہے۔ جن کے اعلیٰ شخصیات کے ساتھ تعلقات سندھ میں سروس کے دوران نواب شاہ بعد ازاں بدین اور سکھر میں تعیناتی سے چلے آ رہے ہیں۔ دیگر

مقدمات جن پر تفتیش جاری تھی، وہ وفاقی وزیر بہبود آبادی ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان، وزیر مملکت
برائے امور کشمیر و شمالی علاقہ جات عبدالرزاق عباسی اور سٹیل ملز سکینڈل میں ملوث ایک بڑ
شخصیت کے قریبی ساتھی ریاض لالہ جی کے خلاف ہیں۔ ای سی ایل میں نام ہونے کے باوجو
جس کے دبئی فرار سے متعلق ایف آئی اے تحقیقات کر رہی تھی۔ سپریم کورٹ 26 نومبر کو ایف آ
کو سٹیل ملز سکینڈل سے متعلق اپنی حتمی تحقیقات دو ہفتے یک اندر پیش کرنے کی ہدایت کر چکی تھی۔

طارق کھوسہ نے ایف آئی اے میں سب انسپکٹروں اور دیگر کی بھرتی کے سلسلے میں سیاسی دبا
قبول نہیں کیا تھا۔ ظفر اللہ خان جو اب ایف آئی اے کی سربراہی کریں گے، بذات خود ان
نیب نے نامعلوم ذرائع سے جائیداد بنانے کی تحقیقات کی تھیں۔ سرحد نیب کے ترجمان نے د
نیوز کو بتایا کہ ان کے خلاف ناقابل تردید ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے تحقیقات روک دی گئی۔ (دی نیو
11 دسمبر 2009ء) ظفر اللہ خان 2004ء میں اس وقت بھی شہ سرخیوں کا موضوع بنے تھے
جب انہوں نے آئی بی کا ڈائریکٹر ہوتے ہوئے اپنے بھتیجے کے خلاف قتل کے مقدمہ میں پولیس
خاموش رہنے کیلئے دباؤ ڈالا تھا۔ متاثرہ خاندان کے وکیل ملک رب نواز نون نے اس وقت
عدالت میں دلائل دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ملزم نے ثبوت آئی بی کے حکام کی مدد سے ضائع کر دیے
ہیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ پولیس نے کیس کی تفتیش آئی بی حکام کے بے پناہ دباؤ میں کی اور ملز
پارٹی کو ثبوت ضائع کرنے میں مدد دی ہے۔ ایف آئی اے کے نئے ڈائریکٹر جنرل نے اس
رپورٹ کی بھی تصدیق کی ہے کہ خان کا چھوٹا بھائی خالد عمرزئی جو اس وقت کوہاٹ کا کمشنر ہے
کرپشن کے الزام میں جیل میں رہ چکا ہے۔ ظفر اللہ نے اپنے نیب کے زیر تفتیش رہنے کی بھی
تصدیق کی ہے۔ اس سوال پر کہ کیا یہ سچ ہے کہ وزیراعظم نے انہیں صدر کے اصرار پر تعینات کی
ہے کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اس قسم کی تمام تعیناتیاں مشاورت کے ساتھ کی جاتی ہیں
اگرچہ انہوں نے نواب شاہ بدین میں تعینات رہنے کی تصدیق کی تاہم صدر زرداری سے اپنے کی

براہ راست تعلق کی تردید کی۔

ایف آئی اے کے ایک سینئر آفیسر نے اعلیٰ سطح کی اس اکھاڑ پچھاڑ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ
''اس تبدیلی سے گزشتہ 8 مہینوں میں ہونے والی بہتری 180 ڈگری پر واپس آئے گی۔'' طارق
کھوسہ جن کی تعیناتی رواں برس یکم جنوری کو ہوئی تھی، کو ایجنسی کے سربراہ کی حیثیت سے ایک سال
مکمل ہونے سے قبل ہی عہدے سے ہٹا دیا گیا اور کسی احتجاج کے خدشے کے پیش نظر انہیں پہلے
ہی وفاقی سیکرٹری کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ چاہے نسبتاً کم پروفائل کے اینٹی نارکوٹکس
ڈویژن کا سہی۔ ایف آئی اے کے سربراہ کی تبدیلی کے لئے چند سیاسی شخصیات اور ان کے قریبی
افراد جن کو طارق کھوسہ کا سامنا تھا، آپے سے باہر ہو رہے تھے، بہبود آبادی کی وفاقی وزیر ڈاکٹر
فردوس عاشق اعوان جن کے مبینہ طور پر انسانی سمگلنگ میں ملوث ہونے کے الزامات تھے، کے
کیس کی بھی تفتیش کی گئی تھی۔ فردوس عاشق پہلے ہی ریکارڈ پر الزامات کی تردید کر چکی ہیں۔ ماضی
میں انہی الزامات پر موقف کیلئے جب ان سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے اپنے سے منسوب الزامات
کی تردید کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ ریکارڈ کی اس غلطی کی طرف توجہ مبذول کرانے خود چیئرمین نادرا
کے پاس نہیں گئیں کیونکہ انہوں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ انہوں نے ایف آئی اے کے ڈائریکٹر جنرل
کے بیان کی بھی تردید کی کہ الیاس پہلے اعتراف کر چکا ہے اور اب مکر گیا ہے۔ مگر اسلام آباد ہائی
کورٹ (تحلیل سے قبل) نے 22 جون 2009ء کو کیس میں ملوث نادرا کے ملازم کی بعد از
گرفتاری ضمانت پر ریمارکس دیئے کہ ''ڈپٹی اٹارنی جنرل 5 لاکھ روپے کا چیک ڈاکٹر فردوس اعوان
کے پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے کیش کرانے سے متعلق عدالت کو مطمئن کرنے میں ناکام
رہے۔ پولیس کی فائل معاملے کے اس پہلو کے متعلق خاموش ہے اور اس معاملے کو سلجھانے کیلئے
تفتیشی افسر کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔ یہ معاملات پراسیکیوشن سٹوری میں شبہات پیدا کرتے
ہیں۔''

فردوش عاشق اعوان کا کہنا ہے کہ وہ الیاس کو تحقیقات شروع ہونے سے پہلے ہی برطرف کر چکی تھیں۔ انہوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ کس طرح والدین کی غیر حاضری میں ایک ٹین ایجر نے پاسپورٹ حاصل کرلیا۔ وزیر نے کہا کہ یہ سارا معاملہ نادرا، ایف آئی اے اور دیگر اداروں کی ناکامی کی واضح مثال ہے۔ وزیر مملکت سینیٹر عبدالرزاق کی کمپنی ''ملک ایکسچینج پرائیویٹ لمیٹڈ'' کے 15 ارب روپے فارن کرنسی ایکسچینج کے سیکنڈل کے شواہد سے متعلق رائے لینے کے لئے فائلیں مرکزی بینک کو بھی ارسال کی گئیں۔ اگلا مرحلہ مذکورہ وزیر سے تفتیش کیلئے حکومت کی اجازت لینا تھا۔ کھوسہ پہلے بھی ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان سے انسانی سمگلنگ میں مبینہ طور پر ملوث ہونے پر تحریری بیان لے چکے ہیں۔ انہیں ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کے اس اعتراف کے بعد کیس میں ملوث کیا گیا تھا کہ اس نے انسانی اسمگلروں کی جانب بھیجے گئے پیسے ان کے حوالے کیے۔ جن کے پاسپورٹ پر بچوں کو بھیجا گیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کی طرف سے ایک بیان جاری کیا گیا۔ جس میں انہوں نے کہا کہ ایف آئی اے نے انہیں الزام سے بری کر دیا ہے۔ جن پر ایف آئی اے کی طرف سے سختی سے تردید کی گئی۔ کھوسہ نے ماضی میں آن ریکارڈ کہا تھا کہ تقریباً 15 ارب یا تو بیرون ملک منتقل کئے گئے یا پھر ملک ایکسچینج کے 3 ملازمین کے ذریعے غیر قانونی طریقے سے یہ رقم پاکستان لائی گئی۔ انہوں نے کہا کہ ابتدائی تحقیقات میں مجموعی طور پر 40 سے 50 ارب مبینہ طور پر ان خفیہ اکاؤنٹس میں رہے جو ملک ایکسچینج کے ملازمین کی جعلی کمپنیوں کے نام سے کھولے گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ایف آئی اے کے اندازے کے مطابق مجموعی طور پر 15 ارب یا تو بیرون ملک منتقل کئے گئے یا اس چینل سے غیر قانونی طور پر پاکستان لائے گئے۔

ان دنوں وہ ان دو نوجوانوں کو اٹلی سے وطن واپس لانے میں کوشاں تھے۔ جنہیں فردوس عاشق اعوان کے صاحبزادے بتا کر ملک سے باہر سمگل کیا گیا تھا۔ اٹلی سے ان نوجوانوں کے واپس آنے پر طارق کھوسہ ایم این اے محترمہ فردوس عاشق اعوان پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔

جنرل (ر) مشرف کے دور آمریت کے بعد سیاسی حکومت کے قیام سے پاکستانی عوام امید لگائے بیٹھے تھے کہ شاید اب ان کے دن پھر جائیں اور کچھ بہتری ملکی معاملات میں ہو جائے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے موجودہ حکومت اپنی ''LATE'' نکال رہی ہے۔ ملک کو حلوائی کی دکان سمجھ کر بے رحمی سے نانا جی کی فاتحہ پڑھی جا رہی ہے۔ 12 دسمبر کو اس حوالے سے انصار عباسی نے ''دی نیوز'' میں ''ممی ڈیڈی کمپنی'' کے نام سے ایسا سیکنڈل آؤٹ کیا ہے۔ جس نے ساری قوم کو دہلا کر رکھ دیا۔ یہ زلزلہ زدگان کے نام پر ہونے والا انتہائی قابل نفرت فراڈ ہے۔ جس میں باپ نے مشینری خریدی، بیٹی کی کمپنی نے فروخت کی اور رقم بیوی کے اکاؤنٹ میں چلی گئی۔ پوری قوم، میڈیا اور عدلیہ کی چیخ و پکار کے باوجود صوبہ سرحد ''ایرا'' (زلزلہ متاثرین کی مدد کے لئے قائم ادارہ) کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک مام اینڈ پاپ کمپنی قائم کی اور ٹریکٹر کے تمام ٹھیکے بیٹی کو نواز دیئے۔ والدہ کا بینک اکاؤنٹ لاکھوں روپے تک پہنچ گیا ہے۔ ایک دفتری تحقیقات کے نتیجے میں اس انوکھے فراڈ میں پروونشل ارتھ کوئیکری کنسٹرکشن اینڈ ری ہیبیلی ٹیشن اتھارٹی (پی ای آر آر اے) کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو زلزلہ متاثرہ علاقوں کیلئے ناقص معیار کے ٹریکٹر کے حصول کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ سارا سودا اس انداز سے کیا گیا کہ سارا معاملہ گھر ہی میں طے ہو گیا۔ باپ نے مشینری خریدی، بیٹی کی کمپنی نے مشینری بیچی اور رقم بیوی کے اکاؤنٹ میں چلی گئی۔ ڈی جی پی ای آر آر اے ناصر اعظم نے وضاحت کی ہے کہ ان کی بیٹی کی کمپنی 1999ء سے ٹریکٹر کے کاروبار میں مصروف ہے اور نفی کی کہ اس معاملے میں کسی طرح شامل ہیں یا پی ای آر آر کے فنڈ سے خریداری کی اجازت دی تھی۔ خریدے گئے ٹریکٹر ناقص معیار کے ہونے کے ساتھ ساتھ پہاڑی علاقوں میں کام کیلئے بھی موزوں نہیں تھے۔ فیڈرل ارتھ کوئیکری کنسٹرکشن اینڈ ری ہیبیلی ٹیشن اتھارٹی (ایرا) جو کہ وزیر اعظم سیکرٹریٹ کا حصہ ہے۔ وزیر اعلیٰ سرحد پر دباؤ ڈال رہی ہے کہ ڈی جی پی ای آر آر اے کو برطرف کیا جائے۔ پولیس میں ان کے خلاف مقدمہ درج کرا کر

تمام ذمہ داران کے خلاف تحقیقات کی جائیں لیکن اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ وزیر اعظم سیکرٹریٹ میں موجود ذرائع کا کہنا ہے کہ سرحد کے وزیر اعلیٰ امیر حیدر خان ہوتی مبینہ طور پر اس افسر کو تحفظ فراہم کر رہے ہیں جبکہ وزیر اعلیٰ کے قریبی ذرائع کا مسلسل کہنا ہے کہ امیر ہوتی فیصلہ کرتے ہوئے میرٹ کو مدنظر رکھیں گے۔ ڈی جی پی ای آر آر اے نے وزیر اعلیٰ سے رشتے داری کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ وزیر اعلیٰ کے بھائی میرے برادر نسبتی ہیں۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ اس معاملے کی 3 تحقیقات ہوئیں۔ جن میں سے پہلی صوبائی انسپکشن ٹیم، دوسری نیب اور تیسری ایرا کے تحت کی گئی لیکن ان کا کوئی بھی نتیجہ سامنے نہیں آ سکا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ پی آئی ٹی نے اس فراڈ کی تصدیق کی اور مانسہرہ کے 2 افسران کے خلاف کارروائی کی سفارش کی لیکن ڈی جی پی ای آر آر اے کے خلاف کوئی فیصلہ سامنے نہیں آیا۔ حالانکہ نیب اور ای آر آر اے نے اس مبینہ فراد میں ڈی جی کو ملوث قرار دیا۔ وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ میں موجود ذرائع نے ''جو دستاویزات دکھائیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ وفاقی حکومت نے باضابطہ طور پر وزیر اعلیٰ امیر حیدر ہوتی اور صوبائی چیف سیکرٹری سے رابطہ کیا کہ ڈی جی پی ای آر آر اے اور دیگر ملوث افراد کے خلاف کارروائی کی جائے۔ (دی نیوز 11 دسمبر 2009ء) ایرا کی ایک تحقیقات کے مطابق تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن (ٹی ایم اے) کے سولڈ ویسٹ منجمنٹ کیلئے ایک PC-1 کیلئے ڈسٹرکٹ ارتھ کوئیک اتھارٹی کی جانب سے 2 کروڑ 60 لاکھ کی 11 نومبر 2007ء کو منظوری دی گئی، ایرا کا پراجیکٹ ایویلیوایشن سیل (پی ای سی) کی جانب سے 18 دسمبر 2007ء کو لیٹر نمبر ERRA/ (8) 104 PEC/ 07 میں اسے کلیئر کر دیا گیا۔ مذکورہ اصل PC-1 میں کھدائی مشین، آبی باؤزر، 2 چھوٹے ڈمپ ٹرک، سیوریج کلیئرنگ مشین، 100 ٹرالیاں، وائرلیس سسٹم اور 150 کچرے کے ڈبے حاصل کئے جانے تھے۔ بعد ازاں اوریجنل PC-1 پر نظر ثانی کی گئی اور اسے 2 کروڑ 64 لاکھ 32 ہزار کر دیا گیا اور چاروں مشینوں کو 25 ٹریکٹروں سے بدل دیا گیا۔ پالیسی اور رول

کے معاملے کے تحت تحقیقات میں کہا گیا یہ نظر ثانی متعلقہ فورم کے تحت کی جانی چاہیے تھی لیکن ڈی جی پی ای آر آر اے نے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے تئیں اس کی منظوری دے دی۔ PC-1 کی نظر ثانی کے بعد اخبارات میں فروری 2009ء میں چھوٹے ٹریکٹروں کی خریداری کیلئے اشتہار دیا گیا لیکن اس اشتہار میں درج ذیل نکات موجود نہیں تھے۔

(i)۔ بولی لگانے والے کی اہلیت کیلئے کسی قسم کا معیار مقرر نہیں کیا گیا تھا۔

(ii)۔ جواب دینے کا وقت پی پی آر اے میں تجویز کردہ وقت سے کم تھا۔

(iii)۔ ٹینڈر کیلئے دستاویزات بھی تیار نہیں تھیں۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دفتری دستاویزات کے مطابق ڈی جی پی ای آر آر اے ناصر اعظم، ٹی ایم اے مانسہرہ عبدالرحمٰن اور دیگر مقامی افسران جن میں اجمل خان، عبداللطیف تحصیل آفیسر، ٹی ایم اے، مانسہرہ اینڈ مہند نے ٹریکٹروں کی خرید کی تجویز دی۔ اور پہلے 25 بعد میں 24 یعنی مجموعی طور پر 49 ٹریکٹر خریدے گئے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس سارے عمل میں پی پی آر اے کے قواعد وضوابط کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔ جس سے بولی دینے کی پیشکش کرنے والے افراد میں سے کوئی بھی بولی دینے کا اہل نہیں ہو سکا۔ بولی کے اس سارے عمل میں حصہ لینے والے افراد کے 2 مختلف ریکارڈ موجود ہیں۔ عائشہ انٹر پرائزز، نیو ہالینڈ اٹک، نیو ہالینڈ ہری پور، فیلکو ایسوسی ایٹ پشاور اور نیشنل مشینری اسٹور ہری پور جبکہ دوسرے ریکارڈ میں بولی دینے والے عائشہ انٹر پرائزز، گل انٹر پرائزز، احسن ٹریڈرز اور فیلکو ایسوسی ایٹس ہیں۔ دونوں ریکارڈ میں میسرز عائشہ انٹر پرائزز کو سب سے کم بولی لگانے والا دکھایا گیا ہے۔ جس میں ایک ٹریکٹر کی ٹرالی سمیت قیمت 4 لاکھ 60 ہزار بتائی گئی تھی۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ کسی بھی بولی لگانے والے کی جانب سے کمپنی کے اصل لیٹر ہیڈ پر کوٹیشن جمع نہیں کرائی گئی۔ اس پر رجسٹریشن نمبر یا این ٹی این نمبر موجود نہیں تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی فرم بولی لگانے کی اہل نہیں تھی۔ رپورٹ میں کہا گیا

ہے کہ 25 ٹریکٹر کی مد میں 11.339 ملین روپے میسرز عائشہ انٹر پرائزز کو ادا کئے گئے۔ مارکیٹ ریٹ کے مطابق ایک ٹریکٹر کی قیمت بہت زیادہ ادا کی گئی۔ پی آئی ٹی (پراونشل انسپکشن ٹیم) کی تیار کردہ تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق نتیجتاً عوامی خزانے کو 4.310 ملین روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ قواعد کے مطابق غیر جی ایس ٹی رجسٹرڈ کسی بھی فرم یا کمپنی کو ادائیگی وغیرہ نہیں کی جا سکتی جبکہ پی ای آر آر اے کے فنانس ونگ نے میسرز عائشہ انٹر پرائزز کو بغیر مناسب انوائس اور جی ایس ٹی رجسٹریشن کی ادائیگی کر دی۔ ایرا رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پی آئی ٹی نے این ڈبلیو ایف پی ریمول فرام سروسز آرڈیننس 200ء کے تحت صرف 2 افسران عبدالرحمٰن، ٹی ایم او، ٹی ایم اے، مانسہرہ اور عبداللطیف ٹی او آئی، ٹی ایم آئی، مانسہرہ کے خلاف کارروائی کی تجویز دی۔ بجائے اس کے کہ نقصان کا ازالہ کیا جائے۔ ایرا حیران ہے کہ پی آئی ٹی نے کیسے پی ای آر آر اے کے ڈی جی کو نظر انداز کر دیا۔ جنہوں نے پرچیز کمیٹی کے سربراہ کا کردار ادا کیا تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پرچیز کمیٹی اس سارے معاملے کی ذمہ دار ہے کیونکہ وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں ناکام رہی اور ٹھیکہ ایسی کمپنی کو دیا گیا۔ جس کی ساکھ کے حوالے سے کئی سوالات موجود ہیں۔ یہاں ایک اور دلچسپ امر یہ ہے کہ تمام تحقیقات میں یہ سامنے آیا ہے کہ تمام ادائیگیاں اکاؤنٹ نمبر 3225 کو کی گئیں جو کہ عائشہ انٹر پرائزز کا ہے اور نیشنل بینک آف پاکستان سول سیکرٹریٹ پشاور میں ہے۔ عائشہ انٹر پرائزز کی مالکہ ڈی جی پی ای آر آر اے کی بیٹی ہے جبکہ اکاؤنٹ آمنہ ناصر چلا رہی ہیں جو کہ ناصر اعظم کی اہلیہ ہیں اور ناصر اعظم کو اپنا وارث نامزد کیا ہوا ہے۔ اس تحقیقات کی بنیاد پر ایرا چاہتی ہے کہ عائشہ انٹر پرائزز کو 49 ٹریکٹروں کی خریداری کی مد میں ادا کی گئی رقم ناصر اعظم سے وصول کی جائے جو کہ ڈی جی پی ای آر آر اے ہونے کے ساتھ ساتھ فرم کے حقیقی مالک ہیں۔ یہ تجویز بھی دی گئی ہے کہ اس افسر کے خلاف فراڈ کا کرمنل کیس بھی دائر کیا جائے۔ مزید یہ کہ کمیٹی کے دیگر ارکان کے خلاف بھی ریمول فرام سروسز آرڈیننس کے تحت ضابطے کی کارروائی کی بھی

تجویز دی ہے۔ ڈائریکٹر جنرل پی ای آر آر اے سے جب اس سلسلے میں رابطہ کیا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ میں نے کوئی کرپشن نہیں کی اور بتایا کہ میری بیٹی 1999ء سے ٹریکٹروں کا کام کر رہی ہے اور اب تک 800 ٹریکٹر بیچ چکی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ کمپنی رجسٹرڈ ہے اور اس کی تصدیق ایف بی آر سے کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہ تو میں کمیٹی کا چیئر مین تھا اور نہ ہی میں نے کسی خریداری کا حکم دیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ میں نے صرف ادائیگی کے وقت توثیق کی تھی کہ میری بیٹی کی کمپنی کو ادائیگی کر دی جائے۔ ٹی ایم او مانسہرہ نے انکوائری کمیٹی کو بتایا کہ ناقص معیار کے ٹریکٹر پہاڑی علاقوں میں کام کرنے کے لئے موزوں نہیں۔

یہ مشتے از خروارے کچھ مثالیں ہیں اگر مجموعی صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اس بات کا یقین ہونے لگتا ہے کہ واقعی یہ ملک اللہ کی خاص عنایت ہے ورنہ تو ہمارے ارباب بست و کشاد اسے کھوکھلا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

(جنوری 2010ء)

پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ

پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ ایگریمنٹ معاشی لحاظ سے ایک نہایت ہی اہم دستاویز ہے لیکن اس اہم دستاویز کے نئے معاہدے میں پاکستانی معیشت کی تباہی کیلئے ایک سوچا سمجھا منصوبہ تیار کیا گیا ہے جو کہ ہمارے ملک کی سلامتی کیلئے بھی خطرہ ہے۔ نئے معاہدے کو تاجر برادری اور معاشی ماہرین نے یکسر مسترد کر دیا ہے۔ نئے معاہدے میں بہت سی جگہوں پر پاکستانی بزنس کمیونٹی کے تحفظات ہیں جن کو دور کرنا بہت ضروری ہے۔ جس کیلئے کچھ تجاویز اور تحفظات درج ذیل ہیں۔
عالمی معاہدوں کے تحت افغانستان کو ٹرانزٹ تجارتی سہولیات فراہم کرنا ہماری ذمہ داری ہے تاہم باہمی معاہدہ میں بھارت کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اور آئندہ بھی بھارت کا اس میں کوئی کردار نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن افغانستان پاکستان ٹرانزٹ ٹریڈ کے نئے معاہدہ کے مجوزہ ڈرافٹ میں شامل ایک شق کے تحت بھارتی ٹرانسپورٹ کمپنیوں کو واہگہ بارڈر اور کراچی بندرگاہ سے کابل اشیاء لے جانے کی اجازت دی گئی ہے۔ جس پر سرحد چیمبر آف کامرس، کوئٹہ چیمبر آف کامرس اور فیڈریشن آف پاکستان چیمبر آف کامرس کے نمائندوں کے علاوہ کسٹمز کلیئرنگ فارورڈنگ ایجنٹس، شپنگ ایجنٹس، بارڈر ایجنٹس اور ملک بھر کے ٹرانسپورٹرز نے اعتراضات کئے ہیں کہ افغانستان کے

ساتھ ٹرانزٹ ٹریڈ کیلئے نئے معاہدے کی تیاری کے دوران کسی بھی ایسے بیرونی دباؤ کو زیر غور نہ لایا جائے۔ جس سے پاکستان کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ اور اسی تشویشناک صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے سرحد چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری اور پاکستانی ٹرانسپورٹروں کے وفد نے بھی افغانستان کے ساتھ نئے ٹرانزٹ معاہدے کی ان شقوں پر تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ جن کے تحت بھارت کی ٹرانسپورٹ کمپنیوں کو واہگہ باڈر سے افغانستان تک اور افغانستان کے ٹرکوں کو کراچی بندرگاہ سے کابل تک ٹرانزٹ گڈز لے جانے کی اجازت دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جس سے پاکستان کے مفاد کو نقصان پہنچے گا بلکہ سکیورٹی کے خطرات بھی بڑھ جائیں گے جیسا کہ حال ہی میں پاکستانی سکیورٹی فورسز کی جانب سے کامیاب کارروائیوں کے دوران لنڈی کوتل میں افغان ٹرانسپورٹ کے دو بڑے ٹرالر پکڑے گئے۔ جن میں کروڑوں روپے کے بارودی مواد کے علاوہ چھوٹا اور بڑا اسلحہ بھی تھا جو کہ دہشت گردی کی غرض سے اندرون ملک سپلائی ہو رہا تھا۔ اس معاہدے کے مجوزہ ڈرافٹ پر مذاکرات کا حتمی دور مارچ، اپریل 2010ء میں شروع ہوگا۔ جس کے بعد اسے حتمی شکل دے کر اس پر دستخط کئے جائیں گے۔ ان دستخطوں سے پہلے حکومتی ذمہ داران کو چاہیے کہ وہ اس فیلڈ کے ماہرین، تاجر برادری کے نمائندوں، چیمبرز اور دیگر تجارتی و معاشی شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے صلاح ومشورہ سے اسے حتمی شکل دیں۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان اور اسلامی جمہوریہ افغانستان کے درمیان ٹرانزٹ ٹریڈ کو باضابطہ بنانے کیلئے 2 مارچ 1965ء کو اس وقت کے وفاقی وزیر تجارت پاکستان وحید الزمان اور محمد سرور عمر وزیر تجارت افغانستان کے مابین ایک معاہدہ عمل میں آیا تھا۔ اس معاہدے کو پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ ایگریمنٹ گیتا (گڈز ان ٹرانزٹ ٹو افغانستان) کا نام دیا گیا تھا۔ اور اس وقت سے لیکر آج تک اس معاہدے کی رو سے افغانستان کو غیر ملکی اشیاء کی ترسیل کی راہداری کیلئے کراچی کی بندرگاہ اور پھر کراچی سے طورخم، خیبر ایجنسی، صوبہ سرحد اور چمن بلوچستان صوبہ بلوچستان کے بارڈر تک

کسٹمز کلیئرنس کی سہولت دی گئی اور آگے افغانستان تک ٹرکوں وٹرالرز کے ذریعے ترسیل کی جارہی ہے۔جس سے، نہ صرف پاکستان ریلوے وکراچی پورٹ ٹرسٹ (کے پی ٹی) کو اربوں روپے کا فائدہ مل رہا تھا بلکہ اس شعبے سے ہزاروں افراد جن میں کسٹمز کلیئرنگ ایجنٹس، بارڈر و شپنگ ایجنٹس، ٹرانسپورٹرز و دیگر افراد کا روزگار بھی وابستہ ہے۔

اس معاہدے کے تحت دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کو اشیاء کی تجارت کیلئے مکمل آزادی دے رکھی ہے مگر اس معاہدے کے تحت افغانستان پاکستان کو اپنی مصنوعات وسطی ایشیائی ریاستوں کو ایکسپورٹ کرنے کیلئے ٹرانزٹ کی سہولیات فراہم نہیں کرتا۔اسی طرح افغانستان ایسی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا کہ ان مصنوعات کو افغانستان سے ہی واپس آنے سے روکا جاسکے۔ حالانکہ اس معاہدے کے تحت افغانستان پاکستان کو وسطی ایشیائی ریاستوں تک اپنی مصنوعات پہنچانے میں مدد کا پابند ہے۔آجکل وسطی ایشیائی ممالک کی زیادہ تر تجارت ایرانی بندرگاہ بندر عباس سے ہوتی ہے جو کہ ازبک دارالحکومت سے 3800 کلومیٹر دور ہے۔اگر یہی تجارت براستہ پشاور، ترمیز ہو تو اس فاصلے میں خاطر خواہ کمی واقع ہوتی ہے کیونکہ کراچی اور گوادر کی بندرگاہیں 2700 کلومیٹر کی دوری پر ہیں۔

اب آئندہ چند ہی روز میں پاک افغان تجارتی راہداری معاہدہ پر مذاکرات کا پانچواں دور اسلام آباد میں شروع ہو رہا ہے۔اس لئے ان اہم ترین مذاکرات کے دوران وزارتِ تجارت پاکستان کی تاجر برادری کے نمائندوں کو بھی شریک کرے اور ان کے ذریعے ورلڈ بینک اور بھارت کے سازشی عنصر کو ختم کروائے اور اس اہم مذاکراتی پیشرفت میں جو اہم ترین سازشی ایشو ہیں۔ انہیں کسی بھی طرح سے معاہدے کا حصہ نہ بننے دے آخر میں یہ بتاتا چلوں کہ بھارت کی مداخلت سے ہمیں جو پریشانی ہو رہی ہے وہ ہمیں اپنے ملکی مفاد اور دفاع کی وجہ سے ہے اس لئے مختصراً عرض یہ ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے مابین دوطرفہ تجارتی تعلقات کو مزید فروغ دینے کی ضرورت

ہے جو تبھی ممکن ہوسکتا ہے کہ جب اس سلسلے میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔افغان تاجروں کو پاکستان میں اور پاکستانی تاجروں کو افغانستان میں ہر قسم کی سہولیات دی جائیں تا کہ دونوں ممالک کے مابین تجارتی حجم کو بڑھایا جاسکے۔ان اقدامات سے پاک افغان باہمی تجارت کو فروغ حاصل ہوسکتا ہے۔پاکستان اور افغانستان دونوں کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ وہ تاریخ، مذہب اور ثقافت کے اٹوٹ رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔دونوں ممالک ایک دوسرے کے فطری حلیف ہیں۔ان کا نفع اور نقصان ایک ہے۔اس لئے انہیں کسی تیسری قوت کو اپنے تعلقات بگاڑنے کا موقع نہیں دینا چاہیے اور باہمی تعاون اور ہم آہنگی کے ساتھ ترقی کی راہ پر شانہ بشانہ آگے بڑھنا چاہیے۔

(جنوری 2010ء)

☆☆☆☆☆☆☆☆

کرپشن جسد ملی کو کینسر کی طرح کھا رہی ہے

سٹیٹ بینک نے رواں مالی سال کیلئے پہلی سہ ماہی رپورٹ میں کہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ کے باعث محاصل کی وصولی کم رہے گی۔ رواں مالی سال کے دوران مہنگائی کی شرح 10 سے 12 فیصد رہنے اور معاشی ترقی کی شرح 3.3 فیصد، ترسیلات زر 7 ارب 80 کروڑ سے 8 ارب 80 کروڑ ڈالر رہنے کی توقع ہے۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ایکسپورٹس کا حجم 18 ارب 50 کروڑ سے 19 ارب ڈالر جبکہ امپورٹس کا حجم 30 ارب 50 کروڑ ڈالر سے 31 ارب ڈالر تک رہنے کی توقع ہے۔ دنیا کے ہر ملک کا دستور ہے۔ ایکسپورٹس پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور جن ممالک نے خسارہ سے بچنا ہوتا ہے۔ وہ ممالک اپنی امپورٹس کو ایکسپورٹس سے ہمیشہ کم رکھتے ہیں مگر ہمارے ملک میں امپورٹس پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور امپورٹس میں بھی ہمارے ملک کے لیڈروں کو بلٹ پروف گاڑیاں اور ایسا ہی سامان تعیش درآمد کیا جاتا ہے جو بعض حکمرانوں کے کام آتا ہے اور وہ ذاتی سامان کے طور پر منگوایا جاتا ہے۔ اس کیلئے ملک کا قیمتی زرمبادلہ ضائع کیا جاتا ہے اور ملک سے جو اشیاء برآمد کی جا رہی ہیں یہ بہت تھوڑی ہیں۔ پاکستان زرمبادلہ ان محنت کش پاکستانیوں سے حاصل کرتا ہے جو برسوں سے ملک

سے باہر رہتے ہیں۔ دن رات محنت کرتے ہیں اور اپنی کمائی کر رقوم پاکستان بھیج دیتے ہیں اور ہمارے حکمران اس رقم سے سامان تعیش منگوا لیتے ہیں۔ ہر وزیر نئی گاڑی کا مطالبہ کرتا ہے اور تمام وزراء چاہتے ہیں کہ وہ بلٹ پروف گاڑی حاصل کریں۔ حکمران بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی محنت وشاقہ سے کمائے ہوئے زرمبادلہ کو بے دردی سے خرچ کر دیتے ہیں جو کہ ایک ظالمانہ فعل ہے۔

این آر او زدگان کی فہرست جیسے ہی منظر عام پر آئی، سارا پاکستان سراپا احتجاج ہو گیا اور ہر طبقہ زندگی نے ان پر لعن طعن شروع کر دی۔ شاید عوامی موڈ کو دیکھتے ہوئے حکومت نے ''قرضہ معاف کروانے والوں'' کی بھی تشہیر کر دی۔ جس کو دیکھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے خدانخواستہ یہ ملک ڈاکوؤں، غاصبوں اور لٹیروں کے لئے معرض وجود میں آیا تھا۔ ساری دنیا میں ہماری کرپشن پر لعنت ملامت ہوئی ہے لیکن ڈھٹائی کی انتہا ہے کہ حکومت کی طرف سے ''میں نہ مانوں'' کی رٹ جاری ہے۔

پاکستانی معیشت کے بارے میں آئی ایم ایف نے اپنی سہ ماہی رپورٹ میں معاشی استحکام، تیز رفتار ترقی کے لیے اصلاحات کے حوالے سے حکومتی اقدامات کو سراہا ہے۔ اگرچہ معاشی صورت حال بدستور نازک ہے، تاہم افراط زر میں کمی، بعض شعبوں میں بہتری اور بیرونی سطح پر پاکستان کی مثبت ریٹنگ امید افزا ہیں۔ آئی ایم ایف کی رپورٹ بہرحال پاکستانی حکومت کی کارکردگی پر بھرپور اطمینان کا اظہار نہیں کرتی، کیونکہ حکومت آئی ایم ایف کی اہم شرائط پر پورا اترنے میں ناکام رہی ہے۔ دوسرا باعث فکر نکتہ محاصل میں اضافے کا ہے۔ خیال رہے کہ ستمبر 2009ء میں عالمی بینک کی رپورٹ میں بھی اس نکتے کا اظہار کیا گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق 2008-09ء میں جی ڈی پی کے 8.8 فیصد ہو گیا۔ مالی سال 2009-10ء کے پہلے دو ماہ میں ریونیو میں مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے۔ جولائی، اگست میں ایف بی آر کے ٹیکس وصولیوں میں 3.6 فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ سالانہ ہدف کے حصول کے لیے یہ 10.5 فیصد ہونا چاہیے۔ اس سے حکومت مالی خسارے کا ہدف حاصل نہیں کر سکے گی۔ وزیر خزانہ شوکت ترین نے اعتراف کیا ہے

کہ سال کی پہلی سہ ماہی میں حکومت مالی خسارے کے ہدف سے جی ڈی پی کا 0.2 فیصد پیچھے ہے، تاہم ان کا اصرار تھا کہ حکومت سالانہ ہدف حاصل کر لے گی۔

سابقہ حکومت کے اراکین بالخصوص سلمان شاہ بارہا کہہ چکے ہیں کہ معاشی صورت حال کی ذمے دار موجودہ حکومت کا احتساب ہونا چاہیے کیونکہ مشرف دور میں معیشت تیز رفتار ترقی کر رہی تھی، سابقہ دور میں شرح نمو کی بلند شرح سے اس کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ عالمی بینک سابق وزیر کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہے، تاہم اکثر پاکستانی ماہرین معاشیات اس کی وجہ گیارہ ستمبر کے بعد سے بیرونی امداد کو قرار دیتے ہیں۔ انتیس اکتوبر 2009ء کی عالمی بینک کی اپ ڈیٹ کے مطابق اس عشرے کے اوائل میں پاکستان میں بلند شرح نمو کی بنیاد بیرونی فنانسنگ تھی، جبکہ ریونیو اور بچتوں کی شرح سست روی کا شکار تھی۔ بیرونی امداد پر معیشت کے انحصار کی وجہ سے معیشت کا بیرونی صورت حال سے متاثر ہونا لازمی تھا 08-2007ء میں عالمی معیشت بحرانی کیفیت کا شکار ہوئی، جو پاکستان کے لیے ادائیگیوں کے توازن میں بگاڑ کا باعث بنی۔

دوسرا باعث فکر مسئلہ پہلے مسئلے سے منسلک ہے۔ توقع سے کہیں کم ریونیو کے باوجود حکومت اپنے اخراجات میں کمی نہیں کر سکی ہے۔ عالمی بینک تسلیم کرتی ہے کہ حکومت نے اخراجات میں کمی کی کوششیں کی ہیں تاہم یہ ناکامی سے دوچار ہوئی ہیں۔ ملک میں توانائی کے بحران کی وجہ سے بجلی کی قیمتوں میں حکومت سیاسی وجوہ کی بناء پر اضافہ کرنے سے کتراتی رہی اور یوں سبسڈیز کا بوجھ خزانے پر بڑھتا چلا گیا۔ صوبائی سطح پر ڈویلپمنٹ اخراجات نے بھی حکومتی کوششوں کو متاثر کیا ہے، جس کے لیے حکومت کو بڑے پیمانے پر مقامی بینکوں بالخصوص مرکزی بینک سے قرضہ لینا پڑا۔ فی الوقت اہم سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان معاشی بحران سے باہر آ گیا ہے۔ اسٹیٹ بینک کے گورنر کے خیال میں ایسا ہے اور پاکستان کو مزید کسی مالی سپورٹ کی ضرورت نہیں.......... تاہم وزارت خزانہ مرکزی بینک کے گورنر کے خیال سے اتفاق نہیں کرتی، جو ابتر سیاسی اور سکیورٹی صورت حال میں

معاشی استحکام کے لیے تگ و دو میں ہے۔ عالمی بینک کی انتیس اکتوبر کی اپ ڈیٹ کے مطابق اصلاحات کے نفاذ، حکومتی اخراجات میں کمی اور ریونیو میں اضافے کی کوششوں میں ناکامی کی وجہ سے میکرو اکنامک کی صورت حال بدستور گمبھیر رہنے کا امکان ہے۔

اسٹیٹ بینک نے اپنی مانیٹری پالیسی جاری کرتے ہوئے خبردار کیا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ، ملک کی امن و امان کی صورتحال اور بجلی بحران کے باعث معیشت میں خطرے اور بے یقینی کی مجموعی سطح خاصی بلند ہو چکی ہے۔ اسٹیٹ بینک کی اس رپورٹ میں ملکی معیشت کو درپیش جس سنگین خطرے کا ذکر کیا گیا ہے، یہ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کو ''اپنانے'' اور اپنی سرزمین کو بم دھماکوں، خودکش حملوں اور تخریب کاری کے واقعات کی آماجگاہ بنا دینے کا لازمی نتیجہ اور نقد قیمت ہے جو پاکستانی عوام کو ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ خود سرکاری بیانات کے مطابق اس لاحاصل اور ناکام مہم میں آنکھیں بند کر کے کود پڑنے کے نتیجے میں پاکستان کو اب تک چالیس ارب ڈالرز سے زائد کا نقصان اٹھانا پڑا ہے اور امن و امان کی ناگفتہ بہ صورتحال کے باعث ملکی معیشت تباہی کے کنارے پر پہنچ چکی ہے۔ امریکہ پاکستان کے اس نقصان کا ازالہ کرنے کی بجائے اسے صرف ڈیڑھ ارب روپے کی نام نہاد امداد کی خاطر ذلت آمیز شرائط قبول کرنے پر مجبور کر رہا ہے اور آئی ایم ایف نے پاکستان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر سات ارب ڈالر کے قسط وار قرضے کے لیے پاکستانی عوام کی پشت پر مہنگائی کے تازیانے برسانے شروع کر دیے ہیں۔ پاکستان کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے کہ وہ اس مہم سے صوبے جلد پیچھا چھڑا کر ملک میں امن و امان کی صورت حال بہتر بنانے پر توجہ دے۔ ایسا نہ ہو کہ پاکستانی عوام کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور وہ عالمی استعمار اور اس کے مقامی آلہ کار عناصر کے خلاف فیصلہ کن معرکے کیلئے میدان میں نکل آئیں۔

ماضی میں دنیا کے بہت سے ممالک میں ایسا ہوا ہے اور اب بھی ایسا نہ ہو سکنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ فلپ فیلڈ کا تعلق نیوزی لینڈ سے ہے، وہاں کے قانون و انصاف کے اسسٹنٹ وزیر ہیں،

جسے ہم پاکستان کے لحاظ سے وزیر مملکت برائے انصاف کہہ سکتے ہیں۔ 2005ء کی بات ہے
اسے اپنے گھر کے باتھ روم میں ٹائلز لگوانے کی ضرورت پیش آئی، اس نے ٹھیکیداروں سے را
کیا، ایک ٹھیکیدار سے اس کے معاملات طے ہوگئے۔ ٹھیکیدار کو اس نے کام سونپ دیا۔ ٹھیکیدار
اپنے کارندے لگائے اور کچھ دنوں میں کام مکمل کرلیا اور اپنے پیسے لے کر چلا گیا۔ چند ماہ بعد یہ
سامنے آئی کہ فلپ فیلڈ نے جس ٹھیکیدار سے کام کروایا ہے، اس کے پاس غیر قانونی باشندے ک
کرتے تھے۔ اس خبر کی اشاعت نے نیوزی لینڈ کے محکمہ احتساب کی توجہ حاصل کرلی۔ اخباری
کی تصدیق ہونے پر محکمہ احتساب نے فلپ فیلڈ کو استعفیٰ دینے کے لیے کہا، فلپ فیلڈ نے فو
استعفیٰ دے دیا۔ مقدمہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا، فلپ فیلڈ کے لیے سیاست کے دروازے
ہونا شروع ہوگئے۔ 2006ء میں اسپیکر نے فلپ کی اسمبلی کی رکنیت منسوخ کردی۔ 2007
میں اسے پارٹی سے بھی نکال دیا گیا۔ مقدمہ چلتا رہا اور 6 اکتوبر 2009ء کو عدالت نے فلپ فی
کو سات سال قید کی سزا سنادی۔

جس ملک میں ادارے مضبوط ہوں، ریاستی قوانین حکمرانوں کی ہاتھ کی چھڑی نہیں بن
اور نہ ہی وہ جیب کی گھڑی بنا کر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ فلپ فیلڈ کے واقعے پر نظر ڈال لیجیے
دیکھ لیجیے کہ نظام موجود ہو تو اس کا ردعمل کیسے سامنے آتا ہے؟

مغربی جمہوریت کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھنے والے ہمارے حکمران آج تک نہیں سمجھ پائے
مغرب میں ترقی اور ہمارے ہاں تنزلی کیوں ہے؟ ہر سیاست دان ملکی صورت حال پر مگرمچھ
آنسو بہاتا ہے لیکن وہ عوام کو ریلیف دینے کے لیے تیار نہیں، خود "ریلیف" لینے کے جتن کر
والے دوسروں کو کیسے ریلیف دے سکتے ہیں۔ پاکستان پر نظر ڈالیں تو جھکنے والوں نے "رفعتیں
پائیں اور عوام "خودی" بلند کرنے میں لگے رہے۔ پاکستان میں جتنا زیادہ لوٹ کھسوٹ کر
والا ہے اس کی اتنی زیادہ "گڈول" ہے۔ سیاسی اور قانونی بنیادوں پر سب سے زیادہ ریلیف

ہمارے مقتدرین کا طرۂ امتیاز ہے۔ سیاسی مخالفت کی بنیاد پر قائم ہونے والے مقدمات کا نام
استعمال کرکے وہ اپنا کیا چھپا لیتے ہیں۔ فلپ فیلڈ کا مقام اور سیاسی مرتبہ بھی دیکھ لیں اور اس کا جرم
اور سزا بھی تو حالات کا رونا رونے والوں کو اندازہ ہوجائے گا کہ نیوزی لینڈ جیسا ملک کیوں ترقی کر
رہا ہے اور ہم کیوں تنزلی کے عمیق گڑھے میں گرتے چلے جا رہے ہیں۔

ہمارے ہاں لاکھوں، کروڑوں اور اربوں کی کرپشن کرنے والے ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ
صرف مقدمے پر ہم استعفیٰ کیوں دیں؟ ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی گلوبل کرپشن رپورٹ 2009ء
میں پاکستان نے کرپشن میں مزید ترقی کرکے 47 ویں سیٹ سنبھال لی ہے اور عالم یہ ہے کہ بنگلہ
دیش بھی ہم سے بہتر رینکنگ میں ہے۔ اس فہرست میں دیانتداری میں پہلا نمبر نیوزی لینڈ کو دیا
گیا ہے۔ جس ملک میں احتساب اتنا کڑا ہو کہ ایک وزیر اور وہ بھی انصاف کے محکمے کا صرف اتنے
سے جرم پر کہ اس نے ایسے ٹھیکیدار سے ٹائلز لگوائیں جس کے پاس ایسے لوگ کام کرتے تھے، جو
قانونی دستاویزات کے حامل نہیں تھے، اس "جرم" کی تو ہمارے ہاں خبر تک نہیں بنتی، وہاں نہ
صرف خبر بنی بلکہ وزارت، رکنیت اور پارٹی سے فلپ فیلڈ کو اس طرح نکال دیا گیا جیسے مکھن سے
بال کو نکال دیا جاتا ہے، کسی نے دہائی دی نہ واویلا مچایا۔ نہ اسے اپوزیشن کی سازش قرار دی۔ فلپ
فیلڈ پر مقدمہ چلا تو کوئی دباؤ آیا نہ حیلے بہانے تراشے گئے اور سزا ہونے پر فلپ فیلڈ نے اسے
"کینگرو کورٹ" کا نام دیا، نہ چمک کا شاخسانہ قرار دیا۔ ایسے ملک میں کسی کو کیسے جرأت ہوگی کہ وہ
معمولی سی بھی کرپشن کرے اور پھر اسے چھپا سکے۔

ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی اس رپورٹ کی کریڈیبلٹی کے لیے یہی کافی ہے کہ نیوزی لینڈ کو 180
ممالک میں سرفہرست رکھا گیا ہے۔ ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق صرف ایک سال
(2009ء) میں 500 ارب روپے کی کرپشن ہوئی۔ جس ملک میں عوام نانِ جویں کو ترستے ہوں
اور خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے والوں میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہو، انفرادی اور اجتماعی

خودکشیاں روزمرہ کا معمول بن چکا ہو، وہاں اتنے بڑے پیمانے پر کرپشن کا ہونا واضح کرتا ہے کہ
ہماری معاشی ناہمواریوں کی وجہ وسائل کی کمی نہیں کرپٹ مافیا ہے، جو کروڑوں اور اربوں ڈکار
ہے۔ دوسری طرف تمام قوانین موجود ہوتے ہوئے بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا ہے، عہدوں
کے باعث انہیں ''مقدس گائے'' بنادیا گیا ہے یا ''مفاہمت'' کے نام پر انہیں راستہ دے دیا گیا
ہے۔ پاکستان نے اپنے قیام سے اب تک اگر کہیں ترقی حاصل کی ہے تو وہ کرپشن کا میدان ہے۔
یار لوگ اسے بھی یہ کہہ کر کہ ''چلو پاکستان نے کسی فیلڈ میں تو ترقی کی'' قہقہوں میں اڑا دیتے ہیں۔
آج ٹرانسپرنسی رپورٹ کو سازش قرار دینے والے کل تک انہی رپورٹوں کے حوالے دے کر سابقہ
حکومتوں کو کرپٹ قرار دیتے تھے۔

پاکستان کی تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالیں تو سب سے زیادہ حکومتیں کرپشن کے الزام میں اپنے
انجام کو پہنچیں، مگر آنے والی حکومت نے اس سے بڑھ کر کرپشن کی۔ کرپشن ملک لیس کیسے ختم ہو
جب کرپٹ مافیا کے افراد یا ان کے کارندے حکمران ہوں اور ان کے ''فرنٹ مین'' سودے طے کر
کے ہوس زر کو تسکین پہنچانے میں دن رات مصروف عمل ہوں۔ کرپشن کے متعلق وزیر خزانہ شوکت
ترین جب ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہوں کہ ''بدعنوانی سے حاصل کردہ رقم بڑے لوگوں کی
جیب میں جا رہی ہے اور ان بڑے لوگوں پر ہاتھ ڈالنے کے لیے حکومت کو جرأت درکار ہے۔'' یہ
جرأت کیسے پیدا ہو، جب حکومت ہی پر وہ قابض ہوں۔ پاکستان میں ایسا مذاق اب تک دیکھنے
میں نہیں آیا کہ کوئی طبقہ خود کو احتساب کے لیے پیش کرے، این آر او (قومی لوٹ مار آرڈیننس)
کی فہرست میں ان مقدس 8041 افراد کا جائزہ لے لیں۔ جنہوں نے 165 ارب کی کرپشن کی تو
آپ کو سارے بڑے بڑے نام مل جائیں گے۔ 165 ارب کی کرپشن 300 افراد نے کی ہے،
باقی نے ''آف دی ریکارڈ'' جو کچھ کیا ہے، اس کا احوال دیکھنے کو نہیں ملتا۔

(فروری 2010ء)

فاٹا کی مفلوج معیشت

عسکریت پسندی، دہشت اور لوگوں کی نقل مکانی کے نتیجے میں وفاق کے زیر انتظام قبائلی
علاقوں کی معیشت تباہ ہو کر رہ گئی ہے اگرچہ ملک کے تمام اشاریے اسے 30 سالوں میں پسماندہ
ترین علاقہ ظاہر کرتے چلے آ رہے ہیں مگر 9/11 کے بعد طویل مسلح جھڑپیں اس کے لیے ضرب
شدید ثابت ہوئیں ہیں اور تقریباً تمام کاروبار صنعتیں اور زراعت مفلوج ہو کر رہ گئی ہیں۔ فاٹا
سیکرٹریٹ کے عہدیداروں کا کہنا ہے کہ اس خطے کو ایک کھرب 71 ارب روپے (12 ارب ڈالر)
سے زائد کا نقصان ہو چکا ہے۔ ان میں وہ نقصانات شامل نہیں ہیں جو حالیہ جنگ اور جنوبی
وزیرستان میں نقل مکانی اور لوگوں کی بے گھری کے نتیجے میں ہوئے ہیں۔

ایک عہدیدار نے بتایا کہ فاٹا کی معیشت کو پہنچنے والا نقصان بہت بڑا ہے۔ جس کی وجہ
مارکیٹوں اور دکانوں کی بندش، سفر اور نقل وحمل کے کرایوں میں اضافہ، بڑھتی ہوئی قیمتیں، بے
روزگاری، زراعت، صنعتی پیداوار اور افغانستان سے ٹرانزٹ ٹریڈ میں کمی ہے۔

انفرااسٹرکچر کی تباہی کا اندازہ 12 ارب 68 کروڑ ڈالر لگایا گیا ہے۔ جب کہ دہشت گردی
سے جنگ پر ہونے والا معاشی نقصان (سفر نقل وحمل کا نقصان مذکورہ بالا نقصان کا 75 فیصد ہے)

9ارب 50 کروڑ روپے کے لگ بھگ ہے۔ سماجی نقصان کا اندازہ 88ارب 80 کروڑ روپے ہے جب کہ سکیورٹی اور بے گھر افراد کی بحالی کے لیے مزید 45ارب روپے کی ضرورت ہے۔ ماحولیاتی نقصان کا تخمینہ 5 ارب روپے لگایا گیا ہے۔ فاٹا کی 90 فیصد سے زائد آبادی براہ راست یا بالواسطہ طور پر زراعت اور مویشیوں سے ہونے والی اپنی آمدنی سے محروم ہو چکی ہے۔ اس کی بقاء کا دارومدار زیادہ تر کاشتکاری اور مویشیوں پر ہے۔ اراضی کے استعمال کے اعدادوشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاٹا کی کل 28 لاکھ ہیکٹر اراضی میں سے صرف 7 فیصد یعنی 2 لاکھ ہیکٹر اراضی زیر کاشت ہے اور کاشت کاروں کا شعبہ بری طرح متاثر ہوا ہے۔ زرعی اور لائیوسٹاک کے شعبے میں سرکاری اثاثہ جات کو پہنچنے والے نقصانات کا تخمینہ 4 ارب 25 کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔ جس میں سب سے زیادہ نقصان باجوڑ میں ہوا جب کہ نجی اثاثہ جات کو ہونے والے نقصان کا اندازہ 14 ارب روپے ہے۔

بے فصل سبزیوں اور پھلوں کی برآمدات جو مقامی افراد کی آمدنی کا ذریعہ تھیں رک گئی ہیں۔ کاشتکاروں کو خدشہ ہے کہ انہیں 9 ارب 50 کروڑ روپے سالانہ کا نقصان ہوا ہے۔ عہدیدار کا کہنا ہے کہ کاشت کار امن وامان کی ابتر صورتحال اور نقل مکانی کے باعث فصلیں کاشت کرنے سے قاصر ہیں۔ زرعی پیداوار کی عدم دستیابی اور ان کی بلند قیمتیں بھی ایک مسئلہ ہیں۔ قبائلی پٹی میں پھلوں کے باغات پر توجہ نہیں دی جاسکتی۔ علاقے میں لائیوسٹاک سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔

فاٹا میں جاری شورشوں نے علاقے کی اس معاشی سرگرمی پر شدید دباؤ ڈال رکھا ہے۔ جو پہلے ہی محدود تھی کاروبار کرنے کے اخراجات، تعمیرات، زندگی بسر کرنے اور نقل وحمل کی لاگتوں میں کئی گنا اضافے نے لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ یہ علاقے جسے پیش رو حکومتیں بھی ہمیشہ نظر انداز کرتی رہی ہیں۔ اب پہلے سے کہیں زیادہ خستہ حالی کا شکار ہے۔ یہاں نجی شعبے کی سرمایہ کاری قطعاً ناممکن ہوگئی ہے اور علاقے سے انسانوں اور بچے کھچے سرمائے کے وسائل دونوں کا انخلاء

جاری ہے۔

پشاور میں قائم این جی او کے ایک ملازم نے جو یو ایس ایڈ کے فنڈ سے شروع کیے گئے ایک کپیسٹی بلڈنگ پروجیکٹ میں کام کرتا ہے کہا کہ مختلف سرکاری اداروں کو اپنی سرگرمیاں روک دینے کے لیے کہا گیا ہے۔ نئے پروجیکٹ کے لیے رقومات کی فراہمی بند کر دی گئی ہے۔ جب کہ موجودہ منصوبے امن وامان کی ابتر صورتحال کے باعث روکنے پڑے ہیں۔ اگر یہ پروجیکٹ طویل عرصے کے لیے روکے گئے تو یقیناً یہ علاقہ مزید مصائب کا شکار ہو جائے گا۔ عہدیدار کے مطابق علاقے کے 3 پروجیکٹوں پر صرف 23، 20 اور 37 فیصد کام ہو سکا ہے۔ سرحد چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے ایک اجلاس میں ایک صنعتکار نے شکایت کی کہ تاجروں کو طالبان اور افسران دونوں کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے اور وہ کنویں اور کھائی کے درمیان پھنس کر رہ گئے ہیں۔ انہیں ان دونوں کو خوش کرنا ہوتا ہے بصورت دیگر وہ کام نہیں کر سکتے۔

دکانوں پر بہت کم گاہک آتے ہیں کیونکہ زیادہ تر لوگوں کی گزر اوقات امدادی اشیاء پر ہے۔ قبائلی علاقے کے لڑکے اور نوجوان جو مختلف بڑے شہروں میں گھریلو ملازم کے طور پر کام کرتے تھے۔ ان کے مالکان نے انہیں فارغ کر دیا ہے۔ عہدیدار کا یہ بھی کہنا ہے کہ علاقے کی بحالی اور ترقی ایک طویل المدتی پروجیکٹ ہے۔ اس کے لیے عزم واستقلال، سرمایہ کاری اور امداد کی فراہمی کی ضرورت ہے۔ بین الاقوامی برادری کو دل کھول کر امدادی رقوم فراہم کرنی چاہئیں۔ پاکستان اور دنیا کو فاٹا میں ناکام نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ناکامی علاقے میں شدید تباہی لائے گی۔ رقوم کے فقدان، چشم پوشی، دستیاب وسائل کے استعمال میں ناکامی، سرکاری انفراسٹرکچر کی تباہی نے معاشی سرگرمیوں کی سطح انتہائی کم کر دی ہے۔

فاٹا کا سرحد پار تجارت کے لیے اسٹرٹیجک محل وقوع اور اس علاقے کے لوگوں کی اسلحہ سازی میں مہارت ایک بڑی دولت ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اس علاقے کے لیے سرکاری اور نجی، قومی

اور بین الاقوامی سرمایہ کاری کے حصول کی کوششیں کرے۔ ایک صنعت کار سید عبداللہ نے کہا کہ فاٹا اسلحہ کے کارخانوں کے لیے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کرومیٹ، مینگنیز، ماربل، کوارٹز، سوپ اسٹون، تانبے، زمرد اور کوئلے کے قیمتی ذخائر موجود ہیں۔ یہ ٹیکس فری زون ہے اور یہاں سستی محنت بکثرت دستیاب ہے۔ سرمایہ کاروں کو یہاں آنا چاہیے۔

دلچسپی کی بات ہے کہ ماربل کی صنعت کو کسی مشکل صورتحال کا سامنا نہیں ہے اور ان کا کاروبار پروان چڑھ رہا ہے۔ ماربل انڈسٹریل ایسوسی ایشن کے سابق چیئرمین شاہد آر خان نے بتایا کہ ان کا فارمولا آسان ہے۔ وہ مقامی افراد کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں اور مصالحت کے جذبے کے تحت کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر کام کرتے ہیں۔ انہیں کسی مسئلے کا سامنا نہیں ہے۔ اگر قبائلیوں کو شراکت کی بنیاد پر شامل کر کے پروجیکٹس شروع کیے جائیں تو یقیناً کامیابی ہوگی۔ فاٹا سیکریٹریٹ نے پائیدار ترقیاتی پروگرام 2006-2015ء تیار کیا ہے۔ جس کا تخمینہ ایک کھرب 24 ارب روپے لگایا گیا ہے۔ یہ ایک اچھا آغاز ثابت ہو سکتا ہے۔

پلان میں 10 ارب روپے زراعت کے لیے 3 ارب صنعت کے لیے 5 ارب کان کنی کے لیے رکھے گئے ہیں 1000 کلومیٹر طویل سڑکوں کی تعمیر کے لیے 6 ارب 87 کروڑ روپے دو قبائلی بیلٹوں کو موثر رابطہ فراہم کرنے کے لیے ایکسپریس وے کی تعمیر کے لیے 19 ارب روپے رکھے گئے ہیں۔

(فروری 2010ء)

تیرا ہی دل نہ ہو تو بہانے ہزار ہیں

دنیا میں یہ اصول رائج ہے کہ قیمت صرف اسی چیز کی بڑھائی جاتی ہے جس کی خصوصیات بہتر و اعلیٰ ہوں، کوالٹی معیاری ہو، مارکیٹ میں وہ چیز با آسانی دستیاب اور ایک عام صارف کے لئے فائدہ مند ہو مگر ہمارے ملک میں الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ چیز کی کوالٹی خراب ہو، مارکیٹ سے نایاب ہو، لوگ حصول کے لئے مارے مارے پھر رہے ہوں تو سمجھ لیجئے کہ دام بڑھ گئے ہیں۔ دالیں، چاول، چینی، گھی، تیل، آٹا، غرضیکہ انسانی ضرورت کی وہ کونسی اشیاء ہیں جو وافر مقدار میں سستے داموں با آسانی مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ یہی حال گیس اور بجلی کا ہے، اکثر علاقوں میں گیس کی لوڈ شیڈنگ ہے اور کئی کئی گھنٹوں کے لئے بجلی غائب ہے، جبکہ بجلی کے نظام کا یہ حال ہے کہ ذرا سی تیز ہوا چلے تو تاروں کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، آندھی آئے تو بجلی غائب۔ گرمیوں میں تو لوڈ شیڈنگ تھی ہی، لیکن سرد موسم میں بھی آٹھ آٹھ گھنٹوں کی لوڈ شیڈنگ اب تو معمول کی بات بن گئی ہے، اس صورت حال میں ان گنت لوگ ذہنی مریض بن کر رہ گئے ہیں، لیکن اس سب کے باوجود دو طرفہ تماشہ دیکھئے کہ ایک طرف عوام لوڈ شیڈنگ کا عذاب بھگت رہے ہیں تو دوسری طرف بجلی کی نرخوں میں نہ رکنے والا اضافہ ایک ایسا ظلم ہے جس کی پاکستانی تاریخ میں نظیر ملنا مشکل

ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف عوام کو دینے کے لئے حکومت کے پاس بجلی نہیں ہے جبکہ دوسری طرف بجلی کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ کر کے ان کی زندگی اجیرن بنائی جا رہی ہے، حالت یہ ہو چکی ہے کہ 2008ء میں جو لوگ ایک ہزار روپیہ بجلی کا بل ادا کر رہے تھے، وہی لوگ آج ڈبل بل ادا کر رہے ہیں، ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس عرصہ میں کروڑوں لوگوں کی آمدنی میں ایک پائی کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ ایک بجلی کے بلوں پر ہی کیا موقوف صرف ایک سال کے عرصہ میں اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں اس قدر خوفناک اضافہ ہو چکا ہے کہ پہلے لوگوں کے صرف ہاتھ کانپتے تھے اب ان کی ٹانگیں بھی لرزنا شروع ہو گئی ہیں، اس کے باوجود مہنگائی، ذخیرہ اندوزی، امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورت حال اور بحرانوں کے بھنور میں جکڑے عوام پر حکومت کی جانب سے بجلی کی قیمتوں کے اضافے کا بم گرا دیا گیا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ یہ سب کچھ ایک ایسی جمہوری دور حکومت میں ہو رہا ہے جس کا بنیادی نعرہ روٹی کپڑا اور مکان کی فراہمی ہے لیکن حالات یہ ہیں کہ عوام کے منہ سے روٹی، تن سے کپڑا اور سر سے مکان کا سایہ بھی چھنتا جا رہا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ حکومت نے پہلے ہی آئی ایم ایف سے کئے گئے معاہدے کے تحت یکم جنوری 2010ء سے عوام پر ''بجلی بم'' گرانے کی تیاری کر لی تھی۔ ظلم تو یہ ہے کہ 12 فیصد اضافے کی زد میں وہ لوگ بھی آئے جو غربت کی سطح سے بھی بہت نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ موجودہ حکمرانوں نے دو سال قبل الیکشن مہم کے دوران یقین دہانی کرائی تھی کہ عوام کو کمر توڑ مہنگائی سے نجات دلائیں گے جبکہ 2009ء میں حکومت نے ایک وعدہ آئی ایم ایف سے بھی کیا تھا کہ بجلی کی قیمتوں میں بتدریج ہوش ربا اضافہ کر کے عوام کی کمر توڑ کر رکھ دے گی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ عوام سے کیا گیا وعدہ تو ایفا نہ کیا گیا لیکن آئی ایم ایف سے کیا گیا ہر وعدہ پورا کیا جا رہا ہے، جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ قرض کی اگلی قسط کی وصولی کے لئے حکومت آئی ایم ایف کی دست نگر اور مجبور

ہے، جبکہ عوام کی کمر اس لئے توڑی جا رہی ہے کہ وہ بے بس، کمزور اور مجبور ہیں۔ گویا اس ملک میں کمزور ہونا ایک جرم بن گیا ہے۔ یہ عجب ستم ظریفی ہے اگر ایک طرف حکومت عوام سے اپنے لئے حمایت مانگ رہی ہے اور یہ تقاضا کر رہی ہے کہ موجودہ حکومت کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں لیکن دوسری جانب وہ عوام کو دیوار سے لگا رہی ہے، یہ درست ہے کہ جمہوریت پاکستان کے لئے ناگزیر ہے، یہ بھی درست ہے کہ عوام آمرانہ دور کے غلط فیصلوں کی سزا بھگت رہے ہیں لیکن یہ جمہوریت کا کیسا عجب نمونہ ہے کہ جس میں عوام کی زندگی اجیرن ہوتی جا رہی ہے۔

یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ پہلے ہی صرف پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے سے عوام مہنگائی کے بوجھ تلے بری طرح دب چکے ہیں، اس کے باوجود بجلی کی قیمتوں میں حالیہ اضافے سے مہنگائی کا ایک ایسا طوفان آئے گا جس سے حکومت کے لئے بھی حالات پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا، موجودہ حالات میں مہنگائی کے اس طوفان اور مختلف اداروں کی اجارہ داری سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ عوام کا کوئی پرسان حال نہیں۔ صرف جاگیرداروں، سرمایہ داروں، سیاستدانوں، حکمرانوں اور لوٹ مار کرنے والوں کے لئے ہی تمام سہولیات میسر ہو سکتی ہیں۔ غریب عوام اس وقت اپنے آپ کو بالکل تنہا اور بے سہارا محسوس کر رہے ہیں اور مایوسیوں کی انتہا تک پہنچ چکے ہیں، چنانچہ ان حالات میں عوام یہ سوال کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ حکومت کہاں ہے اور حکومت کی وہ رٹ کہاں ہے جس کے تحت عوام کو تحفظ اور سہولیات میسر آتی ہیں۔ کیا عوام کے ان سوالوں کا جواب اور مشکلات کا تدارک حکمرانوں اور سیاستدانوں کے پاس ہے؟ کیا عوام کے نام پر سیاست کرنے والوں کی یہ ذمہ داری نہیں بنتی کہ وہ عوام کے سوالوں کا جواب دیں اور ان کی مشکلات کے خاتمے کے لئے عملی اقدامات کریں لیکن یہ تو جب ہی ممکن ہے جب حکمران اور سیاست دان اپنے قلعہ نما محلات سے باہر نکل کر دیہی علاقوں اور شہروں کی غریب بستیوں میں جا کر حالات معلوم کریں تو انہیں اندازہ ہو گا کہ عوام کی اکثریت کن مصائب اور مشکلات میں

زندگی بسر کر رہی ہے۔ آج یہی وہ عوامل ہیں جس کی وجہ سے مہنگائی، بے روزگاری اور غربت کے مارے افراد خودکشیوں اور جرائم کی طرف مائل ہو رہے ہیں، لوگوں کے کاروبار اور وسائل ختم ہوتے جا رہے ہیں اور مسائل بڑھتے جا رہے ہیں جبکہ دوسری طرف حکمران صرف آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی خوشنودی اور ان کی شرائط پوری کرنے کے چکر میں عوام کو زندہ درگور کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ حالات کب تک رہیں گے اور عوام کب تک اچھے وقت کی آس میں بھوک، افلاس، بے روزگاری اور بدامنی برداشت کرتے رہیں گے۔ آخر کبھی تو ان کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گا، اس وقت جو حالات پیدا ہوں گے، کیا حکمرانوں اور سیاستدانوں کو اس کا کچھ ادراک ہے کہ نہیں؟

غربت، بھوک اور بے روزگاری کے ہاتھوں ستائے ہوئے عوام کے لئے وہ دور کب آئے گا جب عوام کو حقیقی معنوں میں خوشیاں نصیب ہوں گی۔ آج 62 برس گزرنے کے بعد بھی قومی منظرنامہ یہ ہے کہ ہر آنے والی حکومت نے غریب عوام کے معیار زندگی میں تبدیلی لانے کے لئے عملی اقدامات کرنے کی بجائے صرف بلند بانگ دعووں، جھوٹے وعدوں اور کھوکھلے نعروں کی آڑ میں ان سے معمولی ریلیف بھی چھیننے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ آج حالت یہ ہے کہ مہنگائی اور بے روزگاری کے زخموں سے چور، سسکتے، بلکتے اور چیختے چلاتے عوام کی آہ و بکا نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہو رہی ہے، جبکہ دوسری طرف ہمارے حکمران مسلسل وہ اقدامات کر رہے ہیں جس سے عوام کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ کیا ہمارے حکمرانوں، سیاستدانوں اور پالیسی ساز اداروں کو ادراک نہیں کہ پاکستان کے عوام کس قدر مشکل حالات میں زندگی سے ناطہ جوڑے ہوئے ہیں۔ بے روزگاری، مہنگائی اور امن و امان کی ناقص صورت حال نے غربت میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے کہ کم آمدنی والا طبقہ مایوسیوں کی انتہاؤں تک پہنچ چکا ہے اور اپنے بچوں کی بھوک مٹانے کے لئے ہزار ہا کوششوں کے باوجود بھی ناکام ہوتا نظر آ رہا ہے۔ درحقیقت یہی وہ

عوامل ہیں جن کی وجہ سے مایوس افراد کا دھیان جرائم اور خودکشیوں کی طرف جاتا ہے۔ دولت اور وسائل کی ناجائز تقسیم نے ہمارے ملک میں افراتفری، انتشار اور نفرتوں بھرے جس ماحول کو جنم دیا ہے اس سے نکلنے میں ہمارے حکمران، سیاستدان اور قومی پالیسی ساز ادارے بری طرح ناکام ہو چکے ہیں اور ان کی کارکردگی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ارباب اقتدار غربت مٹانے کی بجائے ملک سے غریب مٹا رہے ہیں۔ اللہ نے پاکستان کو توانائی سے مالا مال کیا ہے لیکن ہمارے حکمرانوں کی ضد، ہٹ دھرمی اور ''میں نہ مانوں' کی پالیسی نے ہمیں برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

گزشتہ حکومتوں کے بار بار دعوے کے باوجود مقامی کوئلے سے چلنے والا ایک بھی پلانٹ قائم نہیں ہوا اور اب بھی اس کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ تھرکول اینڈ انرجی بورڈ (ٹی سی ای بی) دو ہزار چار سو میگاواٹ توانائی پیدا کرنے کے لئے چار پروجیکٹوں کی منظوری دے چکا ہے۔ جن میں ایک ہزار میگاواٹ کا پاور پلانٹ بھی شامل ہے جسے حکومت سندھ اور اینگرو کے مشترکہ منصوبے کے تحت قائم کیا جانا ہے۔

اینگرو کیمیکلز لمیٹڈ کے چیف ایگزیکٹو آفیسر اسد عمر کے مطابق ابھی اس سلسلے میں بہت سے چیلنجوں کا مقابلہ کرنا ہو گا اور ابھی تک کسی بھی پروجیکٹ کے آغاز کے لئے گراؤنڈ ورک تک نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں ماحولیاتی، انفراسٹرکچرل مسائل اور دیگر ٹیکنیکل اور آپریشنل چیلنجوں کے بارے میں بڑے پیمانے پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ 2016ء سے پہلے تھر کے کوئلے سے بجلی پیدا کئے جانے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

تھر کے کوئلے کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں مرطوب جز زیادہ ہے جس کے باعث یہ نقل و حمل کے لئے نامناسب ہے اور اس سے آسانی سے بجلی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ پھر پاور پلانٹ کو چلانے کے لئے مناسب مقدار میں پانی کی دستیابی کا مسئلہ ہے جبکہ آخری مسئلہ یہ ہے کہ تھر میں قائم نئے بجلی گھر کو نیشنل گرڈ سے منسلک کرنے پر بھاری اخراجات اور سخت جدوجہد کی

ضرورت ہوگی۔

قبل ازیں چین کی شین ہوا گروپ کارپوریشن تھر کول پروجیکٹ سے دستبردار ہوگئی ہے کیونکہ وہ بجلی کی پیداوار کے لئے ٹیرف نرخوں کو ناکافی سمجھتی ہے۔

کوگا انرجی لمیٹڈ نے حکومت سندھ کی جانب سے پیش کش کا ایک لیٹر ملنے کے بعد زیر زمین موجود کوئلے کی گیس سے چلنے والا 400 میگاواٹ کا بجلی گھر بنانے کا اعلان کیا ہے۔ دریں اثنا پلاننگ کمیشن بھی ایٹمی سائنس دان ثمر مبارک مند کی مدد سے دیسی ٹیکنالوجی کے استعمال کے ذریعے زیر زمین گیس سے چلنے والا 50 میگاواٹ کا ایک بجلی گھر تعمیر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

زیر زمین کوئلے کو گیس میں تبدیل کرنا (یو سی جی) ایک ایسا عمل ہے جس میں کوئلے کو آتش گیر مصنوعات (سائن گیس) میں بدلا جاتا ہے اور اس گیس کو بطور ایندھن یا کیمیکل استعمال کیا جاتا ہے۔ یو سی جی (انڈر گراؤنڈ کول گیسیفکیشن) سے کان کنی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے لئے خصوصی کول پراسیسنگ آلات اور گیسیفکیشن ری ایکٹر بھی درکار نہیں ہوتے۔

قابل ذکر تحقیق اور آزمائشوں کے باوجود یو سی جی پر مبنی کوئی تجارتی طور پر جاندار پروجیکٹ ابھی تک کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آیا ہے۔ یہ تحقیق یورپ، امریکہ، چین، سابق سوویت یونین اور آسٹریلیا میں کی جا چکی ہے۔

کوئلے سے بجلی پیدا کرنے کی ٹیکنالوجیز آزمودہ اور دنیا بھر میں عام ہیں۔ کوئلہ ان ممالک میں جہاں یہ بہت کم ملتا ہے یا یکسر مفقود ہے، محفوظ اور قابل بھروسہ سمجھا جاتا ہے۔ جاپان جہاں 28 فیصد بجلی کوئلے سے پیدا کی جاتی ہے۔ اسٹیم کوئلے کا سب سے بڑا درآمد کنندہ ہے۔ ڈنمارک میں بھی تقریباً 48 فیصد بجلی کوئلے سے پیدا کی جاتی ہے جو زیادہ تر درآمد شدہ ہوتا ہے۔

توانائی کی پیداوار میں کوئلے کے حصے کو بڑھانے کے لئے پیپلز پارٹی کی حکومت نے اگست 1995ء میں الیکٹرک پاور ایشیا کے ساتھ کیٹی بندر پروجیکٹ کے لئے معاہدہ کیا۔ یہ درآمد شدہ

کوئلے سے بجلی تیار کرنے کا منصوبہ تھا۔ پروجیکٹ کے 2001ء میں مکمل ہونے کی توقع تھی۔ اس سے کیٹی بندر پورٹ کمپلکس کی جلد از جلد تعمیر کی راہ بھی ہموار ہوسکتی تھی۔ تاہم 1996ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے تحلیل کر دیئے جانے کے بعد اس پروجیکٹ کو اسی بناء پر ترک کر دیا گیا کہ حکومت تھر کے کوئلے کے ذخائر استعمال کرنے کی بجائے کوئلہ درآمد کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

پاکستان کو سستی بجلی کی ضرورت ہے۔ یہ مقصد مقامی اور درآمد شدہ کوئلے سے چلنے والے بجلی گھر قائم کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حکومت نے ابھی تک اپنی توجہ تھر پر ہی مرکوز کر رکھی ہے اور وہ دوسرے آپشنز پر توجہ نہیں دے رہی ہے۔

دستیاب معلومات سے پتا چلتا ہے کہ لاکھڑا کے کوئلے کے ذخائر سے کام کرنے والے 450 میگاواٹ کے بجلی گھر کا قیام ایک قابل عمل آپشن ہے۔ لاکھڑا کول ڈیویلپمنٹ کمپنی لمیٹڈ (ایل سی ڈی سی) مکمل طور پر تیار کوئلے کی 44 کانوں کی مالک ہے جن میں ہر ایک روزانہ 40 تا 50 ٹن کوئلہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے جبکہ 39 کانوں کو ترقی دی جا رہی ہے۔ لاکھڑا کی کانوں سے کوئلے کی سالانہ اوسط پیداوار 10 لاکھ ٹن سے زائد ہے۔ یہ پیداوار زیادہ تر خانوٹ میں واپڈا کے پاور پلانٹ اور اینٹیں بنانے کی صنعت میں استعمال ہوتی ہے۔ 2008ء تک یہاں سے 30 لاکھ ٹن کوئلہ نکالا گیا تھا۔

سندھ کول اتھارٹی نے کوئلے کے پیمائش کردہ ذخائر کا اندازہ 24 کروڑ 60 لاکھ ٹن لگایا ہے۔ جب کہ لاکھڑا کول فیلڈ میں ایک ارب 32 کروڑ 80 لاکھ ٹن کوئلے کی موجودگی کی علامتیں موجود ہیں۔ تخمینوں کے مطابق 450 میگاواٹ بجلی تیار کرنے والے بجلی گھر کے لئے 30 سال تک 9 کروڑ ٹن جبکہ 150 میگاواٹ بجلی کے لئے 3 کروڑ ٹن کوئلے کی ضرورت ہوگی۔ ان اندازوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ 600 میگاواٹ کے بجلی گھر کو تیس سال تک چلانے کے لئے 12 کروڑ ٹن کوئلہ درکار ہوگا۔ جس کے لئے 16 کروڑ 20 لاکھ ٹن کوئلے کی ضرورت ہوگی۔

لاکھڑا کول فیلڈ ایک پکی سڑک کے ذریعے انڈس ہائی وے سے منسلک ہے جو دریائے سندھ کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ جا رہی ہے۔ مجوزہ پروجیکٹ ایریا سے 17 میل کے فاصلے پر خانوٹ گاؤں کے قریب ایک معیاری سنگل ریلوے لائن بھی موجود ہے۔ دریائے سندھ لاکھڑا کول فیلڈ کے مشرق میں 35 کلومیٹر کے فاصلے پر بہہ رہا ہے۔ خانوٹ کے قریب 25 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ہائی وولٹیج 132 کے وی پاور ٹرانسمیشن لائن بھی موجود ہے۔

درآمد شدہ کوئلے سے چلنے والے بجلی گھر مزید ایک آپشن ہے۔ ایسے پروجیکٹ تین تا چار سال میں مکمل ہو سکتے ہیں۔ ایک ہزار میگاواٹ بجلی کی تیاری کے لئے سالانہ تقریباً 50 لاکھ ٹن کوئلے کی ضرورت ہوتی ہے۔

کراچی پورٹ ٹرسٹ پہلے تیس لاکھ ٹن درآمد شدہ کوئلے کی ہینڈلنگ کر رہا ہے جو زیادہ تر پاکستان اسٹیل اور سیمنٹ کے بعض پلانٹوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تاہم کے پی ٹی کے ارد گرد گنجان آبادی کے باعث لوگوں کی صحت کو مضر اثرات سے بچانے کے لئے کم آبادی والی بندرگاہ پورٹ قاسم کو درآمدی کوئلے کی ہینڈلنگ کے لئے تیار کیا جانا چاہئے۔

کاش وہ دن آ جائیں جب ہم اپنے وسائل سے اپنے معاملات کو چلائیں اور سب سے پہلے واقعی پاکستانی بن کر معاملات کو سدھاریں۔

(فروری 2010ء)

OO

پانی پر صوبے آپس میں ٹکرا جائیں گے؟

پانچ سات سال پہلے جب کچھ محب وطن حلقوں کی طرف سے بھارتی آبی جارحیت پر احتجاج بلند ہوا تو بھارتی حکومت کے خرچے پر امرتسر دہلی اور ایک آدھ دوسرے کسی شہر میں گلچھرے اڑانے والے پاکستانی دانشوروں نے اسے پاک بھارت تعلقات میں رکاوٹ ڈالنے کا رجعت پسندانہ قدم قرار دے کر کہا تھا کہ یہ صرف دائیں جماعت کی انتہا پسند تنظیموں کا پراپیگنڈہ ہے۔ ان دنوں یہ خبر بھی سننے میں آئی کہ مقبوضہ کشمیر میں سرگرم مجاہدین نے دریائے جہلم پر بھارتی حکومت کی جانب سے سلال ڈیم بنانے کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا ہے لیکن نائن الیون کے بعد جیسے ہی ہم نے یوٹرن لیا۔ خصوصاً بھارت کو مقبوضہ کشمیر میں کھل کھیلنے کی جو آزادی میسر آئی۔ اس کا بھارتیوں نے انتہائی ناجائز فائدہ اٹھا کر پاکستان کے پانی پر ڈاکہ زنی کرتے ہوئے پاکستان کو قریباً قحط سے دوچار کرنے کا گھناؤنا منصوبہ بنا لیا ہے۔

عالمی بینک کے تحت 1960ء میں پنڈت جواہر لال نہرو، وزیر اعظم بھارت اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان کے درمیان سندھ طاس معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ جس کے مطابق دریائے سندھ، جہلم اور چناب کا پانی پاکستان کو ملنا تھا جب کہ دریائے راوی اور بیاس کے پانی کا

حقدار بھارت کو بنایا گیا۔ دریائے سندھ کا 20 فیصد پانی بھارت کو ملنا تھا۔ اور شرط یہ تھی کہ بھارت اس پر کوئی ڈیم نہیں بنائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت اس وقت دریائے سندھ پر تین ڈیم بنا ر ہے۔ جس سے پاکستان میں قحط سالی کا خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ ان میں سے پہلا ڈیم نیمو باز گو دوسرا ڈمخار اور تیسرا ڈیم لیہ خالصی باٹا لیک ہے۔ ان سے بھارت 200 میگاواٹ سے زیادہ بجلی حاصل کرے گا۔ بھارت نے حسب معمول اس معاہدے کی بھی خلاف ورزی کی اور مسلسل کرتا چلا آ رہا ہے۔ کئی مرتبہ اس مسئلے پر مذاکرات ہوئے لیکن ہر دفعہ بھارت کی ہٹ دھرمی آڑے آئی حت کہ کچھ بین الاقوامی ضمانت داروں نے بھی ان مذاکرات میں شمولیت کی۔ سوال اٹھتا ہے کہ ج معاہدہ ابتدائی برسوں میں منظور ہوا تھا آج تک اس کی پاسداری کیوں نہ کی گئی۔ کیا اسے پاکستا حکمرانوں کی بزدلی سے تعبیر کیا جائے کہ وہ اپنے جائز حق کے لئے بھی آواز نہ اٹھا سکے۔ اب ت نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں پاکستان کی طرف بہنے والے ہر دریا پر کئی کئی ڈیم بنالئے ہیں۔ یہاں تک کہ دریائے چناب کے بہاؤ کو کم یا زیادہ کرنے کا اختیار بھی اس کے پاس ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان 2000ء میں اس وقت تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ جب بھارت نے دریائے چناب پر بگلیہار ڈیم کی تعمیر شروع کی بلکہ 20-10 ڈیموں کی مزید منصوب بندی کر رکھی ہے اور دریائے جہلم پر کشن گنگا ہائیڈرو پاور بنانے کی تیاری کر چکا ہے۔ اس میں افسوسناک پہلو یہ ہے کہ کئی سال تک پاکستان غفلت میں پڑا رہا۔ دانستہ یا غیر دانستہ جو بے شک ناقابل معافی عمل ہے۔ پاکستان چونکہ ایک زرعی ملک ہے اور ہماری خوراک اور درآمدات کا 80 فیصد انحصار برآمدی مقاصد سے ہونے والی فصلوں پر ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھارت نے پاکستان کو بنجر بنانے کی منصوبہ بندی کر لی ہے۔ اس کوتاہی کی انکوائری ہونی چاہیے۔ پھر 2007ء میں پاکستان کی شکایت پر اس وقت تک سب کچھ بن چکا تھا۔ عالمی بینک نے پاکستان کے درج ذیل اعتراضات کو درست قرار دیتے ہوئے بھارت کو ہدایت جاری کیں کہ ڈیم

ں اونچائی ڈیڑھ میٹر کم کی جائے۔ ڈیم کے ذخیرے کی استعداد پچاس لاکھ کیوبک میٹر کم کی جائے ر اسے 37 ملین کیوبک میٹر کم کر کے 32 ملین کیوبک میٹر تک لایا جائے۔ بھارت کو توانائی اصل کرنے کے لئے مزید 3 میٹر اونچائی سے پانی لینا ہوگا۔ بجائے اس کے کہ ان تین تراضات کو دور کیا جاتا۔ بھارت نے اپنی روایتی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چناب کا نی بھی روک لیا۔ جس کی وجہ سے پنجاب میں کپاس اور گنے کی فصلیں بری طرح متاثر ہوئیں اور کستان کو 40 فیصد پانی کی کمی کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کے مرالہ، خانکی، ادر آباد اور تریمو برانچز سے نکلنے والی ہزاروں میل لمبی نہریں جو لاکھوں ایکڑ رقبے کو سیراب کر ہی تھیں قحط سالی اور غذائی بحران پیدا کرنے کا سبب بن گئیں۔ جس کی وجہ سے ضلع سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، جھنگ اور ساہیوال وغیرہ کے لاکھوں ایکڑ رقبے کے بنجر ہونے کا شدید خطرہ احق ہے۔ بھارت نے ہمارے بار بار کے احتجاج کو درخور اعتنا نہیں جانا۔

پاکستان کو اپنے مطالبات کے لئے اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے۔ جس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھارت کو سندھ طاس معاہدہ پر سختی سے عمل درآمد کروائے۔ اسی دوران پاکستان کو نام نہاد برٹش اہرین سے بھی گلوخلاصی کروائے اور ملک میں اپنے ماہرین تیار کرے۔ برٹش ماہرین کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتیں۔ اب تو سرعام یہ باتیں کہی جانے لگی ہیں کہ پاکستان میں پانی کی کمی کی وجہ سے قحط سالی کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے جب پانی نہیں ہوگا تو فصلیں نہیں ہوں گی ور جب فصلیں نہیں ہوں گی تو خوراک کی کمی پیدا ہوگی اور بجلی سے بھی بڑا بحران ہوگا۔ بھارت نے خفیہ طور پر مقبوضہ کشمیر میں چھوٹے بڑے 62 ڈیمز بنا رکھے ہیں اور بناتا چلا جا رہا ہے اور مکاری یہ ہے کہ پاکستان کی جانب بہنے والے دریاؤں اور ندی نالوں کا رخ بھارت کی طرف موڑتا چلا جا رہا ہے اور ہم ڈیموں پر صرف سیاست کر رہے ہیں۔ بھارت اپنی سازش میں کامیاب ہے اور پاکستان کو بنجر کرنے کے پروگرام پر کاربند ہے۔ زراعت کی بات تو الگ رہی اب تو ہمارے بڑے بڑے شہروں

میں پینے کے پانی کی بھی کمی دیکھی جا رہی ہے۔ ملک کے دارالحکومت کو ہی لیں۔ جہاں پینے کے پانی میں 40 فیصد کمی دیکھی جا رہی ہے اور پانی کی راشن بندی کی بھی خبریں ہیں۔ کچھ یہی حال لاہور میں بھی ہے۔ جہاں 3-4 گھنٹے پینے کا پانی مہیا ہوتا ہے اور لوگ اس کو بھی بجلی کی موٹروں سے کھینچنے پر مجبور ہیں۔ ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ بھارت ڈیمز بناتا رہا اور ہم خواب خرگوش کے مزے لوٹتے رہے۔

ہمارے اپنے خطے میں ہمارا دوست چین 95 بڑے ڈیمز بنا رہا ہے جن کی اونچائی 200 فٹ ہے۔ ہمارا دوسرا دوست ترکی 51 ڈیمز، ایران 48، جاپان 40 اور بھارت مزید 10 بڑے ڈیمز بنا رہا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کے موجودہ دو بڑے ڈیمز منگلا اور تربیلا ڈیمز اپنی عمر پوری کر چکے ہیں یا کرنے والے ہیں اور ان کی پانی ذخیرہ کرنے کی استعداد کم ہو چکی ہے اور یہ تقریباً مردہ لیول تک پہنچ چکے ہیں۔ جس کی وجہ سے 4 کروڑ ایکڑ زمین کے بنجر ہونے کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔ خوفناک پہلو یہ ہے کہ پاکستان میں فی کس پانی کی استعداد جو 1951ء میں 5200 کیوبک میٹر تھی۔ اس وقت 1100 کیوبک میٹر تک پہنچ چکی ہے اور 2025ء تک 550 کیوبک میٹر فی کس پہنچنے کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔ پھر جس رفتار سے ہماری آبادی بڑھ رہی ہے۔ اس کے حساب سے ہماری فی کس پانی کی استعداد 1951ء سے ڈبل ہونی چاہیے تھی لیکن سب کچھ اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ آپ کو یہ جان کر بھی دکھ ہوگا کہ ہماری 55 فیصد آبادی کو پینے کا پانی مہیا نہیں۔ بین الاقوامی خبروں کے مطابق بھارت پاکستان کو ایک اور جھٹکا دینے والا ہے۔ بھارت نے پنجاب کو بنجر کرنے کے لئے دریائے چناب پر ''پاکل ڈل'' (PAKAL DUL) ڈیم بنانے کی منصوبہ بندی کر لی ہے۔ جو سائز میں بگلیہار سے تین گنا بڑا ہوگا۔ اس ڈیم کی وجہ سے چناب کا 30 لاکھ ایکڑ فٹ پانی سالانہ کم ہو جائے گا۔ اس منصوبے کا محل وقوع جموں کشمیر کشتوار نیشنل پارک ہے۔ اس سے پہلے چناب کا بہاؤ پہلے ہی 24 فیصد کم ہو چکا ہے۔ پہلے ہی پاکستان میں پانی کی کمی 40-30 فیصد تک کم ہو چکی ہے جو کم بارشوں کی وجہ سے 50 فیصد تک جا سکتی ہے۔ کارگل کے مقام پر بھارت نے زیر

زمین قریباً 35 کلومیٹر لمبی سرنگ کھود کر دریائے سندھ کا رخ موڑنے کا گھناؤنا منصوبہ بنا رکھا ہے۔

پاکستان واٹر فرنٹ نے بھارت کی طرف سے پانی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے خلاف قومی بلکہ عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے تحریک چلانے کا اعلان کیا ہے۔ جس کا بنیادی مقصد پاکستان کے اندر اس ٹیکنیکل مسئلہ کو غیر سیاسی انداز میں بھارت کی آبی جارحیت کے بارے میں امریکہ اور دوسرے اہم ملکوں کو آگاہ کرنے کے لئے تمام اداروں اور قوتوں کو مستحکم کرنے کے لئے ایک حکمت عملی تشکیل دینا ہے جبکہ ایوان صنعت وتجارت میں قائم ہونے والے اس فرنٹ نے پہلے فیڈریشن چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری اور زرعی تنظیموں جن میں پاکستان ایگری فورم، متحدہ کسان محاذ، فارمرز ایسوسی ایشن آف پاکستان اور کسان بورڈ وغیرہ شامل ہیں، کے نمائندوں کو پہلے ہی آن بورڈ کر لیا ہے۔ پاکستان واٹر فرنٹ کے کنوینر شہزاد علی ملک نے اس سلسلہ میں ہونے والے اجلاس کے دوران بتایا کہ بھارت 120 ارب ڈالر کی لاگت سے بڑے آبی ذخیرے تعمیر کر رہا ہے۔ یہ منصوبے 2016ء میں مکمل ہوں گے۔ انہوں نے خبردار کیا کہ بھارت ہمسایوں ملکوں چین، بنگلہ دیش اور بھوٹان کے ساتھ پہلے ہی پانی کے تنازعات موجود ہیں اور اب پاکستان کے خلاف اس نے آبی جارحیت شروع کر رکھی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بھارت کا یہ معاندانہ رویہ 1948ء سے چل رہا ہے۔ پاکستان کے وجود کو ختم کرنے کے لئے بھارت منصوبے بنا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں عالمی بینک کے ایک ماہر ڈیوڈ للی انتھل نے اپنی ایک رپورٹ میں 1948ء میں خبردار کیا تھا کہ وہ تمام دریا جن پر پاکستان کا انحصار ہے۔ پاکستان کے لئے زندگی کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ تمام دریا بھارت اور کشمیر سے نکلتے ہیں اور پانی کے بغیر ایک ہفتہ کے دوران پاکستان کی دو کروڑ ایکڑ اراضی خشک ہو جائے گی اور کئی کروڑ افراد قحط سالی کا شکار ہو جائیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ دنیا کی کوئی فوج بموں اور شیل فائر کے ذریعہ اس طرح دوسری قوم کو تباہ نہیں کر سکتی۔ جس طرح بھارت پاکستان کے لئے دریاؤں کے پانی کو روک کر اسے تباہ کر سکتا ہے۔

بحیثیت پاکستانی ہمیں اپنے اندر بھی جھانکنا چاہیے کہ جو قوتیں پاکستان میں پانی کے ذخیرہ گاہوں کے قیام کو روکنے کے لئے کوششیں کر رہی ہیں۔ انہیں بھی اس بارے میں سوچنا چاہیے کہ ان کی بقاء پاکستان کی بقاء سے وابستہ ہے۔ ان کی کوششوں سے اگر پاکستان کے دشمنوں کو فائدہ ملے تو وہ کس کے لئے کام کر رہے ہیں؟ اس سے بھارت میں ڈیم تعمیر کرنے والی قوتوں کو تقویت حاصل ہو رہی ہے۔ پاکستان کے اندر تو نئی آبی ذخیرہ گاہوں کے لئے اتفاق رائے ہو نہیں رہا اور وہ اپنے حریف ملک کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ صورتحال تمام سیاسی اور غیر سیاسی قوتوں کو ملک کی بقاء کو درپیش خطرات سے نمٹنے کے لئے متحدہ ہونے کا سبق دے رہی ہے۔ کیا ہم اس سے بحیثیت قوم سبق حاصل کریں گے؟

انڈس ریور سسٹم اتھارٹی (ارسا) کی طرف سے پنجاب کے لئے چشمہ جہلم لنک کینال کھولنے کے فیصلے اور پنجاب کی طرف سے حصہ سے زیادہ پانی کے استعمال پر بلوچستان اور سندھ نے تحفظات کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ پنجاب کو ہم نے خیر سگالی کے جذبے کے تحت حصہ سے زیادہ پانی استعمال کرنے دیا لیکن اب وہ وعدے کے مطابق ہمیں پانی نہیں دے رہا۔ ارسا کے فیصلے کے مطابق چشمہ جہلم لنک کینال کھولنے کے بعد اب پنجاب دریائے سندھ سے روزانہ 6 ہزار کیوسک پانی حاصل کرے گا۔ اسی دوران پنجاب کے وزیراعلیٰ شہباز شریف کا بیان بھی سامنے آیا۔ جس میں انہوں نے پانی پر پنجاب کے حق سے کسی بھی طور پر دستبردار نہ ہونے کا اعلان کیا۔ مبصرین کے مطابق ان کا یہ بیان سندھ اسمبلی میں بعض ارکان کی جانب سے پنجاب پر پانی کی چوری کے الزام کے ردعمل میں سامنے آیا۔ سندھی ارکان کے اس الزام پر پنجاب اسمبلی میں شدید ناراضگی کا اظہار ہوا تھا۔ دوسری جانب وفاقی وزیر پانی و بجلی راجہ پرویز اشرف نے وزیراعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ سے ملاقات کر کے انہیں یقین دہانی کرائی ہے کہ سندھ کو اس کے حصے کا پانی فراہم کیا جائے گا۔ اس ملاقات سے قبل وزیر اعلیٰ سندھ نے گڑھی خدا بخش میں گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا چشمہ کینال سے پنجاب کو پانی کی فراہمی پانی کے تنازع کے حل کے لئے 1991ء کے معاہدے کے برخلاف ہے۔ جس میں چشمہ کینال کا

ذکر ہی نہیں۔ یاد رہے کہ سندھ کابینہ کی ایک وزیر نے دو روز قبل چشمہ کینال سے پنجاب کو پانی کی فراہمی پر سخت احتجاج کرتے ہوئے اس فیصلے سے ملک کی جغرافیائی حدود کو خطرہ پیدا ہونے کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ صوبوں کے درمیان پانی پر یہ جوتم پیزار ایک ایسے اس وقت میں جاری ہے جب بھارت کی جانب سے پاکستانی حکومت اس پر خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صوبائی حکومتیں پانی کے مسئلے پر آپس میں الجھنے کی بجائے مل کر وفاقی حکومت پر دباؤ ڈالیں کہ وہ پاکستان کے خلاف بھارت کی آبی جارحیت کا مؤثر جواب دے اور پاکستانی دریاؤں کا رکا ہوا پانی بازیاب کروایا جائے۔ صوبوں کے درمیان پانی کی تقسیم سے متعلق فنی نوعیت کے تنازعات کے حل کے لئے اسی طرح سنجیدہ مذاکرات کئے جانے چاہئیں۔ جس طرح قومی مالیاتی ایوارڈ کی تشکیل اتفاق رائے سے کی گئی۔ ساتھ ساتھ صوبوں کو ملک میں نئے آبی ذخائر کی تعمیر کے حوالے سے بھی مل بیٹھ کر کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے۔ ورلڈ بینک کے ماہر پانی و بجلی انجینئر ڈیوڈ للی نے بھارت کی طرف سے ہونے والی آبی جارحیت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ بھارت کی طرف سے منصوبے مکمل ہونے پر صرف ایک ہفتہ پاکستان کا پانی روکنے سے پاکستان کی 2 کروڑ ایکڑ اراضی بنجر ہو جائے گی۔ آج ہمارے صوبے ایک دوسرے سے اس مسئلے پر لڑ جھگڑ رہے ہیں اور بظاہر بھارتی سازش کامیاب ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ پانی کسی بھی قوم کی زندگی موت کا مسئلہ ہوتا ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی تہذیبیں پانی کی کمی سے کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ بھارتی حکمرانوں نے نہ صرف ہمارا پانی روک کر پاکستانی زراعت کے کلیجے میں زہریلا خنجر گھونپا ہے بلکہ اس مسئلے پر صوبوں کو بھی آپس میں لڑانے جا رہے ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ پاکستان تمام مصلحتیں ایک طرف رکھ کر ساری قوم اس مسئلے کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے بھارت سے اپنا حق حاصل کرے بصورت دیگر پاکستان معاہدہ سندھ طاس سے علیحدگی کا اعلان کرے ورنہ ایتھوپیا بننے کے لئے تیار رہے۔

(مارچ 2010ء)

پاکستان برائے فروخت نہیں!

یوں تو ہماری حکومتی پالیسیوں کی وجہ سے ہر نیا دن اس مملکت خداداد کے بے بس اور بے کس عوام پر نئی بجلی گراتا طلوع ہوتا ہے کبھی پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں کا عذاب نازل ہوتا ہے کبھی بجلی، گیس کے ریٹس کلیجے پر چھری چلاتے ہیں اور کبھی پاکستان کی بے گناہ بیٹی عافیہ صدیقی کے ساتھ امریکی انصاف کا منہ کالا ہوتا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے حکومت نے پاکستانی وسائل کی بھی لوٹ سیل لگا رکھی ہے اور خود کو روشن خیال ثابت کرنے کے لئے ایسے جارحانہ اقدامات کئے جاتے ہیں کہ کلیجہ کٹ کر رہ جاتا ہے۔ ان میں افغان ٹرانزٹ ٹریڈ بھی شامل ہے۔ جس سے پاکستانی معیشت کو سالانہ ڈھائی ارب ڈالر کا ٹیکہ لگ رہا ہے۔

افغانستان پر روسی یلغار، لاکھوں مہاجرین کی میزبانی، طالبان حکومت کے خاتمے کے لئے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی فوج کشی اور بعد میں دہشت گردی کے خلاف جنگ نے صوبہ سرحد کی معیشت اور انفراسٹرکچر کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ پورے صوبے اور اس کے ساتھ ملحقہ قبائلی علاقوں میں ہونے والے خودکش حملوں اور بم دھماکوں میں جاں بحق اور زخمی ہونے والوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ ہزاروں بچے یتیم ہو چکے ہیں۔ آتش و آہن کی بارش رکی نہیں جنازے اب

بھی اٹھ رہے ہیں۔ صوبہ سرحد جو اپنے مخصوص جغرافیہ کے باعث صنعت و تجارت کے شعبے میں دوسرے صوبوں سے پیچھے رہا۔ افغانستان کے واقعات اور افغان مہاجرین کے قیام سے مزید پیچھے چلا گیا ہے۔ بڑی تعداد میں مہاجرین سرکاری حکام کی ملی بھگت سے نہ صرف یہاں کی شہریت حاصل کر چکے ہیں بلکہ ٹرانسپورٹ اور ہوٹل انڈسٹری سمیت مجموعی کاروبار پر بھی قابض ہیں۔ صوبہ سرحد کے ساتھ پاکستان کی مجموعی معیشت کو ایک بڑا نقصان افغانستان کے ساتھ ٹرانزٹ ٹریڈ کے حوالے سے اٹھانا پڑ رہا ہے۔ ٹرانزٹ ٹریڈ ایک عالمی اصطلاح ہے۔

اس میں وہ ملک جس کے پاس اپنی بندرگاہ نہ ہو اپنے قریبی ہمسایہ ملک کی پورٹ پر مال تجارت درآمد کرتا ہے۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے تحت درآمد ہونے والی اشیاء پر کوئی ڈیوٹی نہیں لگتی جبکہ حکومت پاکستان اپنی ضروریات کے لئے درآمد کی جانے والی اشیاء پر 35 سے 40 فیصد ٹیکس وصول کرتی ہے۔ ہماری بزنس کمیونٹی کسٹم اور دوسرے ذمہ دار اداروں کے ساتھ مل کر افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کی آڑ میں آنے والے مال تجارت کو بغیر کوئی ڈیوٹی ادا کئے مقامی مارکیٹ میں رکھ دیتی ہے جس سے حکومت کو محصولات کی مد میں ہر سال 2 سے ڈھائی ارب ڈالر کا نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ فیڈرل بورڈ آف ریونیو کے چیئرمین سہیل احمد نے گزشتہ روز فنانس سے متعلق قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی کو بتایا کہ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کی آڑ میں 4 سے 5 ارب ڈالر کی اشیاء سمگل ہو رہی ہیں۔ جس سے ہماری معیشت بھاری نقصان سے دوچار ہے۔ قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی کے اجلاس کی کارروائی اور نجی ٹی وی کی ایک خصوصی رپورٹ کے نتیجے میں جو حقائق سامنے آئے ہیں۔ ان کے مطابق 3 کروڑ کی آبادی والے ملک افغانستان کے لئے جو جنگ سے تباہ حال ہے اور وہاں غربت کی شرح بھی زیادہ ہے۔ سترہ کروڑ آبادی والے ملک پاکستان سے زیادہ الیکٹرانکس کی مصنوعات، خوردنی تیل اور دیگر اشیاء درآمد ہو رہی ہیں۔ کسٹم حکام کے مطابق افغانستان کے لئے الیکٹرانک مصنوعات اور خوردنی تیل کے ساتھ زیادہ منگوائی جانے والی اشیاء میں چائے، ٹائر، کپڑا اور دیگر

سامان شامل ہے۔ یہ تمام چیزیں افغانستان جانے کی بجائے پاکستان میں فروخت ہوتی ہیں۔ اس سے ملک کو ریونیو کی مد میں نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اس نقصان کا اعتراف ایف بی آر کے چیئرمین خود قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی کے سامنے کر رہے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کئی دہائیوں سے جاری اس نقصان کو روکنے کے لئے کوئی ٹھوس اور مؤثر حکمت عملی کیوں نہیں اپنائی جا سکی۔ ہمارے ادارے سرعام فروخت ہونے والے غیر ملکی کپڑے اور دیگر اشیاء کو مارکیٹ پہنچنے سے کیوں نہیں روک پا رہے جبکہ دوسری جانب افغانستان کا امپورٹ آرڈر چیک کرنے کا کوئی انتظام ہی نہیں۔ ملکی معیشت کو اس وقت سنگین چیلنجوں کا سامنا ہے۔ پورے ملک خصوصاً صوبہ سرحد میں صنعتیں بحران کا شکار ہیں۔ ایسے میں سمگل شدہ سامان کی کھلے عام فروخت مقامی صنعت کو بری طرح متاثر کر رہی ہے۔

رکن پارلیمان خرم دستگیر خان نے معاون وزیر مالیات حنا ربانی کھر سے سوال کیا کہ پاکستان کے راستے افغانستان پر قابض ناٹو افواج کو بھارت سے رسد اور دیگر ساز و سامان کیوں جا رہا ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ سلسلہ تو افغانستان پر امریکی حملے کے دن سے جاری ہے اور بھارت کا مال پاکستان کی بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں پر اتار کر افغانستان میں ناٹو افواج کو بھیجا جاتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ 1965ء کے افغانستان پاکستان راہداری کے معاہدے کا اطلاق بھارت پر اس لیے نہیں ہوتا کہ یہ دو طرفہ معاہدہ ہے جبکہ بھارت کا سامان پاکستان کے راستے افغانستان لے جانے کے لیے مشرف حکومت اور ناٹو کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ جس کی رو سے پاکستان کسٹم کا عملہ اسے نہ تو کھول کر دیکھ سکتا ہے نہ اس پر محصول عائد کر سکتا ہے۔ نیز ناٹو درآمد کردہ بھارتی سامان کی تفصیل بتانے کا بھی پابند نہیں ہے۔ وزیر موصوف نے یہ بھی بتایا کہ یہ معاہدہ وفاقی محکمہ محصولات، وزارت دفاع اور وزارت تجارت کے باہم مشورے سے کیا گیا تھا۔ موجودہ حکومت نے اس معاہدے کو جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔ (ڈان یکم فروری 2010ء)

تازہ ترین اطلاع کے مطابق ابھی حال ہی میں جو کھیپ بھارت سے افغانستان بھیجی گئی تھی،

اس میں ٹاٹا کی تیار کردہ 66 نشستوں والی بس بھی تھی مگر اس کی بجائے یہ درج تھا۔ ISAF اور NATO کو مطلوب ضروری سامان (ڈان یکم فروری 2010ء) گو ہمیں اس کا علم نہیں تھا لیکن ہمیں اس خبر پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ پاکستان کو تو حکمران ٹولے نے اسلام کے قلعہ کی بجائے استعمار کا اڈہ بنا دیا ہے۔ یہ سلسلہ تو اس روز سے چل رہا ہے۔ جب 17 مئی 1954ء کو پاکستان کے حکمرانوں نے امریکہ کے ساتھ باہمی امداد کا معاہدہ کیا تھا۔ اس کے بعد 8 ستمبر 1954ء کو پاکستان کابینہ کی منظوری کے بغیر پاکستان کے نادان وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے منیلا میں جنوبی مشرقی ایشیائی معاہدے پر دستخط کر دیئے تھے۔ گو یکم اکتوبر کو اس وقت کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے اپنی ریڈیائی تقریر میں اس بات کی نشاندہی کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ نہ معلوم کیوں وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے نیٹو کے معاہدے پر دستخط کر دیئے، لیکن یہ سب ملی بھگت تھی۔ اگر واقعی پاکستان کابینہ چاہتی تو اس معاہدے کو مسترد کر دیتی یا پارلیمان اسے مسترد کر دیتی لیکن پارلیمان میں سوائے مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ (بھاشانی گروپ) کے سب نے ان معاہدوں کی حمایت کی تھی حتیٰ کہ عوامی لیگ کے رہنما اور 1957ء میں پاکستان کے وزیر اعظم حسین شہید سہروردی تک نے ان معاہدوں کی حمایت کی تھی۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اس بہانے پاکستان کو جدید ترین اسلحہ حاصل ہو جائے گا اور جہاں تک اسلحہ کے استعمال کا تعلق ہے تو اگر پاکستان پر بھارت حملہ کرتا ہے تو ہم یہ نہیں دیکھیں گے کہ امریکی امداد میں دیا گیا اسلحہ معاہدے کی رو سے صرف اشتراکی ممالک کی جارحیت کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بھارت کے خلاف نہیں لیکن پاکستان کے بعض محب وطن رہنما اس معاہدے کے خلاف تھے۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ پاکستان کو سوویت یونین اور عوامی جمہوریہ چین سے کوئی خطرہ نہیں ہے جبکہ بھارت نے بین الاقوامی معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کشمیر پر قبضہ کر لیا ہے اور اس نے 1950ء میں پاکستان کی سرحدوں پر اپنی 90 فیصد فوج صف آرا کر دی تھی۔

ان رہنماؤں نے اس بات پر خاص طور سے اعتراض کیا تھا کہ اس معاہدے کے تحت پاکستان نے امریکہ کو اپنی سرزمین پر فوجی اڈے دے دیئے ہیں جو سوویت یونین اور چین کے خلاف استعمال ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس صورت میں ان ممالک کے پاکستان کے ساتھ تعلقات متاثر ہو سکتے ہیں۔ ان رہنماؤں میں مغربی پاکستان میں میاں افتخارالدین، خان عبدالغفار خان، عبدالصمد خان اچکزئی محمود الحق عثمانی جبکہ مشرقی پاکستان سے مولانا عبدالحمید بھاشانی اور ان کے متعدد ہمنوا شامل تھے۔ اگر اس زمانے کے پاکستان ٹائمز، امروز اور ہفتہ وار جریدہ لیل و نہار کے شمارے دیکھے جائیں تو ان کی خبروں کی سرخیاں، ان کے اداریے اور ان کے مضامین ان فوجی معاہدوں پر نکتہ چینی سے بھرے پڑے ہوں گے۔ لیکن اردو اور انگریزی کے ایسے بھی کثیر الاشاعت روزنامے ہیں جو ان معاہدوں کے حق میں رطب اللسان تھے اور اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ جدید امریکی فوجی ساز و سامان کے ذریعے وہ کشمیر کو بھارت سے آزاد کرالیں گے لیکن جب ستمبر 1965ء میں ہند پاک جنگ ہوئی جو کشمیر سے شروع ہوئی تھی تو امریکہ اور جنوبی مشرقی ایشیائی معاہدے SEATO نے پاکستان کی اس بات پر مذمت کی کہ وہ امریکی سامان حرب بھارت کے خلاف استعمال کر رہا ہے جبکہ یہ اسلحے اسے پاکستان پر سوویت یونین اور عوامی جمہوریہ چین کے حملے سے دفاع کے لیے دیئے گئے تھے۔

اس جنگ میں لطف کی بات یہ تھی کہ جب امریکہ نے اس بنا پر پاکستان کی امداد بند کر دی تو جنگ میں تباہ شدہ ٹینکوں، توپوں اور جہازوں کی مرمت کے لیے کل پرزے دستیاب نہ ہو سکے اور پاکستان کو مجبوراً جنگ بند کر کے بھارت سے 10 جنوری 1966ء کو تاشقند معاہدہ کرنا پڑا۔ جس کے باعث پاکستان اپنے جنگی مقصد یعنی کشمیر کو آزاد کرانے میں ناکام رہا۔

امریکہ نے 1960ء میں حکومت پاکستان کے علم میں لائے بغیر بڈبیر کے فضائی اڈے سے سوویت روس میں جاسوس طیارے U2 کی پروازیں بھیجنی شروع کر دیں۔ جن میں سے ایک

جاسوس طیارہ مار گرایا گیا اور اس کا پائلٹ FRANCIS GARRY POWERS زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ جس نے انکشاف کیا کہ یہ طیارہ بڈبیر کے اڈے سے مسلسل جاسوسی مہم پر سوویت یونین کی فضائی حدود میں داخل ہو کر اس کی دفاعی تنصیبات کی تصویریں اتارا کرتا تھا۔ اس وقت کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل نکیتا خروشیف نے اپنے ملک میں متعین پاکستان اور افغانستان کے سفراء کو طلب کر کے افغانستان کے سفیر سے مخاطب ہو کر سوال کیا کہ پشاور کہاں ہے؟ اس وقت افغان سفیر نے مبینہ طور پر نقشے کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ پختونستان میں۔ واضح رہے کہ افغانستان نے شمال مغربی سرحدی صوبے اور پشین، ژوب، کوئٹہ پر دعویٰ کیا تھا کہ یہ اس کے حصے ہیں۔ جو یا تو آزاد کیے جائیں یا افغانستان کے حوالے کر دیئے جائیں۔ اس زمانے میں سوویت روس پاکستان اور امریکہ کے فوجی معاہدے کی وجہ سے آزاد پختونستان کی حمایت کرتا تھا۔ قصہ کوتاہ خروشیف نے پاکستان کے سفیر کو دھمکی دی کہ اگر آئندہ اس کی سرزمین سے امریکی جاسوسی طیارہ سوویت روس کی فضائی حدود میں داخل ہوا تو پشاور کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا۔

اس وقت پاکستان کے آمر کی آنکھیں کھلیں کہ اپنی سرزمین پر کسی ملک کو اڈے فراہم کرنا کتنی بڑی غلطی ہے اور انہوں نے حتی المقدور اس کی تلافی کی کوشش بھی کی اور اپنی کتاب ''دوست نہ کہ آقا'' میں آزاد خارجہ پالیسی اپنانے کا عزم کیا۔ ایوب خان نے مارچ اپریل 1968ء میں بڈبیر کا فوجی اڈہ امریکیوں سے خالی کرا لیا، جبکہ ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو متوازن کرتے ہوئے روس سے بہتر تعلقات پیدا کیے اور مشرقی یورپ کی کمیونسٹ ریاستوں اور ویتنام کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کیے۔ موجودہ حکومت جو دن رات ''جئے بھٹو'' کے نعرے حلق پھاڑ پھاڑ کر لگاتی ہے۔ جس طرح امریکہ کی جھولی میں گری ہے۔ کیا اس سے بھٹو شہید کی روح کو خوشی ہوتی ہوگی؟ خدارا پاکستان کی سالمیت سے مذاق بند کریں۔ قبل اس کے کہ مکافات عمل وقوع پذیر ہو اور آپ کے پاس فرار کا کوئی راستہ ہی باقی نہ رہ جائے؟

(مارچ 2010ء)

بجلی کی قیمتوں میں اضافہ

نئے سال کا آغاز گیس اور بجلی کی قیمتوں میں اضافے سے ہوا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب
ملک پہلے ہی ہوش ربا گرانی اور بجلی کے مسلسل بحران کی گرفت میں ہے۔ گیس اور بجلی کی قیمتوں میں
بالترتیب 18 اور 12 فیصد ہونے والا اضافہ ملک میں مہنگائی کے ایک اور سیلاب کا سبب
جائے گا۔

تاجر، صنعتکار اور کاشتکار بجلی کی قیمتوں پر بالعموم اور عوام الناس بالخصوص احتجاج کر رہے ہیں
لیکن پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) کے احکامات کی تعمیل
کرتے ہوئے عوام کی زندگی مزید اجیرن بنانے پر تلی ہوئی ہے۔

کنزیومر پرائس انڈیکس (سی پی آئی) جو افراط زر کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگلے دو ماہ
دوران پھر تیزی سے اوپر جانے لگا۔ ملک میں افراط زر 22 ماہ کے بعد کم ہو کر اکتوبر 2009ء میں
8.87 رہ گیا تھا۔ جب کہ جنوری 2008ء میں یہ اپنی بلند ترین سطح یعنی 25 فیصد پر تھا۔

پٹرولیم مصنوعات کی بلند تر قیمتوں کے باعث ملک کی مائیکر اور میکرو معیشت پہلے ہی عدم
توازن کی شکار ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے بجلی اور گیس کی قیمتوں میں آئی ایم ایف
کے، جس نے پاکستان کو ادائیگیوں کے توازن کے تصفیئے کے لیے قرضہ دیا ہے۔ دباؤ کے تحت

اضافہ کیا ہے۔ بجلی کی پیداواری لاگت گھریلو، تجارتی اور صنعتی مقاصد کے لیے اس کی قیمت
فروخت کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ جس کے باعث توانائی کا شعبہ بجلی کی تیاری پر آنے والی
لاگت اور اس قیمت فروخت کے درمیان فرق کم کرنے پر مجبور ہے۔ تاہم ان اقدامات کے
مناسب منصوبہ بندی، مہارت اور بدعنوانی کے خاتمے کے بغیر مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔

سابق پاکستان الیکٹرک پاور کمپنی (پیپکو) کے سربراہ منور بصیر نے کہا ہے کہ بجلی اور گیس کی
قیمتوں میں اضافے سے قیمتوں کا فرق کم کرنے میں مدد نہیں ملے گی کیونکہ سرکاری ادارے اور
تجارتی صارفین طویل عرصے سے اپنے بجلی کے واجبات ادا نہیں کر رہے۔

بجلی پیدا کرنے والے اداروں کو نقصان کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ جس کے باعث وہ
ملک بھر میں اپنا کام انجام دینے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں۔ انہوں نے بجلی کے واجب الادا
بلوں کی سرکاری نجی اداروں کی جانب سے ادائیگی کے لیے سخت اقدامات کا مشورہ دیا اور کہا کہ اگر
ایسا نہ کیا گیا تو اس کا خمیازہ وہ غریب عوام بجلی اور گیس کی قیمتوں میں اضافے کی صورت میں بھگتتے
رہیں گے۔ جن کے بجلی کے بل صرف ایک سال میں دگنے ہو گئے ہیں۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ بجلی کی چوری میں ہر سطح پر اضافہ ہو جائے گا کیونکہ صارفین کی اکثریت
موجودہ مہنگائی کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ بجلی کے گھریلو صارفین کو بجلی
کی اضافی قیمتوں کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا جانا چاہیے۔ جب کہ سرکاری اور تجارتی صارفین سے
بجلی کے درجات کی وصولی ہنگامی بنیادوں پر کی جائے۔

ملک کو توانائی کے سنگین بحران کا سامنا ہے۔ شہری اور دیہی علاقوں میں 4 تا 6 اور 8 تا 10
گھنٹوں کی لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہے۔ دوسری جانب سی این جی سیکٹر میں گیس لوڈ مینجمنٹ کے تحت
بالخصوص ملک کے شمالی علاقوں میں سی این جی اسٹیشن بند کر دیے گئے ہیں۔ بین الاقوامی مارکیٹ
میں کروڈ آئل کی قیمت 80 ڈالر کے قریب منڈلا رہی ہے۔ جس کا براہ راست اثر پیٹرولیم کی
مصنوعات کی مقامی قیمتوں پر پڑ رہا ہے۔ جو عوام کی اکثریت کی پہنچ سے باہر ہیں۔ یہ سہ جہتی دباؤ

توانائی کے ذرائع بجلی اور گیس کی ناکافی سپلائی کے نتیجے میں دگنا ہو گیا ہے۔ جو پیداواری لاگتوں میں مزید اضافے کا سبب بنے گا۔

ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن اور سابق گورنر اسٹیٹ بینک عشرت حسین کا خیال ہے کہ اہم میکرو اکنامک انڈیکیٹرز تسلی بخش حالت میں ہیں لیکن رواں مالی سال کے باقی چھ مہینوں میں ان کے استحکام اور شرح نمو اوپر لے جانے کے لیے ملک میں توانائی کی سخت ضرورت ہے۔ بین الاقوامی منڈیاں پاکستانی مصنوعات کی منتظر ہیں۔ اب یہ پالیسی سازوں، بیوروکریٹس اور تاجروں پر منحصر ہے کہ وہ ایسی حکمت عملیاں اور میکانزم وضع کریں جو ملکی معیشت کا سبب بنے۔

اگر حکومت، 31 دسمبر 2009ء تک لوڈ شیڈنگ میں خاتمے میں ناکامی کے بعد اپنے الفاظ کا پاس کرتے ہوئے 5 ہزار میگاواٹ بجلی کی کمی دور کر سکے تو یہ ایک معجزہ ہی ہوگا۔ اس کی جانب سے رینٹل پاور پروجیکٹوں کے حصول کی کوششوں پر سرکاری اور نجی سیکٹروں کی جانب سے نکتہ چینی کا سلسلہ جاری ہے۔ امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورتحال اور سیاسی عدم استحکام اب بھی غیر ملکی اور مقامی سرمایہ کاروں کے لیے باعث تشویش ہے۔ بجلی کی قیمتوں میں اضافہ اور کرائے کے بجلی پلانٹس کا تعارف بجلی کی کمی سے نمٹنے کا محض ایک عبوری اور مہنگا طریقہ ہے اور توانائی کے جاری بحران کے حل کی اس وقت تک کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ جب تک کہ بجلی ملکی وسائل مثلاً کوئلے سے پیدا نہ کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ ملک کو ان تمام مسائل سے نمٹنے کے لیے بجلی کی تیاری کے ایک جامع منصوبے کی اشد ضرورت ہے۔

(اپریل 2010ء)

سرکاری اللّے تللّے

حکومت کی طرف سے ایک طرف ملکی معیشت و اقتصادیات کو ترقی و استحکام دینے کے دعوے کیے جا رہے ہیں اور زرمبادلہ کے ذخائر میں اضافے کی خوشخبریوں' کے ساتھ ساتھ پچھلے ہی دنوں سرکاری سطح پر ایک مرتبہ پھر کہا گیا بلکہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ آئندہ تین برسوں مین ہر شہری کو روٹی، کپڑا اور مکان فراہم کیا جائے گا۔ ساتھ ہی پچھلے ہی دنوں پیپلز پارٹی کی ترجمان محترمہ فوزیہ وہاب نے بھی قوم کو یقین دہانی کروائی ہے کہ پیپلز پارٹی قوم کو دس لاکھ گھر فراہم کرنے کے لیے قطعاً سنجیدہ ہے۔ محترمہ فوزیہ وہاب کے اس بیان پر انشاءاللہ تفصیلی جائزہ الگ سے پیش کیا جائے گا اور جلد اس وقت صرف پیپلز پارٹی کے 43 سال پرانے دعوے عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان فراہم کرنے کے ایک مرتبہ پھر اعادے کے ساتھ چوتھی مرتبہ فروری 2008ء سے اقتدار سنبھالنے والی حکومت کی گزشتہ دو سال کی کارکردگی کیسی رہی۔ اس نے اپنے صرف ان تین وعدوں کی تکمیل میں کہاں تک کامیابی حاصل کی اور برسرِ زمین حقائق کیا رہے؟ اور ان سے اب تک قوم کو کیا کچھ مل سکا ہے اور اس دو سالہ کارکردگی کی روشنی میں مستقبل قریب کی یعنی آئندہ تین برسوں کی صورت حال کیا ہو سکتی ہے اور اس بابت کیا توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں اور بحیثیت مجموعی قوم کی حالت سدھرنے کے

کتنے امکانات ہو سکتے ہیں۔اس کا جائزہ یہاں 10 فروری 2010ء اور 4 فروری 2010ء کو آنے والی تین میڈیا رپورٹوں کی روشنی میں با آسانی لیا جا سکتا ہے۔جس کے لیے پہلے متعلقہ معاصرین کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

ان تینوں رپورٹوں کو پیپلز پارٹی کی اس چوتھی حکومت کی دوسری سالگرہ کا تحفہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور سب سے اہم اور دلچسپ بات یہ ہے کہ تینوں رپورٹیں بیشتر اور بنیادی طور پر سرکاری ذرائع ہی سے حاصل شدہ معلومات کا احاطہ کرتی ہیں۔اور ان میں رپورٹر حضرات کی ذاتی محنت اور تحقیق بھی شامل ہے جو یقیناً قابلِ تحسین بھی ہے۔اس اعتبار سے یہ بالکل سنجیدہ، معروضی، کامل احتیاط پر مبنی اور قطعاً غیر جانبدارانہ اور متوازن رپورٹیں ہیں اور سرکاری ذرائع سے بھی حاصل ہونے کی بنیاد پر کوئی بھی فریق یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ محض پیپلز پارٹی کی مخالفت میں اور مخالفین کا پی پی دشمن پر مبنی پروپیگنڈا ہے۔مزید برآں پیپلز پارٹی اپنی موجودہ ٹرم کے دو سال مکمل کر چکی ہے۔اس کے پاس اگلے تین سال ضرور ہیں لیکن دراصل اس حکومت کا ابھی پانچواں سال تو انتخابی مہم کا سال ہو گا۔اس اعتبار سے پیپلز پارٹی کے پاس صرف دو سال باقی ہیں اور پانچویں سال میں اس کو اپنی اس چار سالہ کارکردگی ہی کے حوالے سے انتخابی مہم چلانا ہوگی۔اور وہ قوم کو ان چار برسوں میں جو کچھ دے سکی ہوگی۔اس کی روشنی میں قوم بھی یہ فیصلہ کر سکے گی کہ اسے اب اگلی ٹرم کے لیے بھی پیپلز پارٹی ہی کو منتخب کرنا چاہیے یا نہیں۔اس اعتبار سے یہ رپورٹیں قوم اور پیپلز پارٹی دونوں کے لیے پچھلے دو سال کی کارکردگی کی ''بیلنس شیٹ'' بھی ہیں اور پیپلز پارٹی کی جانب سے قوم کو دی جانے والی سہولیات اور وعدوں کی تکمیل کا آئینہ بھی۔اور مزید سہولت کے لیے یوں بھی سمجھ لیا جائے کہ آئندہ دو برسوں میں بھی پیپلز پارٹی کی کارکردگی یہی رہے گی تو ان زیرِ نظر رپورٹوں میں پیش کیے گئے اعداد و شمار کو با آسانی دوگنا شمار کیا جا سکتا ہے اور آئندہ دو برس بعد رونما ہونے والی قومی معیشت و اقتصادیات اور اس کی بھی روشنی میں قوم کے دو سال بعد کے حالات کا کچھ نہ کچھ

اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔اس کے بعد پیپلز پارٹی خود ہی فیصلہ کر سکتی ہے کہ اس کے لیے وہ عوام کے سامنے اپنی چار سالہ کارکردگی کا کیا نقشہ پیش کر سکتی ہے اور آئندہ انتخابات کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔اس بابت کوئی بھی مناسب فیصلہ کرنا، اپنا احتساب اور صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے فوری فیصلے اور اقدامات پیپلز پارٹی ہی کا کام ہے۔

قوم کے سامنے یہ بیلنس شیٹ پیش کرنے کا یہی مقصد ہے تو آیئے ان رپورٹوں کا جائزہ لیتے ہیں۔پہلی رپورٹ یوں ہے تاریخوں کی تقدیم و تاخیر تازہ رپورٹ اور اس سے پہلے آنے والی رپورٹوں کے اعتبار سے ہے۔ورنہ ان مین ہر رپورٹ اپنی جگہ جس اہمیت کی حامل ہے۔وہ ان رپورٹوں کے مطالعے سے از خود واضح ہو جاتا ہے۔

بدھ 10 فروری 2010ء کو آنے والی ایک میڈیا رپورٹ کے مطابق جو وفاقی ادارہ شماریات کے حوالے سے جاری کی گئی ہے۔وفاقی ادارہ شماریات نے انکشاف کیا ہے کہ افراطِ زر کی شرح ایک بار 18 فیصد سے تجاوز کر گئی ہے۔پٹرولیم مصنوعات، گیس و بجلی کی قیمتوں میں اضافے کے بعد ضروری اشیاء کی قیمتوں میں ایک بار تیزی سے اضافہ ہو گیا ہے۔اعداد و شمار کے مطابق 4 فروری کو ختم ہونے والے ہفتے کے دوران گزشتہ مالی سال کے اسی ہفتے کی نسبت حساس اعشاریوں میں افراطِ زر کی شرح 18.18 فیصد کی سطح پر ریکارڈ کی گئی۔3 ہزار آمدنی والے طبقے کے لیے افراطِ زر کی شرح 18.79 فیصد، 5 ہزار روپے ماہانہ آمدنی والے طبقے کے لیے 18.67 فیصد، 12 ہزار روپے تک کی آمدنی والے طبقے کے لیے 18.20 فیصد جبکہ 12 ہزار روپے سے زائد آمدنی والے طبقے کے لیے 18 فیصد ریکارڈ کی گئی۔ایک ہفتے میں 20 اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ، 11 کی قیمتوں میں کمی ہوئی جبکہ 22 کی قیمتیں مستحکم رہیں۔پٹرولیم مصنوعات، گڑ، چکن، دال مونگ، گوشت، چاول باسمتی، ٹوٹا، دال چنا، تیل سرسوں، دال مسور گندم اور ایندھن جلانے کی لکڑی اور تازہ دودھ شامل ہیں، کی قیمتیں بڑھیں۔افراطِ زر دسمبر 2009ء کے دوران 14 فیصد

کی سطح پر تھا جواب بڑھ کر 18 فیصد سے تجاوز کر چکا ہے۔ اس اضافے سے غریب اور متوسط طبقے کی مشکلات مزید بڑھ گئی ہیں کیونکہ ان کی آمدنی نہ بڑھنے کی وجہ سے ان کی قوت خرید کم ہو گئی ہے۔

اب آیئے! اس سے صرف چند دن قبل ایک ساتھ آنے والی دو رپورٹیں:

پہلی رپورٹ: دن رات محنت کر کے غریبوں اور عوام کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرنے کے دعوؤں کے برعکس حکومت کے اپنے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ دو برس کے دوران ہوشربا مہنگائی کے نتیجے میں تقریباً ہر شہری کی زندگی اس سطح سے 50 فیصد زیادہ مہنگی ہو گئی ہے۔ جتنی یہ فروری مارچ 2008ء میں ہوا کرتی تھی۔ جب موجودہ حکومت نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔ ایک طرف ملک کی اقتصادی حالت خراب ہو گئی ہے تو دوسری طرف کرپشن میں بھی ریکارڈ اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جبکہ گورننس بھی خستہ حالت میں ہے۔ بدانتظامی روایت بن چکی ہے۔ روپے اور ڈالر کے درمیان تبادلے کا فرق 1-60 سے بڑھ کر 1-85 تک جا پہنچا ہے۔ عام شہری کی زندگی بد سے بدتر ہو چکی ہے۔ ملک کے تاجر طبقے کے لیے صورتحال کا بگڑنا اس کے علاوہ ہے۔ حکومت کا سینسٹو پرائس انڈیکس (ایس پی آئی) یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ فروری 2008ء میں 173 تھا۔ جو جنوری 2010ء میں بڑھ کر 254 تک پہنچ چکا ہے۔ روزمرہ کے استعمال کی چند اشیاء کی قیمتوں میں 250 سے 300 فیصد کا بے مثال اضافہ ہوا ہے۔ عوامی اجتماعات میں روٹی، کپڑا اور مکان کے وعدے کرنے والے حکمرانوں نے فروری 2008ء سے حقیقتاً انہیں بے مثال مہنگائی دی ہے۔ مثلاً وزارتِ شماریات کے ایوریج پرائس انڈیکس کے مطابق چینی 26 روپے سے بڑھ کر موجودہ قیمت 70 روپے تک پہنچ چکی ہے۔ آٹا ساڑھے 16 روپے سے بڑھ کر 30 روپے ہو گیا ہے۔ چائے کی پتی (250 گرام کا پیکٹ) 65 روپے سے بڑھ کر 124 روپے کا ہو گیا ہے۔ مرغی کا گوشت 71 روپے سے بڑھ کر 116 روپے ہو گیا ہے وغیرہ۔

روزمرہ ہر چیز، سبزیاں اور پھل، بجلی اور قدرتی گیس کے نرخ کے استعمال کی پٹرولیم مصنوعات یعنی کے ہر چیز مہنگے سے مہنگی ترین ہو گئی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار میں صرف ٹماٹر ہی ایسی چیز ہے جس کی قیمت میں کمی آئی ہے یعنی یہ 38 سے 16 روپے فی کلوگرام ہو گیا ہے۔ غریب کے لیے بجلی کی قیمت، جو ماہانہ 100 یونٹ استعمال کرتے ہیں، میں 50 فیصد اضافہ ہوا ہے اور قیمت فروری 2008ء کے 2.65 روپے فی یونٹ سے بڑھ کر موجودہ نرخ 3.91 روپے فی یونٹ تک جا پہنچی ہے۔ 100 یونٹ سے زیادہ بجلی استعمال کرنے والے صارفین اور کمرشل اور صنعتی صارفین کے لیے نرخوں میں عام صارف کے مقابلے میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ وہ گھریلو صارفین جو 101 سے 300 یونٹس کے درمیان بجلی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے لیے نرخ 4.69 روپے فی یونٹ (علاوہ ٹیکس) ہے، جو 301 سے 700 یونٹ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے لیے نرخ 8.03 روپے فی یونٹ ہے جبکہ 700 یونٹس سے زائد استعمال کرنے والوں کے لیے نرخ 10 روپے فی یونٹ (ٹیکس کے بغیر) ہے۔ کمرشل صارفین کے لیے بجلی کے نرخ فروری 2008ء میں 9.53 روپے فی یونٹ (بشمول ٹیکس) ہوا کرتے تھے جبکہ اب یہ قیمت 14.93 روپے فی یونٹ (بشمول ٹیکس) تک جا پہنچی ہے۔ کم سے کم صارفین کے لیے قدرتی گیس کی قیمتوں میں 15 فیصد اضافہ ہوا جبکہ ایل پی جی کی قیمتیں 817 روپے فی سلنڈر سے بڑھ کر 1092 فی سلنڈر ہو گئیں یعنی 270 روپے فی سلنڈر، پٹرول کی قیمتیں 53.83 روپے فی لیٹر سے بڑھ کر موجودہ 71.11 روپے فی لیٹر تک جا پہنچی ہیں۔ ڈیزل 37.86 سے 69.27 فی لٹر اور مٹی کا تیل 42 سے 72 روپے فی لٹر تک پہنچ چکا ہے۔ وہ غریب جو ایل پی جی نہیں خرید سکتے۔ جن کے پاس قدرتی گیس نہیں ہے اور لکڑی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے لیے لکڑی کی قیمتیں 230 روپے فی 40 کلوگرام سے بڑھ کر 302 روپے ہو گئی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس عرصے کے دوران کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں میں بھی زبردست اضافہ ہوا ہے۔ جس کے تحت گندم کی قیمت 18 روپے

سے 27 روپے فی کلو ہوگئی۔ آٹے کی قیمت 16.5 سے 30.19 فی کلو ہوگئی۔ باسمتی چاول 36 سے 43، ایری 26 سے 34، دال مسور دھلی ہوئی 71 سے 123، دال مونگ دھلی ہوئی 51 سے 84، دال مونگ 42 سے 84، گائے کا گوشت 122 سے 174 روپے، بکرے کا گوشت 234 سے 312 فی کلو، انڈے 62 سے 80 روپے فی درجن، درمیانے سائز کی ڈبل روٹی 19 سے 26 روپے، چینی 26 سے 70، گڑ 31 سے 73، لال مرچ پاؤڈر 133 سے 167، تازہ دودھ 30 سے 41، وجیٹیبل گھی 115 فی کلو، لہسن 44 سے 147 فی کلوگرام، پکانے کے تیل کا ڈھائی کلو کا ڈبہ 318 سے 353 روپے، آلو 11 سے 17 روپے فی کلو، پیاز 12 سے 25 روپے فی کلو، کیلے فی درجن 32 سے 38 روپے، چائے کا ایک کپ 7 روپے سے 11 روپے، بڑے گوشت کی ایک پلیٹ (پکی ہوئی) 20 سے 29 روپے ہوگئی ہے جبکہ فارم مرغی کا نرخ 71 روپے سے بڑھ کر 116 روپے فی کلوگرام تک پہنچ گیا ہے۔ 08-2007ء میں اقتصادی ترقی کی شرح 4.1 فیصد تھی جو نیچے گر کر 3.4 فیصد (نظر ثانی شدہ اندازے) ہوگئی ہے۔ پارلیمنٹ میں حال ہی میں جمع کرائی جانے والی ''قرضوں کے متعلق پالیسی بیان'' رپورٹ میں پہلے ہی حکومت کو متنبہ کیا گیا ہے کہ جی ڈی پی کی شرح کے مقابلے میں قرضوں کی بڑھتی ہوئی شرح (جواب 58.1 فیصد تک پہنچ گئی ہے) تشویش ناک ہے اور یہ سلسلہ جاری نہیں رہنا چاہیے۔ بصورتِ دیگر یہ 60 فیصد کی حد بھی عبور کر جائے گا۔ جس کا اشارہ ایف آر ڈی ایل ایکٹ 2005ء میں دیا جا چکا ہے۔ قرضوں کے متعلق پالیسی بیان وزارتِ خزانہ کے ڈیٹ آفس نے تیار کیا۔ جس کے سربراہ ڈائریکٹر جنرل مسرور احمد قریشی ہیں۔ اس بیان میں بتایا گیا تھا کہ ملک کے مجموعی غیر ملکی قرضے واجبات (ای ڈی ایل) میں 6.6 ارب ڈالر زیادہ 14.3 فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ موجودہ مالی سال کے ابتدائی تین ماہ یعنی جولائی، اگست اور ستمبر کے دوران پاکستان کے مجموعی سرکاری قرضے/ ٹوٹل پبلک ڈیٹ (ٹی پی ڈی) بڑھ کر 8100 ارب روپے تک جا پہنچے۔ اس میں 495 ارب

روپے یا 6.5 فیصد کا اضافہ ہوا۔ ملک کے داخلی قرضے 4010 ارب روپے جبکہ غیر ملکی قرضے 4090 ارب روپے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق 09-2008ء کے دوران سرکاری قرضوں میں 1600 ارب روپے (26.6 فیصد) کا اضافہ ہوا۔ جون 2009ء کے آخر تک ملک کے مجموعی قرضے 7605 ارب روپے تک جا پہنچے۔ (حوالہ: روزنامہ ''عوام'' کراچی، 4 فروری 2010ء)

دوسری رپورٹ: پی پی پی کے موجودہ دو سال دورِ حکومت میں قوم پر ٹیکسوں کا بوجھ ایک ہزار ارب روپے سے بڑھ کر ڈیڑھ ہزار ارب روپے ہوگیا۔ جہاں صارفین پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑھا ہے وہیں کارخانہ داروں پر ٹیکسوں کا بوجھ کم ہوا۔ ملک کے اندر مہنگائی کو کنٹرول کرنے کے لیے موثر اقدامات نہ ہونے کے برابر رہے۔ صرف پٹرولیم اور اس کی مصنوعات پر صارفین سے سالانہ سو دو سو سے اڑھائی سو ارب روپے کا ٹیکس حکومت وصول کر رہی ہے۔ پٹرولیم پر لیوی سوا سو ارب روپے اور سیلز ٹیکس بھی سو سو ارب کے لگ بھگ اس سال وصول ہوگا۔ 08-2007ء میں پاکستان کے عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ ایک ہزار آٹھ ارب روپے سے زیادہ ڈالا گیا۔ 09-2008ء میں یہ بوجھ بڑھا کر 1157 ارب روپے ڈالا گیا تھا۔ 10-2009ء میں صرف ایف بی آر کے ٹیکسوں کا بوجھ 15 سو ارب روپے سے تجاوز کر جائے گا۔ ٹیکس ان ڈائریکٹ ہوں، ڈائریکٹ ہوں یا پٹرولیم لیوی ان کا بوجھ بالآخر صارفین کے اوپر ہی منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ایک سروے کے مطابق رواں مالی سال کے پہلے سات مہینوں میں 692 ارب روپے سے زیادہ کے ٹیکس پاکستانی عوام ادا کر چکے ہیں۔ گزشتہ مالی سال 09-2008ء میں پٹرولیم لیوی کے علاوہ 440.3 ارب روپے کے ڈائریکٹ ٹیکس 452.3 ارب روپے کا سیلز ٹیکس، 116 ارب روپے کی فیڈرل ایکسائز اور 148.4 ارب روپے کی کسٹم ڈیوٹی وصول کی گئی۔ اس سے قبل کے مالی سال 08-2007ء میں 387.8 ارب روپے کے ڈائریکٹ ٹیکس 405.6 ارب روپے کا سیلز ٹیکس 92.1 ارب روپے کی فیڈرل ایکسائز اور 150.6 ارب روپے کی کسٹم ڈیوٹی وصول کی گئی تھی۔ اس طرح دو سالوں

میں عوامی حکومت کے دور میں عوام پر پٹرولیم لیوی اور ایف بی آر کے ٹیکسوں کا بوجھ 1008 ارب روپے سے بڑھا کر 15 سو ارب روپے کے لگ بھگ ہو گیا ہے۔ 31 جنوری 2010ء تک کے سات ماہ میں ایف بی آر نے گزشتہ سال کے پہلے سات ماہ کے مقابلے میں 10 فیصد زیادہ ٹیکس غیر موافق ملکی حالات کے باوجود جمع کیے۔ جولائی 2008ء سے جنوری 2009ء تک ایف بی آر نے 630 ارب 46 کروڑ روپے کے مجموعی ٹیکس جمع ہے جبکہ جولائی 2009ء سے جنوری 2010ء کے دوران 693 ارب روپے سے زیادہ کے ٹیکس جمع کیے۔ ان میں 286.4 ارب روپے کے ڈائریکٹ ٹیکس 272.2 ارب روپے کا سیلز ٹیکس، 76.7 ارب روپے فیڈرل ایکسائز اور 84 ارب روپے کی کسٹم ڈیوٹی شامل ہے۔ پی پی پی کی حکمرانی کے پہلے دو سالوں میں آئی ایم ایف عالمی بینک سے کیے گئے جنرل مشرف حکومت کے وعدے کو نبھاتے ہوئے کسٹم ڈیوٹی زیادہ سے زیادہ عمومی شرح 35 فیصد سے کم کر کے 25 فیصد کر دی گئی لیکن اس کے ساتھ تقریباً چار سو درآمدی آئٹموں پر پی پی پی حکومت نے 15 سے 40 فیصد ریگولیٹری ڈیوٹی عائد کر دی۔ پی پی پی کے برسر اقتدار آنے سے پہلے جنرل سیلز ٹیکس کی شرح 2007-08ء کے وفاقی بجٹ میں 15 فیصد تھی مگر پی پی پی حکومت نے 2008-09ء کے وفاقی بجٹ میں جنرل سیلز ٹیکس کی شرح 15 سے بڑھا کر 16 فیصد کر کے صارفین پر بیک جنبش قلم 40 ارب روپے کے ٹیکس کا بوجھ ڈال دیا۔
پی پی پی کے دو سالہ دور حکومت میں چینی پر سیلز ٹیکس کی شرح اگست ستمبر 2009ء سے غریبوں کے نام پر 16 فیصد سے کم کر کے 8 فیصد گزشتہ سال تو کر دی گئی مگر چینی کی قیمت اس حساب سے کم نہیں کرائی۔ وجہ یہ ہے کہ چینی کے کارخانے کے مالک سیاستدان زیادہ ہیں۔ حزب اقتدار کے لوگوں کی درجنوں شوگر ملیں ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ چینی صارفین کو آج 65 سے 75 کلو شوگر مل مالکان فروخت کر رہے ہیں مگر شوگر مل مالکان سے پی پی پی کے حکمران ساٹھ پینسٹھ ستر روپے کلو کے نرخ پر 8 فیصد جی ایس ٹی بھی وصول نہیں کر رہے ہے بلکہ آج بھی جنرل سیلز ٹیکس حکام کو 28 روپے

88 پیسے کلو تصور کرنے کا کہا گیا ہے۔ پاکستان کے صارفین سے اتنا بڑا دھوکہ ماضی کی کسی حکومت نے 82 شوگر مل مالکان کو فائدہ پہنچانے کے لیے کبھی کرنے کی جرأت نہیں کی۔ صارفین کو آج حکومت خود ٹیکہ لگا رہی ہے۔ وہ اس طرح کہ دو سالوں سے انکم ٹیکس کا 60 فیصد ود ہولڈنگ ہے۔ ود ہولڈنگ ٹیکس کہنے کو تو ڈائریکٹ ٹیکس ہے مگر وہ سارا بھی غریب صارفین پر ڈالا جا رہا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ جب تک موجودہ حکومت خریدار کا سی این آئی سی (کمپیوٹرائزڈ نیشنل شناختی ریکارڈ) نمبر یا نیشنل ٹیکس نمبر کا اندراج کرنے کا قانون نہیں بناتی، پورا سیلز ٹیکس جمع ہونا ناممکن ہے۔ وزارت خزانہ کے ذرائع کے مطابق فروری 2008ء میں جب پی پی پی کی حکومت بنی۔ زرمبادلہ کے ذخائر 15 ارب ڈالر کے لگ بھگ تھے جو اس کے بعد کم ہو کر پانچ چھ ارب ڈالر رہ گئے۔ آج پھر پندرہ ارب ڈالر کے لگ بھگ ہیں مگر ان دو سالوں میں غیر ملکی قرضوں میں ریکارڈ اضافہ ہوا۔ فروری 2008ء میں غیر ملکی قرضے تقریباً 38 ارب ڈالر کے تھے جو آج 58 ارب ڈالر کے لگ بھگ ہو گئے ہیں۔ اس طرح دو سالوں میں قوم پر صرف غیر ملکی قرضوں کے بوجھ میں 18 ارب ڈالر کے قریب اضافہ ہو گیا ہے۔

ان رپورٹوں کی روشنی میں ملک و قوم کی دو سال بعد کی ممکنہ صورتحال کا نقشہ بہت حد تک واضح ہو جاتا ہے جو حکمرانوں کے لیے کچھ وقت فکر بھی مہیا کرتا ہے ایک آدھ لمحہ نہیں.......... بشرطیکہ وہ غیر ملکی دوروں سے یہ وقت نکال سکیں کیونکہ معاملہ اٹھارہ کروڑ عوام کا ہے! اب فیصلہ پیپلز پارٹی خود کر سکتی ہے۔

(اپریل 2010ء)

مہنگائی کا بے قابو جن

وطن عزیز آزادی سے آج تک دنیا میں رائج تین معاشی نظام مختلف ادوار میں مختلف حیثیتوں سے دیکھ چکا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خدوخال کو ذوالفقار علی بھٹو (مرحوم) نے سوشلسٹ نظریئے کے ساتھ تبدیل کرنے کی کوشش کی اور بہت سارے ادارے حکومتی عمل داری میں آ گئے۔ جس کے نتیجے میں مارکیٹ کا کنٹرول بھی سرکار کے ہاتھ آ گیا۔ کیپٹل ازم اور سوشلسٹ نظریے کے ساتھ ہمارے ہاں مکسڈ اکانومی بھی چلتی رہی لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہم ہر دور میں تجربات ہی سے گزرتے رہے۔ ہم نے ایک وقت اداروں کو قومی تحویل میں لیا تو دوسرے مرحلے میں مزید اداروں کو حکومتی کنٹرول میں لینے کی بجائے انہیں کھلی بولی کے ذریعے نیلام کیا ہم نے گھی کارپوریشن آف پاکستان بنا کر خوردنی تیل اور گھی کی صنعت سرکاری کنٹرول میں لی تو دوسری جانب گھی کے کارخانوں کو اتنا آزاد چھوڑا گیا کہ چند سرمایہ دار ایک بزنس لنچ پر اکٹھے ہو کر گھی مہنگا اور سستا کرنے لگے اور حکومت کا پرائس سے متعلق ادارہ خاموش تماشائی ہی بنا رہا۔ اسی طرح سرمایہ دار اپنی مرضی سے مصنوعات کے نرخ بڑھا دیتے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے چینی کے نرخوں میں برائے نام اضافے کو بنیاد بنا کر فیلڈ مارشل ایوب

خان کے خلاف پوری قوم کو اکٹھا کر لیا اور اقتدار سنبھالتے ہی شوگر ملز مالکان کو نکیل ڈالی لیکن آج پارلیمنٹ کے اندر بیٹھے ہوئے چند شوگر ملز مالکان غریب اور متوسط طبقے کو معاشی طور پر بری طرح متاثر کر رہے ہیں۔ حکومتی مشینری ان کو کسی قاعدے قانون کا پابند بنانے میں بری طرح ناکام ہو رہی ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مہنگائی ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ پٹرولیم مصنوعات، خوردنی تیل کی قیمتیں اور کرنسی کے ریٹ عالمی منڈی میں طے ہوتے ہیں۔ حکومت صرف ان اشیاء کی طلب اور رسد میں توازن ممکن بنا کر مارکیٹ میں بروقت اور عالمی منڈی کے نرخوں کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوئے فراہمی کی ذمہ دار ہے تاہم مقامی پیداوار کی رسد اور فراہمی کے ساتھ ان کے نرخوں پر کنٹرول انتظامیہ ہی کا کام ہے جو وفاقی، صوبائی اور ضلعی سطح پر ایگزیکٹیو سیٹ اپ میں طے شدہ طریقہ کار کے تحت ہی سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ وفاقی وزیر خزانہ شوکت ترین کرپشن کو ملکی معیشت کے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دے چکے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کرپشن کا حجم 103 کھرب روپے تک پہنچ چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کا پورا انتظامی سیٹ اپ مل کر بھی مہنگائی کے جن کو قابو کرنے میں ناکام رہا ہے کہ گزشتہ ہفتے مہنگائی کی شرح میں 16.82 فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق 21 اشیاء کی قیمتیں بڑھی ہیں۔ جن سے سات ماہ کے دوران 163 ارب روپے سیلز ٹیکس ادا کرنے والے عام صارفین ہی متاثر ہوئے ہیں۔ مہنگائی اس وقت پوری دنیا کا مسئلہ ہے لیکن دنیا کے دیگر ممالک اپنی اقتصادی پالیسیاں اتنی ٹھوس مرتب کرتے ہیں کہ مہنگائی کے اثرات عام صارف کو زیادہ متاثر نہ کر سکیں جبکہ پاکستان میں ہر اقدام سے متاثر عام صارف ہی ہو رہا ہے۔ فیڈرل بورڈ آف ریونیو کا ریکارڈ شاید ہے کہ مجموعی ٹیکس ریونیو میں 60 فیصد بالواسطہ ٹیکس عام شہری ادا کرتا ہے۔ جس میں کسٹم ڈیوٹی، سیلز ٹیکس فیڈرل ایکسائز ڈیوٹی وفاقی جبکہ صوبائی سطح پر بھی حکومت کے ہر ٹیکس کا بوجھ عام شہری پر ہی پڑ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی 40 فیصد براہ راست ٹیکس بھی کارخانہ دار اور دکاندار اپنے خریداروں ہی کو منتقل کر رہا ہے۔ اس ساری

صورتحال میں کہ صرف غریب ہی کی ٹوٹ رہی ہے۔ مہنگائی پورے ملک میں ہے اور ہر پاکستانی اس کا خاتمہ چاہتا ہے لیکن شمال مغربی سرحدی صوبے کا شہری 1979ء سے 2010ء تک افغانستان کی صورتحال سے بری طرح متاثر رہا ہے۔ صوبہ سرحد سے اشیاء خورد و نوش کی بڑی مقدار سرحد پار چلی جاتی ہے۔ جس سے تاجروں، صنعت کاروں اور جاگیرداروں کی آمدنی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے نام پر سمگلنگ کی شرح میں ہونے والا اضافہ ملکی معیشت کو کھوکھلا جبکہ چند کاروباری خاندانوں کی تجوریاں بھر رہا ہے۔ لاکھوں افغان مہاجرین کی آمد اور پاکستان خصوصاً صوبہ سرحد سے تیار ہونے والی اشیاء کی افغانستان ترسیل سے ہمارے صنعت کاروں کو بڑی منڈیاں مل گئی ہیں لیکن اس سب کے باوجود وہی کارخانے دار اور دکاندار عوام کے خون پسینے کی کمائی سے جمع ہونے والا ٹیکس دہشت گردی کے نام پر حکومت سے پیکیج کی صورت حاصل کر رہا ہے۔ ماہرین اقتصادیات کا موقف ہے کہ حالت جنگ ہو یا امن گھی، آٹے، چاول، دال، چینی کا استعمال کم نہیں ہوتا۔ لوگ زندہ رہنے کے لئے خوراک حاصل کر رہے ہیں۔ پھر کارخانہ دار کس چیز سے متاثر ہو رہا ہے۔ اگر چند غیر ضروری اشیاء کے استعمال میں کمی آئی بھی ہے تو وہ بہت معمولی ہے۔ صرف حبیب بینک نے گزشتہ 5 سال کے دوران 19 ارب 27 کروڑ روپے کے قرضے معاف کئے ہیں۔ قرضہ معاف کرانے والوں میں وہ ادارے بھی شامل ہیں جو مالی طور پر مستحکم قرار دیئے جا رہے ہیں۔

اس لوٹ مار میں سرمایہ دار مزید مستحکم جبکہ غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ جس کے لئے زندگی کی گاڑی کو رواں رکھنا بھی ممکن نہیں رہا۔ حکومت کے انتظامی سیٹ اپ میں مقامی مارکیٹ کنٹرول کرنا ڈسٹرکٹ لیول مینجمنٹ کا کام ہے۔ انگریز سرکار نے اپنے ریونیو کلکٹر یعنی ڈپٹی کمشنر کو بے انتہا اختیارات دے رکھے تھے۔ جن میں ایک مارکیٹ کنٹرول بھی تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ قیمتوں کو مستحکم رکھنے کے ساتھ اشیاء ضروریہ کی طلب اور رسد سے متعلق معاملات کا بھی نگران ہوتا ہے۔

سابق صدر جنرل پرویز مشرف کے متعارف کروائے گئے ضلعی نظام حکومت میں ضلعی اختیارات ناظمین کو سونپے گئے اور ڈسٹرکٹ مینجمنٹ کا ذمہ دار افسر منتخب ناظم کے زیر سایہ کام کرنے لگا۔ اس دوران گزشتہ عرصے میں ہماری مارکیٹ چیک اینڈ بیلنس سے آزاد ہو گئی۔ اس وقت صوبہ سرحد کے دوسرے حصوں کی طرح پشاور میں کمر توڑ مہنگائی نے عام شہری کو بے بس کر دیا ہے۔ آٹے، چینی، گھی، دالوں کے ریٹ کسی نہ کسی حوالے سے منظر عام پر آتے ہی ہیں لیکن روٹی کا وزن روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ دودھ 40 سے 50 روپے لیٹر فروخت ہو رہا ہے۔ دہی 46 روپے کلو مل رہا ہے جبکہ گوشت اور قیمے کے نرخ ہر دکان دار نے اپنی مرضی کے مقرر کر رکھے ہیں۔

ملاوٹ کا عالم یہ ہے کہ دودھ میں پانی صرف اسے پتلا کر دیتا ہے لیکن آج کل پانی کے ساتھ انتہائی مضر کیمیکل ملائے جا رہے ہیں جو دودھ کو گاڑھا کر دیتے ہیں۔ گوشت کا معیار چیک کرنے کے لئے ذبح خانے میں ڈاکٹر کی مہریں ہر جانور پر لگی ہوتی ہیں جبکہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ انتہائی لاغر اور بیمار جانور روزانہ ذبح کر کے مارکیٹ میں لائے جا رہے ہیں۔ پھل فروٹ عام آدمی کی پہنچ سے دور ہے۔ سبزیوں کے نرخ ہر دکاندار من مانے وصول کر رہا ہے۔ ہماری بیوروکریسی کا اب تک یہی کہنا تھا کہ پورا نظام منتخب لوگوں کے ہاتھ میں ہے لیکن اب سب کچھ بیوروکریسی کے ہاتھ میں ہے دیکھنا یہ ہے کہ کیا ایڈمنسٹریٹرز مہنگائی کے جن کو قابو کر پائیں گے یا منتخب لوگوں کی طرح مصلحت کا شکار ہو کر خاموش تماشائی بنے رہیں گے۔ سیاسی قیادت سے متعلق تو یہ بات عام رہی ہے کہ کسی منتخب بندے کے لئے امن و امان قائم رکھنے کے لئے سخت قدم اٹھانا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ اسے اپنا ووٹ عزیز ہوتا ہے لیکن اب تحصیل اور ڈسٹرکٹ لیول پر سرکاری افسران کی کارکردگی کا امتحان ہے تاہم اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ان افسروں پر سیاسی دباؤ کم سے کم پڑے۔

(اپریل 2010ء)

وی۔اے۔ٹی کا عذاب

اخبارات کے مطابق آئی ایم ایف نے شرط لگائی ہے کہ قرضے کی اگلی قسط اس وقت پاکستان کو دی جائے گی جب حکومت عوام پر ایک نیا ٹیکس لگائے جس کو انگریزی میں ویلیو ایڈڈ ٹیکس (VAT Value Added Tax) کہتے ہیں۔ معلوم نہیں اردو میں اس کا کیا نام ہوگا۔ جب آئی ایم ایف اس کے نفاذ میں اتنی دلچسپی لے رہا ہے تو ضرور یہ کوئی مصیبت ہوگی کیونکہ آئی ایم ایف کو پاکستان کے عوام سے کوئی محبت نہیں ہے۔ عجیب قرضہ ہے کہ 7.5 یا شاید 11.3 ارب ڈالر کا قرضہ معلوم نہیں کتنی قسطوں میں دیا جارہا ہے اور ہر قسط سے قبل نئی نئی شرائط لگائی جاتی ہیں۔ بجلی مہنگی کرو، سبسڈی ختم کرو، پٹرول پر ٹیکس لگاؤ اور اب VAT یہ نام ہی کوئی خطرناک قسم کا ہے خدا خیر کرے۔ حکمت پاکستان کے حکم کے مطابق تمام صوبوں نے اس ٹیکس کو نافذ کرنے کے لئے بل صوبائی اسمبلی میں پیش کر دیئے ہیں، عام طریقہ کار کے مطابق تو قرض لیتے وقت تمام شرائط ایک دفعہ ہی طے ہو جاتی ہیں، یہ عجیب قرضہ ہے کہ ہر قسط کے ساتھ نئی نئی شرائط طے کی جاتی ہیں، کیا پاکستان کے عوام جانور ہیں جن پر دن بدن مزید بوجھ لادا جارہا ہے۔

چیئرمین فیڈرل بورڈ آف ریونیو (ایف بی آر) سہیل احمد کا کہنا ہے کہ ''VAT'' کوئی نیا

ٹیکس نہیں بلکہ جنرل سیلز ٹیکس (جی ایس ٹی) کا متبادل ہے، VAT کی مجوزہ شرح 15 فیصد ہوگی، مہنگائی کا کوئی سیلاب نہیں آئے گا۔ 3 سے 5 سال میں 800 ارب کے اضافی ٹیکس وصول ہوں گے۔ 8 اپریل کو ایف بی آر کے ہیڈکوارٹر میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ VAT کے حوالے سے بل بہت جلد اسمبلی میں پیش کیا جائے گا۔ جی ایس ٹی کی شرح 16 فیصد ہے، VAT اس کی جگہ لے گا اور اس کی شرح 15 فیصد ہوگی۔ یہ ایک جدید اور ترقی پسند ٹیکس (اب ٹیکس بھی ترقی پسند ہونے لگے ہے) انہوں نے کہا کہ چاروں صوبوں میں ایک بھی صوبے نے اس ٹیکس کی مخالفت کردی تو یہ ٹیکس نہیں لگے گا''۔ چیئرمین صاحب عجیب بات کررہے ہیں، ایک طرف تو وہ کہتے ہیں کہ VAT کوئی نیا ٹیکس نہیں بلکہ پرانے ٹیکس جی ایس ٹی کا متبادل ہے۔ پرانے ٹیکس کی شرح 16 فیصد سے اور نئے VAT کی شرح اس سے کم 15 فیصد ہوگی۔ اس کے باوجود ان کا کہنا ہے کہ اس ٹیکس کے نفاذ کے بعد 800 ارب کے اضافی ٹیکس وصول ہوں گے۔ ان سے سوال کیا جاسکتا ہے کہ جناب اگر اس نئے ٹیکس کی شرح بھی کم ہے ٹیکس جمع کرنے والا عملہ بھی پرانا ہے، تاجر اور صنعت کار بھی نئے نہیں ہیں تو اضافی آمدنی کیسے ہوگی۔ کیا سرمایہ دار ایماندار ہو جائیں گے یا ایف بی آر والے فرشتے بن جائیں گے۔ ٹیکسوں کی کم وصولی کے ذمہ دار عوام نہیں بلکہ آپ کے محکمے کا عملہ ہے جو سرمایہ دار سے مل کر ٹیکس چوری میں ملوث ہوتا ہے آپ نیا ٹیکس جمع کرنے کے لئے فرشتے کہاں سے لائیں گے عوام سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں، ان کو صاف کہہ دیں کہ چونکہ آئی ایم ایف کا حکم ہے اس لئے عوام کو مزید قربانی دینی ہوگی۔ ساتھ یہ بھی بتا دیں کہ یہ قرضہ اور یہ ٹیکس عوام کی فلاح و بہبود کے لئے نہیں بلکہ حکمرانوں کی عیاشیوں کے لئے ہے۔

''اگر حکومت نے VAT نافذ کیا تو خوراک کی تمام اشیاء کی قیمتیں 100 فیصد بڑھ جائیں گی۔ اس ٹیکس کے نفاذ کے بعد امکان یہ ہے کہ مرغی کے گوشت کی قیمت 200 روپے فی کلو اور

گوشت کی قیمت 500 روپے فی کلو ہو جائے گی۔اشیائے خوراک عام آدمی کی قوت خرید سے باہر نکل جائیں گی۔'' انہوں نے مزید کہا کہ حکومت خوراک کی اشیاء پر VAT نافذ کر کے عوام کے ہاتھوں سے روٹی کا نوالہ بھی چھیننا چاہتی ہے۔آج کل مرغی کا گوشت 190 روپے فی کلو گرام، بڑا گوشت 220-200 روپے فی کلوگرام اور چھوٹا 400-350 روپے فی کلوگرام ہے۔یہ قیمتیں اب بھی عام آدمی کی قوت خرید سے باہر ہیں۔دنیا کے دوسرے ممالک میں خوراک کی اشیاء کو لازمی اشیاء قرار دے کر ٹیکسوں میں چھوٹ دی جاتی ہے۔پاکستان میں عجیب رسم ہے کہ ٹیکس سب سے پہلے خوراک کی اشیاء کو متاثر کرتا ہے۔اگر ٹیکس کاروباری طبقے پر لگایا جائے تو وہ فوراً اس بوجھ کو قیمتیں بڑھا کر عام آدمی کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ عام آدمی کہاں جائے۔اگر VAT نافذ کیا گیا تو ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ پھر ملک بھر کے 28 ہزار پولٹری فارم بند کر دیئے جائیں گے۔مارکیٹ کے عام دکانداروں کا بھی کہنا ہے کہ اس ٹیکس کے نفاذ کے بعد مجبوراً ان سب کو اپنا کاروبار بند کرنا پڑے گا،حکومت قیمتیں بڑھا کر خود ہی افراط زر میں اضافہ کر رہی ہے،حکومت کو چاہیے کہ غریبوں پر ٹیکس لگانے کی بجائے اپنے فضول اخراجات کو کم کرے۔ان کا مطالبہ ہے کہ چونکہ عوام کی کھال اتارنے کی دوڑ میں پاکستان دنیا میں اول نمبر پر ہے اس لئے پاکستان کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں لکھا جانا چاہیے۔پاکستان کی اکثریت بہت غربت میں وقت گزار رہی ہے۔ان کی کمر پہلے سے ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔حکومت روزانہ تیل اور دوسری اشیاء کی قیمتیں بڑھا دیتی ہے۔کیا حکومت کو عوام پر رحم نہیں آتا؟

دنیا بھر میں حکومتوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ٹیکسوں کی وصولی کے بدلے میں عوام کو بنیادی سہولتیں مہیا کریں۔تعلیم،صحت،اور جان و مال کا تحفظ جیسی سہولتیں ان میں سرفہرست ہوتی ہیں۔ پاکستان میں حکومت نے ان تمام ذمہ داریوں سے ہاتھ اٹھا لیا ہے،اب وہ بچہ اچھی تعلیم حاصل

کرے گا جس کا باپ بیکن ہاؤس اور ایچی سن کے اخراجات برداشت کر سکتا ہو۔علاج اس شخص کا بہتر ہو گا جو ڈاکٹرز ہسپتال لاہور یا ایم آر آئی ہسپتال پشاور کے لاکھوں روپے کے اخراجات برداشت کر سکتا ہو۔جان و مال کا تحفظ اس شہری کو حاصل ہو گا جس کے پاس زیادہ اسلحہ ہو اور جس کے پاس اپنی فوج ہو۔اپنے فرائض ادا کرنے میں ناکام حکومت کو دنیا کا کوئی بھی قانون عوام سے ٹیکس لینے کا حق نہیں دیتا۔پاکستان کے عوام کی بے حسی ہے کہ حکومت ان کا خون نچوڑ کر اپنی عیاشیوں اور سامراجی بنکوں کو بھرنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔اخباری اطلاعات کے مطابق حکومت پاکستان نے آئی ایم ایف کو یقین دلایا ہے کہ پارلیمینٹ اور چاروں صوبائی اسمبلیاں مئی کے مہینے میں VAT بل کی منظوری دے دیں گی۔یہ ٹیکس یکم جولائی 2010ء سے لاگو کر دیا جائے گا۔آئی ایم ایف کے مشرق وسطی اور سنٹرل ایشیا کے لئے ڈائریکٹر عدنان مزاری ان دنوں پاکستان کے دورے پر ہیں۔ان کے دورے کا مقصد آئی ایم ایف کے 11.3 ارب ڈالر کی امداد کی پانچویں قسط جو 1.2 ارب ڈالر بنتی ہے کی ادائیگی سے قبل ان شرائط کے مسائل کو حل کرانا ہے۔ انہوں نے اپنی ٹیم کے ساتھ خزانہ کے مشیر حفیظ اے شیخ اور سٹیٹ بنک کے گورنر سید سلیم رضا سے بھی ملاقات کی ہے۔ان خبروں کے مطابق آئی ایم ایف کو اس بات کا بھی غصہ ہے کہ پاکستان کی حکومت بجلی کے نرخ بڑھانے میں پس و پیش کر رہی ہے۔صوبائی اسمبلی میں اس ٹیکس کا بل پیش کیا جا چکا ہے۔کیا اپنے لئے اسلام آباد میں پلاٹ اور اپنے والدین کے لئے مفت علاج کی سہولت طلب کرنے والے ممبران صوبائی اسمبلی میں اتنی ہمت ہے کہ وہ اپنے غریب ووٹروں کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلا سکیں۔

آئی ایم ایف نے حکومت پاکستان کے ساتھ ویلیو ایڈڈ ٹیکس کے نفاذ بجلی کی قیمتوں میں اضافے اور بجٹ خسارہ مقررہ حد کے اندر رکھنے کے معاملات طے ہونے کے بعد ایک ارب 20 کروڑ ڈالر قرضے کی قسط مئی میں جاری کرنے کی یقین دہانی کروادی ہے۔وزارت خزانہ کی طرف

سے ویلیوایڈڈ ٹیکس کا نفاذ نئے مالی سال سے کرنے بجلی کی قیمتوں میں یکم اپریل سے اضافہ نہ کرنے
کی وجہ سے ریونیو میں ہونے والی 25 کروڑ ڈالر کی کمی کو گندم کی سبسڈی کے لئے رکھی گئی بجٹ کی
رقم سے پورا کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جبکہ دیگر میڈیا رپورٹوں کے مطابق یکم جولائی سے ویلیوایڈ
ٹیکس کے نفاذ کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔

پاکستان کی حالت اب یہ ہوگئی ہے کہ عوام کے ووٹوں سے برسر اقتدار آنے والی عوام کے
حقوق اور جمہوریت کی چیمپئن حکومتیں، ہر معاملے میں امریکہ، آئی ایم ایف اور عالمی بینک ہی کی
طرف دیکھ کر کوئی اقدام یا فیصلہ کرتی ہیں۔ ان تینوں کے اشارۂ ابرو پر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ رہے
عوام تو ووٹ دینے کے بعد ان کی ڈیوٹی ختم ہوجاتی ہے۔ اس لئے ایسے کسی بھی فیصلے یا اقدام کے
وقت نہ پہلے نہ بعد میں، ان سے نہ رائے لی جاتی ہے اور نہ انہیں اس کے لائق سمجھا جاتا ہے۔
چنانچہ جب اور جس چیز کی قیمت میں اضافہ کرنے کا ارادہ ہو، یا اوپر سے حکم نازل ہو، ہماری
جمہوری حکومت نہایت تابعداری سے اسے بجالاتی ہے۔ عوام بلکہ رعایا چیختی رہ جاتی ہے۔ جب
سے موجودہ جمہوری منتخب حکومت برسر اقتدار آئی ہے۔ بس یہی تماشا ہورہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے
پاکستان میں آئی ایم ایف کی حکومت قائم ہوچکی ہے۔

ویٹ کے نفاذ اس مسلسل ڈرامے کی تازہ قسط کے سوا کچھ اور نہیں، اس بابت یہ پوچھنا بھی
فضول ہے کہ خود رعایا جو 32 کھرب روپے کا ٹیکس ویسے ہی بھرتی ہے وہ کہاں جاتا ہے جو ان
عالمی بلاؤں سے مزید قرضے وصول کیے جارہے ہیں اور اس کے لئے ان کا ہر حکم تسلیم کرلیا جاتا
ہے، یہ بھی کوئی نہیں بتارہا کہ یہ قرضے واپس کس طرح کیے جائیں گے اور اس کے لئے ویٹ کا نفاذ
کرکے ملک وقوم کا رہا سہا دیوالیہ بھی نکال ہی دینا ہے تو فائدہ کس فریق کا ہورہا ہے۔ کیا اس لئے
یہ سب ہورہا ہے کہ یہ بھاری رقوم دراصل کہیں اور ہی جاتی ہیں اور یا پھر حکومت کو اپنے گھر واپس
جانے کی بہت زیادہ جلدی معلوم ہوتی ہے؟ (مئی 2010ء)

معاشی ترقی کی حقیقت؟

اسٹیٹ بنک کے مرکزی بورڈ آف ڈائریکٹرز کے اجلاس کے بعد فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ دو
ماہ کے لئے شرح سود 12.5 فیصد برقرار رہے گی جبکہ مہنگائی کی شرح 12 فیصد رہے گی۔ بیرونی
خسارہ کم ہوکر 2.6 ارب ڈالر رہ گیا ہے جبکہ اسٹیٹ بنک کے زرمبادلہ کے ذخائر 11.1 ارب
ڈالر ہے۔ رپورٹوں کے مطابق سبسڈی کے خاتمے سے قیمتوں میں اضافہ ہورہا ہے۔ رپورٹ میں
مزید بتایا گیا ہے کہ حکومت نے رواں مالی سال کی پہلی ششماہی میں 110 ارب روپے کے بیرونی
قرضے لئے جس میں آئی ایم ایف کے 93 ارب روپے بھی شامل ہیں۔ 25 مارچ 2010ء
تک 1240 ارب روپے کے حکومتی قرضے لئے گئے جو کہ سہ ماہی حد سے 110 ارب روپے
زائد ہیں۔ اس کے بالکل ساتھ آنے والی دوسری رپورٹ کے مطابق بجلی کی فی یونٹ قیمت میں
ایک روپے پیسے کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ نیپرا نے نوٹیفکیشن جاری کردیا ہے جبکہ ایک اور رپورٹ
میں کہا گیا ہے کہ وفاقی حکومت نے رواں مالی سال کے لئے ٹیکس وصولیوں میں ممکنہ شارٹ فال
پورا کرنے کے لئے مہنگائی کا نیا طوفان برپا کرنے کی حکمت عملی طے کرلی ہے جس کے تحت 31
ارب روپے کی اضافی وصولیوں کا ہدف مقرر کیا گیا ہے۔ بجلی کی قیمتوں میں اضافے سے ٹیکس کی مد

میں 3 ارب روپے کا مزید ریونیو حاصل ہوگا۔ اس سلسلے میں ایف بی آر نے حکمت عملی تیار کر
ہے جبکہ وزیر پانی و بجلی نے کہا ہے کہ بجلی کا بحران کم پیداوار کے سبب ہوا، جلد ختم کر دیا جائے گا۔

پاکستان پر قرضوں کا مجموعی بوجھ 8 ہزار ارب روپے تک جا پہنچا ہے اور قوم پر مزید بو
لادنے کے لئے یکم اپریل سے ممکنہ طور پر پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں مزید 7 فیصد اضافہ
گیا۔ دریں اثناء ملک بھر میں بجلی کی بدترین لوڈشیڈنگ ہو رہی ہے۔ مظاہرے جاری ہیں۔ ادھر
اپریل سے گھڑیاں ایک گھنٹہ آگے کرنے کا نوٹیفکیشن واپس لے لیا گیا ہے۔ جبکہ ساتھ ہی ایک
رپورٹ کے مطابق پاکستان سمیت دنیا بھر میں ایک گھنٹے کے لئے بتیاں بجھا کر ساعت ارض
(آرتھ آور) منائی گئی اور یہ خبر اس ملک (پاکستان) سے بھی آئی ہے جہاں پچھلے دنوں تک آ
والی رپورٹوں کے مطابق لوڈشیڈنگ کا دورانیہ شہروں میں 16 سے 18 گھنٹے اور دیہات میں 20
سے 22 گھنٹے تک جا پہنچا تھا اور بجلی بحران نے صرف ایک سال میں 4 لاکھ اور ایک اندازے کے
مطابق دس لاکھ کے لگ بھگ افراد کو بے روزگار کر دیا ہے۔ صنعتوں کو سالانہ 220 ارب ک
نقصان ہو رہا ہے۔ پٹرولیم کی قیمتوں میں اضافے کا امکان ہے۔ مارچ میں پٹرول کی قیمتیں 4
ڈالر 49 سینٹ بڑھ کر 5 ڈالر 52 سینٹس ہو گئیں۔ ماہرین کے مطابق عالمی منڈی میں قیمتیں
بڑھنے سے مقامی سطح پر بھی قیمتوں میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

یہ ملکی معیشت کا محض چند پہلوؤں سے اور صرف ایک سرسری جائزہ ہے۔ اس حوالے سے مزید
جائزہ لیا جائے تو تاجروں کے مطابق پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے سے پہلے ہی سسکتی
ہوئی صنعت و حرفت اور تجارت کی موت واقع ہو جائے گی۔ اس موقف کی تصدیق اس رپورٹ
سے بھی ہو جاتی ہے کہ صرف گزشتہ ایک سال میں 4 لاکھ ہم وطن بے روزگار ہو گئے۔ گزشتہ دو سال
کے حساب سے یہ تعداد دراصل دگنی یعنی 8 لاکھ شمار کی جا سکتی ہے۔ اس صورت حال کے فوری طور
پر سدھرنے کے آثار بھی نہیں ہیں۔ اوپر سے حکومت نت نئے محصولات عائد کرتی چلی جا رہی ہے

اور حکمران پیپلز پارٹی کی رہنماء فوزیہ وہاب نے پچھلے دنوں صاف کہہ دیا ہے کہ بجلی کا بحران جلد حل
ہونے والا نہیں۔ جبکہ ایران سے تین گنا سستی بجلی کی درآمد کے بارے میں معاملہ سرکاری سطح پر یہ
کہہ کر گویا ختم ہی کر دیا گیا ہے کہ ایران سے بجلی درآمد کرنے میں پانچ سال لگیں گے۔

پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کا سلسلہ تو خیر ختم ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ جبکہ یہ دونوں
عناصر ملکی معیشت کو زندہ اور رواں رکھنے میں تازہ خون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو قوم کی دسترس
سے باہر رکھنے یا گراں سے گراں تر کرتے چلے جانے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ رہی سہی
صنعت و حرفت بھی ختم ہو جائے کیونکہ اس بارے میں ایک صنعت کار سے لے کر ایک عام اور
ناخواندہ مزدور تک جانتا ہے کہ اگر ان اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں تو ان سے حاصل ہونے والی
پیداوار خود بخود مہنگی ہو جائے گی۔ صنعت کار یہ بوجھ صارف کی طرف منتقل کر سکتا ہے لیکن ایک حد
سے زائد نہیں اس کے بعد صارفین کی قوت خرید ختم ہو جائے گی اور وہ غیر ملکی ذرائع پر جو نسبتاً کم
قیمت ہوں گے، انحصار کریں گے جس سے مقامی صنعت کا بھٹہ بیٹھ جائے گا۔ یوں صنعت و حرفت
جو ملک کا بیشتر روزگار فراہم کرنے والا شعبہ ہے، تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے اور مہنگائی میں
جب حکومت خود اضافہ کر رہی ہو تو دوسروں کو کون روک سکتا ہے؟ مزید یہ کہ جب سستی بجلی مل رہی
ہے تو اسے حاصل کرنے میں کیا امر مانع ہے۔

کئی گنا مہنگے رینٹل پاور پراجیکٹ پر اصرار کے کیا معنی ہیں اور کیا حکومت قوم کو بتائے گی کہ ان
پروجیکٹس سے اب تک کیا کچھ حاصل ہوا ہے اور یہ خرچ کہاں سے پورا کیا گیا ہے؟ اور ان پر کیا
خرچ آ چکا ہے کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو ہمارے حکمران کسی بھی چیز کو سنبھالنے کے اہل ہی نہیں
اور وہ عوام کے مسائل اور مشکلات سے بالکل بے خبر ہیں یا پھر ان کو مال بنانے کے سوا کچھ نہیں
آتا۔ وزیر اعظم نے ابھی پچھلے دنوں کہا کہ بجلی گیس وغیرہ کے ضمن میں عوام کو درپیش مشکلات اور
اس حوالے سے روزافزوں گرانی کا احساس ہے، عوام کو جلد ریلیف دیں گے۔ اس ریلیف کی تازہ

قسط پٹرولیم مصنوعات اور بجلی کی قیمتوں میں تازہ ترین اضافے کی صورت میں قوم کو مل بھی چکی ہے اور قوم کو اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ اسے کس قسم کے ریلیف دیئے جا رہے ہیں اور اس کا نتیجہ گزشتہ دو سال کی صورت حال کے آئینے میں اچھی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ صنعت ہی کے حوالے سے صرف ٹیکسٹائل ہی کو دیکھا جائے تو یہ شعبہ بھی تباہی کے آخری اسٹیج پر پہنچ چکا ہے جو ملکی معیشت کو 46 فیصد زرمبادلہ فراہم کرتا ہے۔ اس شعبہ کی تباہی کے سادہ اور مختصر ترین معنی یہ ہیں کہ ہمارے زرمبادلہ کی آمدنی میں یک لخت 46 فیصد کمی واقع ہو جائے گی۔ جبکہ ہمارے اوپر صرف غیر ملکی قرضوں کا بوجھ ہی 55 ارب ڈالر سے تجاوز کر چکا ہے اور زرمبادلہ کے ذخائر 16 تا 17 ارب ڈالر بتائے جا رہے ہیں جبکہ تجارتی خسارہ وفاقی وزیر تجارت بتائیں گے۔ زراعت کے حوالے سے صرف یہ دیکھا جائے کہ ہمارے جن دریاؤں پر بھارت اندھا دھند ڈیم بنا کر امن کی آشاؤں کو اڑا رہا ہے، اس کے نتیجے میں ہمارے دریاؤں میں کتنا پانی باقی رہ گیا ہے۔

واضح رہے کہ پاکستان کی تقریباً 70 فیصد آبادی زراعت پیشہ ہے اور صنعت کے بعد زرعی شعبے کی بھی تباہی کے بعد ہمارے پاس بچ ہی کیا جائے گا؟ ابھی موجودہ حکومت کے 3 سال باقی ہیں اگر گزشتہ سال میں 4 لاکھ افراد کی بے روزگاری کو سامنے رکھا جائے تو ایسے حالات میں آئندہ تین برسوں میں دراصل 18 تا 20 لاکھ بے روزگار ہو جائیں گے۔ ساتھ ہی وزیر اعظم فرماتے ہیں کہ ہماری کارکرگی کا حساب پانچ سال بعد لیا جائے، اس وقت تک یہ بے روزگار طبقہ فاقوں کے ہاتھوں قبرستان پہنچ چکا ہوگا۔ کیا وزیر اعظم اور صدر مملکت اور وفاقی وزیر صنعت و پیداوار قوم کو بتائیں گے کہ گزشتہ 2 برسوں میں ملک بھر میں کتنے کارخانے بند ہو گئے اور کتنے ہم وطن بے روزگار ہو گئے ہیں اور ان کے اہل خانہ کو روزی روٹی کے بھی لالے پڑ گئے ہیں۔ وفاقی وزیر زراعت بھی ذرا قوم کو اپنے شعبے کے حوالے سے آگاہ کریں کہ پانی کی کمی کتنی ہوگئی ہے اور کتنے ایکڑ زمین تباہی سے دوچار ہو چکی ہے اور اس سے کتنے زرعی محنت کش اپنے کام سے ہاتھ دھو بیٹھے

ہیں اور ملکی معیشت کو کتنا نقصان پہنچ چکا ہے اور اس کے تدارک کے لئے کیا اب تک کچھ کیا ہے۔ صرف ان دو حوالوں سے جائزے سے بھی ملکی معیشت کے ان دونوں بنیادی شعبوں کی حقیقی صورتحال سامنے آ سکتی ہے۔ ویلیو ایڈیڈ ٹیکس وغیرہ کے بارے میں بھی خود صنعت کار برادری کی مخالفت کافی وضاحت ہے۔ اسٹیٹ بنک نے بھی اپنے حالیہ بیان میں کہا ہے کہ شرح سود میں کمی سے مہنگائی میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے ماہرین کا موقف بھی آ گیا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ بلند شرح سود کے ذریعے مہنگائی کو کم نہیں کیا جا سکتا اور مہنگائی پر قابو پانے کے لئے خوردنی اشیاء اور پٹرولیم کی قیمتیں کم کر دی جائیں ایک اور صنعت کار کے مطابق موجودہ حالات میں صنعتی سرمایہ کاری ممکن نہیں، دوسرے تاجر رہنماء کے مطابق اسٹیٹ بنک مہنگائی کو روکنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ اس منظر نامے میں واضح ہے کہ حکومت کو دراصل یا تو سرے سے معلوم ہی نہیں ہے کہ قومی معیشت میں بنیادی خرابیاں کیا کیا ہیں اور اسے ان بنیادی خرابیوں کے حل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیے یا پھر وہ دانستہ معاملات کو ایسی سمت میں لے جا رہی ہے جس کا نتیجہ مکمل تباہی کے سوا کسی صورت میں نہیں نکل سکتا۔

خود ماہرین بتا رہے ہیں کہ سود کی شرح میں اضافہ افراط زر عرف مہنگائی کو روکنے کے لئے کارآمد نہیں تو حکومت کو سود جیسی لعنت سے چھٹکارے کی کوئی تدبیر اختیار کرنے میں کیا امر مانع ہے اور ماہرین اس کا بالکل آسان حل بھی تجویز کر چکے ہیں اور حکومت ان ہی چیزوں کو مہنگا کرتی چلی جا رہی ہے۔ گویا اسے اسی ایجنڈے کی تکمیل کے لئے مسلط کیا گیا ہے۔ باقی دیگر تمام امور اور ؟؟؟امدادوشمار سے عوام کو کوئی دلچسپی نہیں رہی، اب ان کو صرف اپنی دال روٹی اور جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ امریکہ سے کیا مذاکرات ہوئے اور ان سے کیا حاصل ہوا، اس سے عوام کی مشکلات کتنی کم ہونے کے آثار پیدا ہوئے، اس بارے میں امریکی اخبارات ہی کی حالیہ رپورٹیں کافی ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ ان تاریخی مذاکرات سے پاکستان کو کچھ نہیں ملا (کچھ اور لوگوں کا ''بھلا''

ہو گیا ہو تو اور بات ہے اور اب تک یہی ہوتا بھی آیا ہے) پیپلز پارٹی اپنے اتحادیوں کے ساتھ روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر اقتدار میں آئی تھی۔ اس نے دو برسوں میں قوم کو جو کچھ دیا ہے وہ ان چند جھلکیوں میں واضح ہے اور مستقبل کا نقشہ بھی ان ہی میں عیاں ہے۔ اب پیپلز پارٹی کو خود ہی فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اسے عوام کے مسائل حل کرنے کے لئے سنجیدگی سے اقدامات کرنا ہیں یا پھر وہ اپنے ہی خلاف ایک اور ہنگامہ خیز تحریک کا مقابلہ کرے گی؟

(مئی 2010ء)

لوڈشیڈنگ، مہنگائی، ہنگامہ آرائی

پاکستان شاید دنیا کا واحد ایسا ملک ہے جہاں کوئی بھی کام ناممکن نہیں، رشوت، ملاوٹ، اقربا پروری، اختیارات کا ناجائز استعمال، میرٹ کی خلاف ورزی، غرض بہ لحاظ عہدہ جس شخص کا جتنا اختیار چلتا اور طاقت ساتھ دیتی ہے وہ اتنا ہی اس ملک اور اس کے مظلوم عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے۔ پالیسیاں، منصوبے، پانچ اور دس سالہ پروگراموں کے اعلانات صرف اخبارات اور کاغذوں تک محدود ہوتے ہیں جبکہ زمینی حقائق اس کے برعکس ہیں۔ پاکستان کے حالات دیکھ کر اللہ تعالیٰ پر ایمان مزید پختہ اور مضبوط ہو جاتا ہے کہ واقعی کوئی طاقت ایسی ہے جو ایسی مملکت خداداد کو چلا رہی ہے، کیونکہ اس کا قیام ایک معجزے سے کم نہیں اور اس کا 63 سال تک چلنا ایک کرشمہ ہی ہے۔ امن وامان، لوڈشیڈنگ، صنعتوں کی بندش، بیروزگاری، مہنگائی، تعلیمی حالت کی ابتری، پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں آئے روز اضافہ، من مانے کرایوں کی وصولی، جعلی ہاؤسنگ سوسائٹیاں، اشیائے خوردونوش کی چیزوں میں ملاوٹ، جعلی ادویات کی دھڑلے سے فروخت، ڈاکٹروں، افسروں، ٹھیکیداروں کی کمیشن کے چرچے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مہنگائی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں صرف اور صرف غریبوں کی مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مہنگائی میں کمی

سے متعلق حکومتی دعوے اور وعدے بھی زور وشور سے جاری ہیں لیکن ان پر عملدرآمد صرف زبانی جمع خرچ تک ہی محدود ہے۔ وفاقی ادارہ شماریات کی جانب سے جاری کردہ نئے اعدادوشمار کے مطابق 8اپریل 2010ء کو ختم ہونے والے ہفتے کے دوران اشیائے خوردونوش کی قیمتوں میں گزشتہ سال کے مقابلے میں 18.4 اور گزشتہ ہفتے کی نسبت 79. فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ایک ہفتے کے دوران روزمرہ استعمال کی 53 اشیاء میں سے 25 کی قیمتوں میں اضافہ 8 میں کمی اور 20 میں استحکام رہا۔ گزشتہ ہفتے پیاز، ٹماٹر، دال ماش، دال مونگ، آلو، انڈے اور لہسن کی قیمتوں میں اضافہ ہوا جبکہ ایل پی جی، گیہوں، سرخ مرچ، کھلا گھی اور جلانے کی لکڑی سستی ہوگئی۔ بجلی کی لوڈشیڈنگ نے ملک کی ترقی کے پہیئے کو مکمل طور پر جام کر دیا ہے روزانہ پرتشدد مظاہرے ہو رہے ہیں لیکن ہمارے حکمران اپنی عادات اور خصلتوں کے مطابق قصوروار سابقہ حکومتوں کو ہی قرار دے رہے ہیں موجودہ عوامی حکومت کو برسراقتدار آئے 2 سال ہوگئے ہیں لیکن اس نے بھی بحران کے حل پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی یہی وجہ ہے کہ صنعتوں اور کارخانوں کی بندش سے لاکھوں مزدور بے روزگار اور ہزاروں کارخانے بند ہوگئے ہیں، چھوٹی سطح پر بھی کاروباری طبقہ پریشانیوں کا شکار ہے۔ حکمرانوں کی غفلت اور لاپرواہی وعدم توجہی کے باعث ہی آج بجلی کا شارٹ فال 5000 میگاواٹ تک پہنچ گیا ہے۔ وفاقی وزیر پانی و بجلی راجہ پرویز اشرف کے مطابق پیپکو میں ہنگامی حالت نافذ کر دی گئی ہے۔ موجودہ صورتحال کے مطابق بجلی کی طلب 15000 میگاواٹ جبکہ پیداوار 1000 میگاواٹ ہے تاہم انہوں نے حسب روایت یہ خوشخبری بھی سنا دی ہے کہ اگلے ماہ سے بجلی کی صورتحال قدرے بہتر ہو جائے گی۔ ملک کی معاشی ترقی اور خوشحالی کے لئے بجلی، تیل اور ایندھن کے دوسرے وسائل کا دستیاب ہونا بہت ضروری ہے تقریباً ہر قسم کے کارخانے لگانے یا آمدورفت کے ذرائع بڑھانے کے لئے بجلی یا تیل کی فراہمی اولین شرط ہے۔ بجلی، تیل اور اس قسم کے دوسرے ایندھن سستے داموں اور آسانی سے جہاں ملتے ہیں تو وہاں قسم قسم کی چیزیں بنتی ہیں، پیداوار بڑھتی ہے، لوگ برسرروزگار

ہوتے ہیں ہر جگہ فراوانی اور خوشحالی ہوتی ہے۔ پاکستان پر اللہ تعالیٰ کا یہ ایک عظیم انعام ہے کہ ہمارے ملک میں کوئلہ، تیل، معدنیات اور قدرتی گیس کے ذخائر موجود ہیں۔ لیکن انہیں استعمال میں لانے کے لئے عملی اقدامات آخر کون اٹھائے گا؟ حکمرانوں کی لاعلمی کوتاہی اور غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے رعایا کو ہی تکلیف اور مشکلات اٹھانی پڑتی ہیں۔ پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں اضافہ اور کمی کے لئے قائم کی گئی آئل اینڈ گیس ریگولیٹری اتھارٹی خودسر اور بے لگام منہ زور گھوڑے کی مانند ہر ماہ قیمتوں میں اضافے کا بم عوام پر گرا دیتی ہے لیکن جب کمی کی جاتی ہے تو اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف۔ گیس کے نرخوں میں 20 فیصد اضافے کا بوجھ بھی عوام پر جلد ہی ڈالا جائے گا جبکہ یوٹیلٹی سٹورز کارپوریشن کی جانب سے سبسڈی کی مد میں طلب کئے جانے والے فنڈز کی ادائیگی سے انکار کے باعث چینی کے نرخوں میں 15 روپے فی کلو اضافے کے منصوبے بنا رہی ہے جس کے تحت پہلے مرحلے میں 10 روپے فی کلو قیمت بڑھائی جائے گی جبکہ دوسرے مرحلے میں 5 روپے مزید اضافہ کیا جائے گا عوام کو ریلیف دینے کی بجائے انہیں مشکلات و مصائب میں مبتلا کرنے والے تجربے بلاخوف وخطر جاری ہیں۔ دوسری جانب سب سے زیادہ متاثرہ سرکاری ملازمین کو صرف پے اینڈ پنشن کمیشن کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے جس کی رپورٹ کے انتظار میں مہنگائی 200 فیصد سے بھی بڑھ گئی ہے اطلاعات کے مطابق پے اینڈ پنشن کمیشن نے حکومت کو اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے جس میں سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں 50 فیصد اضافے کی سفارش کی گئی ہے یہاں بھی سرکاری ملازمین کے ساتھ الفاظ کی جادوگری اور اعدادوشمار کے ہیرپھیر کا گورکھ دھندہ کھیلتے ہوئے یہ اضافہ 3 برسوں میں کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے جس کے بعد یہ حقیقت آشکارہ ہوگئی ہے کہ 50 فیصد اضافے کا مطلب سالانہ 15 فیصد اضافہ ہے۔ 3 سال بعد مہنگائی کہاں تک پہنچی ہوگی حکمرانوں کو اس سے کیا غرض؟ دوسری جانب اگر صرافہ مارکیٹوں کی صورتحال پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں پر بھی پریشانی اور جمود کا عالم ہے عالمی سٹہ بازوں کے باعث صرافہ مارکیٹ عدم استحکام

سے دوچار ہے گزشتہ 2 ماہ تک قیمتوں میں معمولی اتار چڑھاؤ دیکھنے میں آیا تاہم اپریل کے پہلے ہفتے میں ایک بار پھر سونے کے نرخوں میں اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے اور گزشتہ ہفتے میں سونے کے فی تولہ نرخ میں 1000 روپے کا اضافہ ہوا، واقف کار حلقوں کے مطابق سونے کی قیمتوں میں مزید اضافہ متوقع ہے صرافہ ایسوی ایشن کے بعض عہدیداروں کے مطابق قیمتوں میں عدم استحکام کے باعث دکاندار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں کاروبار تباہ ہوکر رہ گئے ہیں انہوں نے کہا کہ خریدار 37000 اور 40000 روپے فی تولہ سونا خریدنے کے لئے بھی تیار ہیں کیونکہ یہ شادی کے لئے ایک بنیادی ضرورت سمجھی جاتی ہے لیکن قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے باعث گاہک خریداری سے گریزاں ہیں۔ پراپرٹی کی قیمتوں میں بھی اب تیزی آرہی ہے۔ اور دو تین سال قبل والی صورتحال دوبارہ پیدا ہورہی ہے آئندہ چند ماہ میں پراپرٹی کی قیمتوں میں مزید اضافہ متوقع ہے۔ آخر میں صرف اتنا عرض ہے کہ غریبوں کی حالت زار کی طرف کون توجہ دے گا جسے نہ تو زمین اور سونے کی ضرورت ہے اور نہ ہی وہ اس کے حصول کا سوچ سکتے ہیں انہیں تو بنیادی ضروریات چاہئیں تاکہ وہ دو وقت کی روٹی تو سکون سے کھاسکیں۔

اس وقت پاکستان کے عوام کو مہنگائی کے سخت ترین دور کا سامنا ہے، اشیائے خورد ونوش کے نرخ آسمان کو چھو رہے ہیں، بالخصوص صوبہ خیبر پختونخوا میں تو آٹے کے نرخ صارفین کی قوت خرید سے باہر ہوگئے ہیں، یہاں پر پنجاب کی نسبت مہنگے داموں آٹا دستیاب ہے، لیکن غربت اور امن وامان کی مخدوش صورتحال کے پیش نظر انڈسٹریوں کی بندش کے باعث بے روزگاری میں اس قدر اضافہ ہوا ہے کہ اب مزدور طبقہ نان شبینہ کے لئے پریشان ہے، وہ آٹے کا توڑا خریدنے کی سکت نہیں رکھتا۔ مجبوراً وہ کلو دو کلو کھلا آٹا خرید کر بچوں کا پیٹ پال رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکیٹ میں آٹے کی بہتات ہے۔ خریدنے والا کوئی نہیں، دوسری طرف افغانستان کو آٹے کی سمگلنگ بھی ختم ہوگئی ہے۔ گزشتہ دنوں وفاقی حکومت نے بھی قومی اسمبلی میں کہا ہے کہ اس کے پاس فاضل گندم موجود ہے۔ وفاقی

حکومت کے مطابق گزشتہ سال کی وافر گندم بچ جانے کے باعث حکومت نے فوری طور پر بیس لاکھ ٹن گندم پر برآمد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ نئی گندم کی خریداری کے لئے ذخیروں میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ افغانستان کو گندم فراہم کی جارہی ہے۔ تاہم افغانستان میں گندم پاکستان سے سستی ہونے کے باعث سمگلنگ رک گئی ہے۔ جمعہ کو وقفہ سوالات کے دوران پارلیمانی سیکرٹری برائے خوراک لیاقت علی خان نے کہا ہے کہ آج کل افغانستان میں گندم اور آٹے کی قیمت پاکستان سے کم ہے جس کے باعث سمگلنگ رکی ہوئی ہے۔ اس وقت افغانستان میں گندم کی قیمت ساڑھے ساتھ سو روپے فی من ہے۔ جبکہ پاکستان میں اس کی فی من قیمت ساڑھے نو سو روپے ہے۔ گزشتہ دنوں وزیراعظم کی زیر صدارت اجلاس میں گزشتہ سال کی موجود بیس لاکھ ٹن گندم فوری طور پر برآمد کرنے کا فیصلہ کیا۔ جبکہ نئی گندم کی خریداری کے لے، وفاقی حکومت پنجاب کو ہر ممکن مدد اور فنڈز فراہم کرے گی اس وقت پنجاب میں گزشتہ سال کی تیس لاکھ ٹن گندم اضافی موجود ہے۔ ابھی تک صوبوں نے گزشتہ سال کی گندم کی خریداری بھی مکمل نہیں کی ہے۔ حکومت کے پاس نئی گندم رکھنے کے لئے جگہ کی کمی ہے جس کے باعث بیس لاکھ ٹن گندم برآمد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جس کے بعد بھی وافر گندم موجود ہوگی۔ ان حالات میں کیا یہ ممکن نہیں کہ حکومت فاضل گندم برآمد کرنے کی بجائے اس کا فائدہ ملک کے غریب خاص کر صوبہ خیبر پختونخوا کے غریب عوام کو پہنچائے۔ جو فائن آٹے کے لئے ترس گئے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ جب گندم کا اتنا بڑا اسٹاک حکومت کے پاس موجود ہے اور اگلی گندم سٹاک کرنے کا انتظار بھی کرنا ہے اس صورت میں موجود سٹاک کو ملکی عوام کے لئے ہی استعمال کیا جائے، آٹے کے نرخوں میں فوری طور پر کمی کی جائے۔ جو ریٹ اس وقت افغانستان میں ہے اسی ریٹ پر پاکستانی عوام کو آٹا فراہم کیا جائے۔ اس سے گندم کے خراب ہونے کا بھی امکان نہیں رہے گا اور غریب عوام بھی حکومتی ریلیف سے مستفید ہوسکیں گے۔

(مئی 2010ء)

توانائی کا بحران

صدیوں سے دنیا کئی بحرانوں کا شکار ہے۔ کسی ملک میں سیاسی بحران ہے تو کہیں غلہ کا بحران ہے۔ کئی ممالک مالی و معاشی بحران میں مبتلا ہیں مگر محنت میں عظمت ہے۔ جاپانیوں، چینیوں اور کوریائیوں نے بے پناہ محنت سے وہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ان ممالک کا ہر باشندہ ملک کے لئے سوچتا ہے۔ اپنی ذات سے بالاتر ہو کر ملک کے لئے کام کرتا ہے اور ہم ذات کو پہلے ترجیح دیتے ہیں اس کے بعد ملک کی سوچتے ہیں۔ جب تک اجتماعی سوچ پیدا نہیں ہو گی ملک بحرانوں کا شکار رہے گا۔ پاکستان کو قدرت نے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ ملک کئی پوشیدہ خزانوں سے مالا مال ہے مگر ان کو تلاش کرنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ دنیا کی بہترین زرعی زمین ہمارے پاس ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا اور موثر نہری نظام ہمارے ملک میں ہے مگر زرعی اجناس نصف صدی گزرنے کے باوجود آج بھی درآمد کرتے ہیں۔ ان میں سرفہرست خوردنی تیل اور گندم ہے۔ چینی کے پچاس کارخانے ملک میں ہیں، مگر ہم چینی درآمد کرتے ہیں۔ زمینوں کو سدھارنے کی کوشش نہیں کرتے۔ سیم اور تھور کے مسائل جوں کے توں ہیں۔ پالیسیوں پر پالیسی بناتے رہتے ہیں مگر مسائل ہیں کہ حل ہونے کا نام نہیں لیتے۔

اس وقت ملک انرجی یا توانائی کے بحران کا شکار ہے۔ ہم الزام دریاؤں میں پانی کی قلت کو دیتے ہیں کہ ڈیموں میں پانی کی مطلوبہ سطح نہیں ہے مگر یہ چیز پہلے سے ذہن میں رکھنی چاہیے تھی ن کوئی نہ کوئی متبادل نظام رکھنا تھا کہ سردیوں میں توانائی کی رسد کو کس طرح برقرار رکھا جائے۔ اس انائی کے بحران سے زرعی نقصان کے علاوہ صنعتی نقصان کا اندازہ عام آدمی بھی لگا سکتا ہے تو تعلقہ حضرات نے اس چیز کو کس طرح نظر انداز کیا۔

پاکستان توانائی کے وسائل سے بھی مالا مال ہے مگر ان کی تلاش کے لئے منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ قدرتی گیس کے وافر ذخائر موجود ہیں جو ہماری توانائی کی ضرورت خاصی حد تک پوری کرتے ہیں۔ تیل بھی موجود ہے مگر اس قدر نہیں ہے کہ تیل کی مکمل ضروریات پورا کر سکے۔ کوئلہ میں اب ثابت ہو چکا ہے کہ ہم بہت بڑے ذخائر کے مالک ہیں مگر کوئلہ عمدہ قسم کا نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں آبی ذخائر بھی موجود ہیں اور آبی توانائی بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ مزید توانائی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگر قدرتی گیس ملک میں نہ ہوتی تو توانائی کی صورتحال بدترین ہوتی۔ اس وقت توانائی کا بحران ڈیموں کی وجہ سے ہے۔ تربیلا بند کے بعد دوسرا بند تعمیر نہیں ہوا صرف منصوبہ بندی ہوتی رہی۔ اگرچہ کئی امکانات ہیں کہ آبی توانائی حاصل ہو سکتی۔ دیر آئید درست آئید کے اصول پر اب بھی موقع ہے کہ آبی ذرائع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ س کے علاوہ متبادل ذرائع بھی ہونے چاہئیں۔ بجلی، گیس، تیل اور کوئلہ سے بجلی پیدا کرنے کے کارخانے لگائے جائیں تا کہ بنیادی ضرورت بجلی وافر مقدار میں دستیاب رہے اور اس طرح ملک زرعی اور صنعتی ترقی کر سکے۔ ڈیموں کے ذریعہ بجلی پیدا کرنے کو ترجیح دی ج ائے اس کے چار پانچ فوائد ہیں اور ان کی تعمیری لاگت پانچ سال سے بھی کم عرصہ میں حاصل ہو جاتی ہے بجلی پیدا کرنا ان کا اولین فائدہ ہے اس کے بعد زرعی ترقی ہے۔ پانی کی حسب ضرورت کھیتوں کو فراہمی اور جہاں نہری زمینیں نہیں ہیں وہاں پر ٹیوب ویلوں کے ذریعے پانی کی فراہمی وغیرہ۔ واضح رہے کہ ٹیوب ویل بجلی سے چلتے

ہیں۔ان ڈیموں کی بدولت صنعتی ترقی بھی ہوگی اور کارخانے بجلی کی مسلسل فراہمی کی وجہ سے
پیداوار دیں گے۔آج کل ساٹھ فیصد پیداوار بجلی کی عدم دستیبی کی وجہ سے کم ہو جاتی ہے جس کا
برآمد میں کمی اور بے روزگاری ہیں۔کئی لاکھ گھنٹے قوم کے ضائع ہو جاتے ہیں۔ڈیموں سے بجلی
کرنا بھی تجدیدی توانائی کے زمرے میں آتا ہے کہ قدرت پانی مسلسل نظام کے ذریعہ ڈیمو
فراہم کرتی رہتی ہے۔ان میں کوئی خام مال استعمال نہیں ہوتا۔صرف پانی اور پانی۔ہمارے پ
برف کی شکل میں پانی محفوظ کرتے ہیں۔اس طرح سے بجلی پیدا کرنے سے ماحول آلودہ نہیں ہ
ہے۔ان ذرائع میں پن بجلی مسلم الثبوت توانائی ہے۔ان ذرائع کو کئی ممالک میں بہت عمدہ طر
سے چلا کر بہت زیادہ مقدار میں بجلی حاصل کی جا رہی ہے۔پن بجلی کے ڈیموں کے ذریعہ حسب
ضرورت پانی دریاؤں اور نہروں میں رواں کیا جاتا ہے۔پانی بلاوجہ ضائع نہیں ہوتا ہے۔اس
ذریعے پانی کی سطح دریاؤں اور انہار کے اردگرد میں پھیلنے سے روکا جاتا ہے۔اس کے علا
ڈیموں سے سیلاب کو بھی قابو کیا جاتا ہے۔سیلابوں سے ہر سال کروڑوں روپے کا نقصان ہو
ہے۔ڈیموں سے ماحولیاتی آلودگی نہیں ہوتی۔پن بجلی پیدا کرنے کے لئے صرف پانی
ضرورت ہوتی ہے اور وہ استعمال کے بعد بھی کام آتا ہے۔یعنی پن بجلی پیدا کرنے کے کئی فوا
ہیں۔لہٰذا وقت ضائع کیے بغیر پن بجلی کے منصوبوں پر عملی کام شروع کیا جائے۔اس پر خرچ کیا
نے والا سرمایہ بہت کم عرصہ (یعنی پانچ سال سے بھی کم) میں وصول ہو جائے گا۔عمدہ فصل، زیاد
اور مسلسل صنعتی پیداوار ملک میں خوشحالی لائے گی اور آلودگی سے بھی نجات مل جائے گی۔سیلابوں
زیر کیا جا سکے گا۔زرعی زمینوں کی بیماری بھی ختم ہو جائے گی۔پانی ضائع ہونے سے بچ جا
گا۔پن بجلی سے روز روز کی لوڈ شیڈنگ سے بھی نجات مل جائے گی۔اگر یہ ڈیم پہلے ہی تعمیر کر لئے
جاتے تو سرمایہ بھی کم خرچ ہوتا اور آج ہم توانائی کا بحران پیدا ہی نہیں ہونے دیتے اور اربوں بلک
کھربوں روپوں کا زرمبادلہ بچا چکے ہوتے۔پن بجلی سے قدرتی گیس اور تیل کی بھی بچت ہوتی۔

م گیس کسی اور مفیصد مقصد کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔واضح رہے کہ گیس سے ملک میں
صنوعی کھاد تیار ہوتی ہے ہم گیس سے مزید دوسری صنعتی اہمیت کی اشیاء تیار کر سکتے تھے۔اسی طرح
لی تیل سے بھی عمدہ قسم کے کیمیکل تیار کر سکتے تھے مگر چونکہ اس طرف توجہ نہیں دی گئی اور ہم
رید زرعی اور صنعتی ترقی سے محروم ہوتے چلے گئے۔زرعی ملک ہونے کے باوجود آج ہم خوردنی
نیاء درآمد کر رہے ہیں۔آج بھی موقع ہے کہ ہم پن بجلی کے ذرائع پر توجہ دیں۔ہمارے خیال
ں اگر کسی مقام پر ایک کلوواٹ بھی پن بجلی پیدا ہو سکتی ہے تو ضرور حاصل کی جائے اور مقامی طور پر
ں بجلی کو استعمال کیا جائے۔

اچھی قومیں مستقبل پر نظر رکھتی ہیں اور جامع منصوبہ بندی کرتی ہیں۔امریکہ میں چھوٹے سے
ہوٹے شہر کی سڑکیں بڑے بڑے شہروں کی سڑکوں کے برابر ہوتی ہیں تاکہ آئندہ پچاس ساٹھ
ال بعد ان سڑکوں کو چوڑا کرنے کی ضرورت نہ پڑے اس طرح پانی کی لائنیں بھی اسی حساب
ے بچھائی جاتی ہیں کہ پچاس ساٹھ سال بعد بھی کارآمد ہوں اور موسمی اثرات سے محفوظ رہیں۔
ہوٹے چھوٹے قصبوں میں بڑے بڑے ریلوں اسٹیشن بس کے اڈے اور ایئرپورٹ ہوتے ہیں
ئی سالوں تک مزید توسیع کی ضرورت نہ پڑے۔ہماری منصوبہ بندی کا یہ حال ہے کہ دس بارہ
ال میں ہی مزید توسیع کی ضرورت ہو جاتی ہے۔بعض اوقات ناقص تعمیری کام سے بھی دوبارہ
یر و مرمت کی ضرورت درکار ہوتی ہے۔

پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار اور بیش قیمت نعمتوں سے نوازا ہے۔قدرتی گیس سوئی کے
نام پر 1952ء میں دریافت ہوئی تھی جو کہ صوبہ بلوچستان میں واقع ہے اور سب سے پہلا گیس
ا چولہا کراچی میں 1955ء میں روشن ہوا تھا۔اس وقت اندازہ تھا کہ یہ ذخائر سو سال تک کارآمد
ہیں گے مگر استعمال کی رفتار سے اب اندازہ ہے کہ صرف 63 سال تک کے لئے کافی ہیں۔
یونکہ اب قدرتی گیس کا استعمال بہت زیادہ ہو گیا ہے۔قدرتی گیس سے کھاد تیار ہوتی ہے اور

بجلی بھی پیدا کی جاتی ہے۔ اس لئے مقام شکر ضرور ہے مگر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے۔ ا
قدرتی گیس نہ ہوتی تو توانائی کی صورت حال بہت زیادہ خراب ہوتی۔ توانائی کسی قوم کی ترقی
پیمانہ ہوتی ہے۔ اس وقت توانائی کے اخراجات کے لحاظ سے امریکہ سرفہرست ہے یہی وجہ ہے
ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کا بے حد ترقی یافتہ ملک ہے۔ امریکہ میں بجلی کے تسلسل کے خلا
کے بارے میں کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر کبھی یہ خلل واقع ہو بھی گیا تو وہاں بڑے مسئلے پ
ہو جائیں گے کیونکہ کثیر المنزلہ عمارتوں میں لفٹیں رک جائیں گی ہوائی اڈے بند ہو جائیں گ
زیر زمین ریلوے کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، ہزاروں آدمی دم گھٹنے سے موت کے منہ میں چ
جائیں گے۔ آخر یہ تسلسل والا بجلی کا نظام بھی تو انسان ہی نے ترتیب دیا ہے۔ ہمارے ملک میں
کیونکر ممکن نہیں ہے۔ قدرتی گیس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وافر مقدار میں پتھر کا کوئلہ، سنگ مرم
تیل، کرومائیٹ وغیرہ وغیرہ جیسی بیش بہا اور بیش قیمت معدنیات سے ہمارے ملک کو نوازا ہے
کوئلہ کافی مقدار میں تمام صوبوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر اس کا استعمال سب سے کم ہے۔ اس کی ک
وجوہ ہیں۔ ان میں روایتی، سستی اور کاہلی کا بھی دخل ہے۔ کوئلے پر جس قدر تحقیق اور ترقی ہو
چاہیے تھی نہیں ہو سکی۔ اب بھی موقع ہے کہ کوئلہ جیسے انعام خداوندی پر توجہ دی جائے۔ کوئلہ سے
مختلف انواع اور اقسام کے کیمیا اور کیمیکلز تیار ہو سکتے ہیں۔ کوئلے کو گیس میں تبدیل کیا جا سک
ہے۔ ہمارے ہاں کوئلہ کے ذخائر 12.5 بلین ٹن ہیں جن میں سے 197.5 ملین ٹن کی پیمائش ک
جا چکی ہے۔ 188.1 ملین ٹن کی نشاندہی کی جا چکی ہے اور 663 ملین ٹن کا صحیح اندازہ ہے
پاکستان ارضیاتی سروے کے ادارے ''جی ایس پی'' کے مطابق سندھ میں نئی دریافت کے ذخائر
تخمینہ ایک سو بلین ٹن لگایا گیا ہے جو کہ ہماری توانائی کی پانچ سو سال کی ضروریات کے لئے کافی
ہیں مگر ان ذخائر کو استعمال میں لانا شرط ہے ملک میں معدنی تیل نکالا جا رہا ہے۔ جس قدر تیل
نکالتے ہیں یا دریافت کرتے ہیں اس وقت تک ملک کی تیل کی ضروریات بڑھ چکی ہوتی ہیں۔ تیل

ضروریات میں سات سے دس فیصد سالانہ اضافہ ہو جاتا ہے اس طرح پچھلے کئی سالوں سے ملکی
وریات کا چالیس فیصد تک کا تیل ملکی ذرائع سے پورا کیا جاتا ہے۔ تیل کی درآمد تقریباً پچاس
د کیروسین یا مٹی کے تیل اور ڈیزل وغیرہ کی صورت میں درآمد ہوتا ہے اور تقریباً اتنا ہی خام تیل
صورت میں درآمد ہوتا ہے جو کہ ملک کی دو تیل صاف کرنے والی ریفائنریوں میں کیا جاتا ہے
کہ گاڑیوں اور دیگر کاموں میں استعمال ہوتا ہے۔ پچھلے پچیس سالوں سے ملک میں کوئی نئی
یفائنری نہیں لگائی گئی ہے اس لئے بھی ہمیں لازمی صاف تیل درآمد کرنا ہوتا ہے جس پر بھاری
مبادلہ خرچ ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا حقائق سے صاف ظاہر ہے کہ جب تک توانائی کے ملکی ذرائع کو ترقی نہیں دی
ئے گی ملک توانائی کے بحران سے نہیں نکل سکے گا بلکہ مزید مسائل کا شکار ہوتا رہے گا اس کے
نیچے میں زرعی، صنعتی اور دیگر ترقی متاثر ہوتی رہے گی۔ توانائی ملک کے لئے روح کی حیثیت رکھتی
ہے۔ لہٰذا اس طرف بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے سب سے پہلے آبی ذرائع پر توجہ دی جائے جو
لہ توانائی کا سب سے آسان اور سستا ذریعہ ہیں اور اس کی مہارت ملک میں دستیاب ہے۔ اس
کے بعد توانائی کا سب سے بڑا منبع کوئلہ ہے اس کے استعمال پر توجہ دی جائے۔ ہمارے مسائل
میں ہی حل کرنا ہیں۔ ہمارے کوئلہ کے لئے باہر کے ماہرین وہ کام نہیں کر سکیں گے جو کہ ایک
کستانی کر سکتا ہے۔ کیونکہ پاکستانی کوئلہ کے مسائل پاکستانی ماہرین ہی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔
ں وقت ملک میں توانائی کا سب سے بڑا ذریعہ کوئلہ ہے اس پر مزید تحقیق اور ترقی کی ضرورت
ہے۔

اس کے علاوہ غیر روایتی ذرائع سے بھی توانائی پیدا کی جا سکتی ہے۔ جس میں شمسی توانائی،
وائی توانائی، جنگلات کی ترقی، بائیوگیس، موجی توانائی اور آبی توانائی وغیرہ شامل ہیں۔

ہائیڈروجن بھی ایک بہت عمدہ صفائی آلودگی سے پاک سستی اور سہل ترین توانائی ہے۔ پانی

ہائیڈروجن کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ہائیڈروجن برقی رو کو پانی میں گزارنے سے حاصل ہوتی
ہے۔ عام خیال ہے کہ 21 ویں صدی کی توانائی کا بڑا ذریعہ ہائیڈروجن ہوگی۔ ہائیڈروجن توانائی
کے لحاظ سے سب سے زیادہ طاقتور توانائی ہے۔ ہائیڈروجن دنیا کا واحد عنصر ہے جس میں نیوٹران
نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جلتی ہے۔ اس توانائی پر توجہ بہت ضروری ہے۔

(مئی 2010ء)

اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیجئے

گزشتہ دو سالوں کے دوران تقریباً 25 سے زائد اشیائے خورد و نوش جن میں چینی، آٹا،
دل، دالیں، مٹن، بیف، مرغی، سبزیاں، مختلف قسم کی دالوں کی قیمتوں میں 100 سے 120
مدتک اضافہ کیا گیا۔ آٹا اور چینی کا بحران ملک بھر میں جاری رہا۔ اس ساری صورتحال سے حکومتی
راء و مشیر بے گانہ و لاتعلق ہی رہے۔ وفاقی ادارہ شماریات کی جون، جولائی 2009ء کی رپورٹ
ے مطابق اشیائے خورد و نوش سمیت ہر چیز کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ پارلیمنٹ میں خود
لومت نے تسلیم کیا ہے کہ 18 فروری 2008 تا یکم فروری 2010ء تک گندم کی قیمت خرید میں
83.6 فیصد چینی 168.55 فیصد، بناسپتی گھی 12.06 فیصد جبکہ پکانے کے تیل کی قیمت میں
10.5 فیصد اضافہ ہوا۔

پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں گزشتہ 2 سال کے دوران متعدد بار اضافہ کیا گیا اور مہنگائی
ے دلدل میں پھنسی اور دہشت گردی کے گرداب میں گھری ہوئی عوام پر وقفے وقفے سے حکومت
ی طرف سے پٹرول اور ڈیزل بم گرائے جاتے رہے۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے سپریم کورٹ
نے جوڈیشل کمیشن تشکیل دیا جس نے انتہائی جانفشانی اور تیز رفتاری کیساتھ اپنی رپورٹ تیار کر

کے پیش کی۔ مذکورہ رپورٹ میں عوام سے ٹیکسز کی آڑ میں عائد ناجائز وصولیوں کی واضح طور پر نشاندہی کی گئی اور اسے غیر منصفانہ اور غیر ضروری قرار دیکر حکومت سے پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں خاطر خواہ کمی کرنے کی سفارشات پر مبنی رپورٹ پیش کی۔ تاہم حکومت نے پٹرولیم ڈویلپمنٹ لیوی کی مد میں ناجائز ٹیکس عائد کر دیا اور اعداد و شمار کی شعبدہ بازیوں اور الفاظ کے ہیر پھیر کے ذریعے بدستور عوام کا خون نچوڑا جاتا رہا۔ ملک میں بدترین مہنگائی کی ایک وجہ جہاں نااہل کابینہ ہے وہاں حکومتی اہلکاروں، وزراء اور مشیروں کی عیاشیوں پر مبنی بیرونی دورے اور اس کے نتیجے میں ہونے والے بھاری بھرکم اخراجات بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سال 2008ء اور 2009ء میں مہنگائی عروج پر رہی اور آئے روز کی مہنگائی، بدامنی، اشیائے ضروریہ کی قلت نے عوام کا جینا دوبھر کیے رکھا ہے۔ جبکہ وزراء، مشیران اور انتظامی افسران نے اپنے اخراجات میں کوئی کمی نہیں کی۔

گزشتہ دو سالوں کے دوران موجودہ حکومت نے تعلیم اور صحت کی مد میں مختص کی گئی رقوم میں تاریخی کمی کی ہے۔ 30 جون 2009ء کو ختم ہونے والے مالی سال میں یہ بالترتیب 1.1 اور 0.3 فیصد رہیں۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے تعلیم اور صحت کے میدان میں اس تناسب میں رقوم خرچ نہیں کی گئی تھیں۔ معاشی تجزیہ نگاروں کے مطابق 1990ء کی دہائی کو فوجی ڈکٹیٹر پرویز مشرف کے دور میں اسٹیٹ بنک نے بھی معیشت کے لحاظ سے ناکام دہائی قرار دی تھی۔ مگر اس دہائی میں بھی تعلیم کی مد میں 2.3 فیصد اور صحت کی مد میں 0.7 فیصد رقوم خرچ کی گئی تھیں۔ مالی سال 2009ء میں مجموعی ملکی پیداوار کے تناسب سے تعلیم اور صحت کی مد میں خرچ کی جانے والی یہ رقوم افریقہ کے بہت سے انتہائی غریب ملکوں کے مقابلے میں بھی انتہائی کم ہیں۔ جبکہ حکمران کے سرکاری خرچ اور ٹھاٹھ باٹھ ترقی یافتہ ممالک کے حکمرانوں سے بھی زیادہ ہیں۔ وفاقی حکومت کی طرف سے تعلیمی پالیسی کا جو اعلان کیا گیا تھا وہ ابھی تک اوراق میں ہی ہے۔ اساتذہ کے مسائل، پاکستان کے مختلف حصوں میں اساتذہ کی تنخواہوں اور مراعات میں کمی، بڑے شہروں میں یونیورسٹیز اور کالجز

میں رہائشوں کی کمی، خصوصاً طالبات کے لئے گھر سے باہر تعلیم حاصل کرنا ایک عذاب سے کم نہیں ہے۔ یونیورسٹیز اور کالجز بھاری فیسوں کے عوض داخلہ تو دے دیتے ہیں لیکن طالبان کو ان تعلیمی اداروں میں رہائش کی سہولت نہیں دی جاتی جس کی وجہ سے ان کو نجی ہاسٹلز کا دست نگر بنا دیا گیا ہے۔ ٹرانسپورٹ اور رہائشی مسائل کی وجہ سے تعلیمی معیار دن بدن خراب ہوتا جا رہا ہے۔ موجودہ حکومت نے ان دو سالوں کے دوران پورے ملک میں تو کجا صرف وفاقی دارالحکومت میں بھی طالبات اور ملازمت پیشہ خواتین کے لئے باعزت ٹرانسپورٹ اور رہائش کا کوئی بندوبست نہیں کیا۔ سرکاری اور نجی یونیورسٹیز اور کالجز کو طالبات کے لئے باعزت رہائش گاہوں کی فراہمی کا پابند کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح صحت کو تو اپنی ترجیحات کا حصہ ہی نہیں بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ این جی اوز کی طرف سے دیے گئے ایجنڈے کے مطابق ملکی وسائل کا ضیاع جاری ہے۔ وزارت صحت میں حکومتی عہدیداروں کی ساری کوشش اسلامی نظام زندگی کے برعکس مغربی لائف سٹائل کی جانب راغب کرنے پر لگی ہوئی ہے جبکہ پاکستان میں جہاں جعلی ادویات کی فروخت کثرت سے جاری ہے وہاں ادویات کی قیمتیں بغیر کسی حدود و قیود کے مقرر کی گئی ہیں۔ کوئی موثر پرائس کنٹرول کمیٹی نہیں ہے جو ان ڈرگ کمپنیوں کو قیمتیں بڑھانے سے روک سکیں۔

گزشتہ 2 سال کے دوران کرپشن کے سابقہ ریکارڈ توڑے گئے۔ کرپشن کی اجتماعی اور انفرادی ہر سطح پر حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ قومی اداروں کو ذاتی جاگیر سمجھ کر لوٹا جا رہا ہے۔ نجی سیکٹر میں کی گئی سرمایہ کاری عدم تحفظ کا شکار رہی۔ وزارتوں اور دیگر سرکاری اداروں میں قواعد سے ہٹ کر بھرتیاں کی گئیں اور من پسند افراد کو نوازنے کا سلسلہ جاری رہا۔ سرکاری اداروں میں بھرتیوں کے حوالے سے اشتہارات تو دیئے گئے اور اس کے نتیجے میں ملک بھر سے لاکھوں کی تعداد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے درخواستیں بھی جمع کرائیں اور انٹرویو بھی دیئے۔ لیکن پہلے سے طے شدہ ''فارمولے'' کے تحت مخصوص لوگوں کو ہی نوکریاں مل سکیں اور جو

واقعی حقدار تھے وہ محروم رہے۔ انتظامی کرپشن کی یہ بدترین مثال ہے۔ سابقہ حکومتوں کی طرح موجودہ حکومت نے بھی اپنے اتحادیوں کو ساتھ رکھنے کے لئے وزارتوں اور نوکریوں کا لالچ دیکر راضی کرلیا۔ اس طرح حکومت نے اپنے اور اپنی اتحادی جماعتوں کے مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیتے ہوئے قومی دولت کی بندر بانٹ کی روش قائم رکھی اور اس میں نئی جہتیں اور مثالیں قائم کیں۔ آؤٹ آف ٹرن بھرتیاں، سینئر افسران کو نظر انداز کر کے جونیئر افراد کو آگے لانا، غیر متعلقہ اہلیت کے حامل افراد کو عہدے دینا اور پاکستان بیت المال کے دروازے پارٹی کے جیالوں کیلئے کھول دینا اس کی چند مثالیں ہیں۔ ملک میں ہائیڈرو پاور جنرل کے ذریعے 54 میگاواٹ تک بجلی پیدا کی جاسکتی ہے جبکہ اس وقت ملک بھر کی بجلی کی مجموعی ضرورت کم و بیش 13 میگاواٹ بنتی ہے۔ اس کے باوجود مینٹل پاور جیسے مہنگے اور غیر ضروری منصوبے شروع کرا کر حکومت کرپشن کی نئی مثالیں قائم کررہی ہیں۔ کرپشن کے روک تھام کے حوالے سے کام کرنے والے ایک بین الاقوامی ادارہ ٹرانسپیرنسی انٹرنشنل نے اپنی رپورٹ برائے سال 2009ء میں واضح طور پر نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "Pakistan Climbs 5 places to 42nd most corrupt country in 2009" اپنی مذکورہ رپورٹ میں ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل آگے چل کر مزید لکھتا ہے۔ "Pakistani needs immediate enforcement good governance and a transparent administration to counter the acute problems, the billion of rupees corruption scams reported in the Pakistan Steel, TDAP, EOBI, PIA, rentel power plants, KESC, NIC, NHA, OGDC, PSO, PEPCO, CDA, DP Division, DHAs, the NBP and many other organisations."

اسٹیٹ بنک نے سپریم کورٹ میں حال ہی میں ملک کی مقتدر شخصیات کو معاف کرائے گئے قرضوں کی جو فہرست پیش کی ہے اس کے مطابق سال 1997ء سے لیکر 2009ء تک مختلف بنکوں اور مالیاتی اداروں کی طرف گزشتہ 12 سال کے عرصے میں 17 ہزار سے زائد افراد نے 19.3 ارب روپے کے قرضے معاف کرائے گئے۔

گزشتہ 2 سال کے دوران بیرونی قرضوں کے حجم میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا اور بیرونی قرضوں کی مد میں پاکستان کے ذمہ واجب الادا رقم کی مالیت میں 3 کھرب روپے کا ریکارڈ اضافہ ہوا۔ صرف سود کی مد میں حکومت کو سال 11-2010ء میں 745 ارب روپے ادا کرنے پڑیں گے۔ اس کے بعد یہی رقم بڑھ کر 1,000 ارب روپے ہوجائے گی۔ سال 11-2010ء میں کل آمدنی سے وفاق کو 719 ارب روپے ملیں گے جب مذکورہ سال کیلئے سود کی مد میں واجب الادا رقم کی مالیت اس سے زائد یعنی 745 ارب روپے حکومت نے ادا کرنے ہیں۔ آئی ایم ایف سے کڑی اور عوام دشمن و ملک دشمن شرائط پر نئے قرضوں کے حصول نے عام آدمی پر ناقابل برداشت مہنگائی کا ایسا بوجھ ڈال دیا ہے کہ جسے اٹھانا اب اس کے بس سے باہر ہے۔ آئی ایم ایف کی فرمانبرداری میں ہر ماہ پٹرولیم مصنوعات بجلی، گیس اور دیگر اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ حکومت کی عادت بن کر رہ گئی ہے اور انہیں اپنے عام شہری پر ذرا بھی ترس نہیں آرہا۔

پاکستان کی دگرگوں معاشی صورتحال کی ذمہ داری جہاں اداروں کے اندر بیٹھے نااہل انتظامی افسران پر عائد ہوتی ہے وہاں موجود حکومت کی شاہ خرچیاں، عیاشیاں اور وزراء کی فوج ظفر موج بھی معاشی بحران میں برابر کی شریک ہے۔ کھربوں کے قرضے معاف کرانے والے این آر او زدہ وزراء اور دیگر حکومتی اہلکاروں سے اگر مذکورہ رقم بازیاب کرائی جائے تو پاکستان آئی ایم ایف جیسے بین الاقوامی ادارے سے قرض کی بھیک مانگنے کی بجائے قرضے دینے کی پوزیشن میں آجائے گا۔ موجودہ حکومت نے عوام کو آئی ایم ایف کے جال میں پھنسایا ہے اور اس کی ساری شرائط قبول کر کے پیداواری عمل کو

بری طرح متاثر کیا گیا ہے۔ اسٹیٹ بنک کا ڈسکاؤنٹ ریٹ 15 فیصد ہے جس کی وجہ سے سرمایہ کاری ختم ہوکر رہ گئی ہے۔ 20 سے 24 فیصد سود پر قرضے لے کر کون کاروبار کرسکتا ہے؟ تیل کی قیمتیں عالمی منڈیوں میں 148 ڈالر فی بیرل سے کم ہوکر 40 اور 36 ڈالر فی بیرل تک گر گئیں، لیکن حکومت نے تیل کی قیمتوں میں کمی کرکے عوام کو ریلیف فراہم نہیں کیا۔ ایک اندازے کے مطابق حکومت عوام سے پٹرولیم مصنوعات پر عائد ٹیکسوں کے ذریعے 80 ارب روپے سے زائد کما رہی ہے۔

موجودہ حکومت نے اپنے قیام سے ہی عدلیہ کی آزادی کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ عوام کو دھوکہ دینے کیلئے تو متعدد بار عدلیہ کی آزادی کا اعتراف کیا گیا لیکن عملاً جس طریقہ سے 16 اکتوبر 2008ء کے دن عوام نے خود عدلیہ کو بحال کرایا (اس سے پہلے صدر صاحب نے خود کہا کہ عوام نے عدلیہ کی آزادی کے لئے ووٹ نہیں دیئے بلکہ روٹی، کپڑا اور مکان کے لئے ووٹ دیئے ہیں)۔ پٹرولیم مصنوعات اور چینی کی قیمتوں میں ناجائز اضافہ اور بحران کے خلاف سپریم کورٹ کے فیصلہ پر عملدرآمد کرنے کی بجائے پٹرولیم مصنوعات پر پٹرولیم ڈویلپمنٹ لیوی لگائی گئی اور چینی مافیا کے خلاف کسی قسم کی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی۔ بلکہ سپریم کورٹ کے واضح حکم میں چینی کی متعین کردہ قیمت کے باوجود حکومت اور بالخصوص وفاقی حکومت کی طرف سے چینی مافیا کو اپنی صفوں سے نکالنے کے لئے کسی کارروائی کی بجائے ان کی حمایت کی گئی اور اس طرح اس فیصلہ پر بھی عملدرآمد نہ ہوسکا۔ جس کے نتیجے میں آج چینی کی فی کلو قیمت 80 روپے تک پہنچ گئی ہے اور ملک بھر میں چینی کی شدید قلت کے باعث سنگین بحران کا سامنا ہے۔ این آر او جیسا کالا قانون جو پرویز مشرف نے پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کو کلین چٹ دینے کے لئے نافذ کیا تھا، اس کا دفاع کیا گیا اور کہا گیا کہ پارلیمنٹ اسے پاس کرے گی۔ تاہم شدید عوامی دباؤ کے باعث حکومت کو اپنی اس خواہش کی تکمیل میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور پارلیمنٹ نے اسے منظور کرنے سے صاف انکار کرکے حکومتی بدعنوانیوں کا پردہ چاک کیا۔

(جون 2010ء)

لوٹ مار، دھونس دھاندلی کب تک؟

دو سال سے زائد عرصہ سے برسراقتدار حکومت نے مثبت تنقید کو اپنی چڑ بنالیا ہے اور ہر وہ شخص ان کے نزدیک معتوب ہے جو حکومتی غلطیوں کی نشاندہی کرے، سیاست کے حوالے سے جو گل کھلائے جارہے ہیں اس سے تو پاکستانی بخوبی آگاہ ہیں کیونکہ ہمارے چینلز کا یہ مرغوب موضوع ہے لیکن معیشت کے حوالے سے پاکستان کو تحت الثریٰ کی جن گہرائیوں میں دھکیلا جارہا ہے اس کا تصور بھی لرزا دینے والا ہے۔

عالمی بینک نے حال ہی میں جاری کی جانے والی اپنی رپورٹ میں پاکستان کو بدحال معیشت والے ملکوں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ اس سے قبل افغانستان اور نیپال اس فہرست میں موجود تھے۔ ورلڈ بینک کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں دہشت گردی اور امن وامان کے مسائل گزشتہ چند سالوں سے کافی حد تک بڑھ چکے ہیں جس کی وجہ سے یہاں کی معیشت بالکل تباہ ہوکر رہ گئی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اگرچہ پاکستان میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات اب تک افغانستان کی نہج تک نہیں پہنچے ہیں مگر اس کے باوجود حالات اتنے خراب ہیں کہ آئندہ چند سالوں میں معیشت کی بحالی کے امکانات نظر نہیں آتے۔

عالمی بینک کی اس رپورٹ نے جہاں معاشی ترقی کے حکومتی دعوؤں کی قلعی کھول دی ہے وہیں دنیا بھر کے ترقی یافتہ ملکوں کو ایک خاموش پیغام بھی دیا ہے کہ وہ پاکستان میں سرمایہ کاری کے بجائے بھارت اور سری لنکا جیسے ممالک میں سرمایہ کاری کو ترجیح دیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بھارت کی معاشی ترقی کی رفتار ترقی کی طرف گامزن ہے جبکہ سری لنکا کی معیشت بھی تامل ٹائیگرز سے چھٹکارے کے بعد ترقی کے زینے چڑھ رہی ہے۔ عالمی بینک کی یہ رپورٹ ایسے وقت میں جاری کی گئی ہے جب پاکستان کی حکومت اپنی کئی بڑی کمپنیوں کے بانڈز عالمی مارکیٹ میں متعارف کرانے کا اعلان کر چکی ہے اور کئی روڈ شو بھی ان بانڈز کی مارکیٹنگ کے لئے متعارف کرائے گئے ہیں جبکہ حکومتی سطح پر یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ ملک میں سرکاری اداروں کی نجکاری کا عمل دوبارہ شروع کیا جائے گا جس کے تحت پہلے مرحلے میں بڑی انرجی کمپنیوں جس میں او جی ڈی سی ایل اور پاکستان اسٹیٹ آئل شامل ہیں، کے بانڈز جاری کیے جائیں گے جس سے حکومت کو خاطر خواہ آمدنی ہوگی۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومتی سطح پر اب تک اس رپورٹ میں پاکستان کے خلاف جو زہر اگلا گیا ہے، اس پر کوئی شور نہیں مچایا گیا اور نہ ہی حزب اختلاف کے نمائندوں نے اس پر کوئی آواز اٹھائی ہے۔ عالمی بنک نے اپنی رپورٹ میں پاکستان میں امن وامان کا جو منظر نامہ پیش کیا ہے، زمینی حقائق اس کے برعکس ہیں۔ عالمی بینک نے اپنی رپورٹ میں پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات بڑھنے کی نشاندہی کی ہے مگر عالمی بینک کو یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ پاکستان کے یہ حالات اس کے اپنے پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ یہ مسائل تو ہمیں امریکہ اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ممالک کے طفیل ملے ہیں اور تلخ حقائق تو یہ ہیں کہ پاکستان نے اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا کر عالمی دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ میں دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی مدد کی ہے مگر اس کے بدلے میں پاکستان سے مالی امداد اور قرضوں کے جو وعدے کیے گئے تھے، وہ ایک سال گزر جانے کے

باوجود پورے نہیں ہو سکے۔ پاکستان میں دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات کی روک تھام اور پاکستان کی معاشی ترقی میں حائل رکاوٹوں کے خاتمے کے لئے احباب پاکستان فورم بھی بنایا گیا تھا۔ جس میں پاکستان کے پڑوسی ممالک سمیت کئی ترقی یافتہ ممالک بھی شامل تھے مگر اس فورم نے آج تک زبانی جمع خرچ کے علاوہ پاکستان کی کوئی مدد نہیں کی اور اگر کوئی امداد دی بھی گئی ہے تو وہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف ہے۔

عالمی بنک کی اس رپورٹ سے سازش کی بو آرہی ہے اور لگتا ہے کہ اس پر ہمارے پڑوسی ممالک کی لابی حاوی ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات میں گزشتہ چند سالوں میں اضافہ ضرور ہوا ہے مگر یہ دہشت گردی پاکستان کے کچھ حصوں تک محدود ہے جس میں اس وقت سرفہرست سرحد اور بلوچستان ہیں جبکہ پنجاب کے بعض علاقے بھی اس سے جزوی متاثر ہوئے ہیں اور پاکستان کی معیشت میں اہم ترین کردار ادا کرنے والے شہر کراچی میں اگر واقعات ہوئے بھی ہیں تو وہ بہت کم ہیں مگر عالمی بینک کی رپورٹ میں اس امر کی کوئی نشاندہی نہیں کی گئی ہے کہ وہ کون سے علاقے ہیں جو دہشت گردی سے زیادہ متاثر ہیں۔

عالمی بینک کی اس رپورٹ پر معاشی ماہرین بھی کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم مشکل میں ضرور ہیں لیکن اس کے باوجود ہماری معیشت کی شرح نمو اضافہ کی طرف گامزن ہے اور رواں مالی سال میں بھی ملک میں جی ڈی پی کی ترقی کی شرح ڈھائی سے تین فیصد رہنے کا امکان ہے جبکہ آئندہ سال اس ترقی کی شرح چار فیصد تک متوقع ہے۔ پاکستان کو معاشی طور پر جن مسائل کا سامنا ہے۔ وہ بھی ہمارے نام نہاد دوست ممالک کے ہی پیدا کردہ ہیں۔ اس وقت پاکستان کو سب سے بڑا مسئلہ توانائی کا ہے۔ جس کو حل کرنے کے لئے ہمارے دو دوست ممالک جن کی خاطر ہم نے ایک نہ ختم ہونے والی جنگ شروع کر رکھی ہے۔ وہ بھی اس میں ہماری مدد کے لئے صرف اعلانات ہی کر رہے ہیں جبکہ عملی طور پر کوئی قدم نہیں اٹھایا جا رہا۔ معاشی ماہرین کے

بقول پاکستان کو چاہیے کہ وہ اس رپورٹ پر عالمی بینک کے پاس اپنا احتجاج ریکارڈ کرائے اور اس رپورٹ پر خاموش نہ بیٹھے بلکہ اس کو مجبور کرے کہ وہ اس رپورٹ میں سے پاکستان کا نام نکالے کیونکہ پاکستان اور افغانستان کے حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پاکستان میں امن وامان کے حالات کو افغانستان سے نہ ملایا جائے۔ پاکستان کی معیشت نامساعد حالات کے باوجود گراوٹ کی طرف نہیں ہے اور اب تک اس کی ترقی کی شرح مثبت رہی ہے۔ پاکستان میں نئی انڈسٹریاں اب بھی لگ رہی ہیں اور کئی غیر ملکی گروپس پاکستان میں بدستور نئی سرمایہ کاری کے منصوبے شروع کر رہے ہیں۔ عالمی مالیاتی ادارے آئی ایم ایف سمیت کئی ممالک پاکستان کی معاشی ترقی کا اعتراف کر چکے ہیں اور آئی ایم ایف نے حال ہی میں ایک بیان بھی جاری کیا ہے جس میں پاکستان کے معاشی حالات پر اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے اور اس بات کا انکشاف کیا گیا ہے کہ پاکستان معاشی مسائل کے گرداب سے باہر نکل آیا ہے۔ عالمی بینک نے اپنی اس رپورٹ کی تیاری میں آئی ایم ایف کی ان رپورٹس کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ عالمی بینک کا شمار دنیا کے چند بڑے مالیاتی اداروں میں ہوتا ہے جس کی رپورٹس کو دنیا بھر کے سرمایہ کار اہم نظروں سے دیکھتے ہیں لہٰذا اس کی جانب سے پاکستان کو معاشی بدحال ممالک کی فہرست میں شامل کرنا افسوسناک ہے۔ جس کے خلاف ہر سطح پر احتجاج کرنا چاہیے۔ معاشی ماہرین کے نزدیک اگر ایسی کوئی رپورٹ بھارت کے خلاف جاری کر دی جاتی تو بھارت نہ صرف اس کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتا بلکہ اس پر اتنا احتجاج کرتا کہ عالمی بینک کو اپنی رپورٹ پر نظر ثانی اور معافی مانگنا پڑتی مگر چونکہ ہمارے حکمران اجتماعی مفاد کے بجائے ذاتی فائدے میں لگے ہوئے ہیں اس لئے اس رپورٹ پر کوئی آواز اب تک نہیں اٹھائی گئی جو ہمارے حکمرانوں کی خراب کارکردگی اور ناکام سفارتکاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

پاکستانی معیشت کو دوچار مسائل کچھ ہمارے اور کچھ غیروں کے پیدا کردہ ہیں۔ ظاہر ہے ہمارا

ہمسایہ بھارت پاکستان کو ناکام ریاست قرار دلانے کے لئے ہر ممکن سازش کرے گا۔ لیکن کرپشن ایک ایسا روگ ہے جو ہم نے خود اپنے آپ کو لگایا اور جس نے ملکی معیشت کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔

ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل پاکستان نے کہا ہے کہ ایک سال میں پاکستان میں کرپشن کی شرح 100 فیصد بڑھ گئی ہے۔ آڈیٹر جنرل آف پاکستان کی رپورٹ کے مطابق سال 2008-09ء کے دوران 323 ارب روپے خورد برد کر دیئے گئے ہیں جبکہ صرف رینٹل پاور پراجیکٹس ہی میں 2 ارب ڈالر کی کرپشن ہوئی ہے۔ اسٹیل ملز میں 29 ارب اور ٹی سی پی میں 9 ارب کی کرپشن سامنے آئی ہے۔ ڈھائی ارب روپے کی بے ضابطگیاں محکمہ دفاع میں کی گئی ہیں جو کل گھپلوں کا 63.0 فیصد بنتی ہیں۔ اڈیٹر جنرل آف پاکستان کی اس رپورٹ میں اور بھی دل ہلا دینے والے اور دماغ کو چکرا دینے والے انکشافات ہیں۔ اس رپورٹ میں سب سے زیادہ حیران کن انکشاف یہ کیا گیا ہے کہ سب سے زیادہ بے ضابطگیاں بورڈ آف ریونیو میں 116 ارب روپے کی کی گئی ہیں جبکہ وزارت پانی و بجلی کو ''رزاپ'' ہونے کا ''اعزاز'' حاصل ہے۔ اس میں ایک سو گیارہ ارب روپے کی بے ضابطگیاں پائی گئیں۔ وزارت پٹرولیم و قدرتی وسائل کے حسابات میں 17 ارب پاکستان ریلوے کے کھاتوں میں 16 ارب کی گڑبڑ پائی گئی۔ پاکستان اسٹیل ملز کی انتظامیہ بھی آڈیٹرز کو 16 ارب روپے کا حساب کتاب پیش نہیں کر سکی۔ پاکستان بیت المال میں 94 کروڑ پورٹ قاسم میں 76 کروڑ اور پاکستان اسٹیٹ آئل کے پاس 66 کروڑ روپے کا کوئی حساب کتاب نہیں۔ باقی شعبوں کا حال بھی ''تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم'' والا ہے۔

آڈیٹر جنرل آف پاکستان کی یہ رپورٹ خود اپنے اوپر مکمل تبصرہ بھی ہے اور اپنی وضاحت آپ بھی! یہ حزب اختلاف کے کسی رہنما کا بیان نہیں بلکہ اس سرکاری ادارے کے سربراہ کی رپورٹ ہے جس کا وظیفہ ہی سرکاری اداروں میں کام کی شفافیت سے متعلق مستند حقائق پیش کرنا ہے۔ گویا

کہ یہ سرکاری محکموں اور وزارتوں میں ہونے والی بدعنوانیوں سے متعلق خود سرکار کا بیان ہے جس کو سرکاری ترجمان غلط قرار نہیں دے سکتے۔ اس رپورٹ نے سیاسی حلقوں اور ذرائع ابلاغ کی ان رپورٹوں کی تصدیق کر دی ہے جن میں بتایا جا رہا تھا کہ ملک میں کرپشن اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔ کچھ عرصہ قبل پہلے عدالت عظمٰی کے ایک معزز جج نے موجودہ صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان میں کرپشن صرف وہ نہیں کر رہا ہے۔ جس کو موقع نہیں مل رہا۔ اس بیان کی سچائی آج بھی نہ صرف پوری طرح قائم ہے بلکہ حالیہ رپورٹ کو سامنے رکھا جائے تو یہ سچائی مزید کھل کر بلکہ مزید وسعت اور گہرائی کے ساتھ سامنے آ جاتی ہے۔ اس رپورٹ میں چند بڑے اور نمایاں شعبوں اور ان میں کی جانے والی بدعنوانیوں کا جس طرح تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ چشم کشا ہے۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر محبوب الحق کی رپورٹ بھی یاد آ جاتی ہے۔ ضیاء الحق کے دور میں ڈاکٹر محبوب الحق اہم منصب پر فائز رہے۔ انہوں نے اسی دور میں بتایا تھا کہ پاکستان میں سالانہ 600 ارب روپے کی کرپشن ہوتی ہے۔ آج عشروں بعد جب پاکستان کا بجٹ ضیاء الحق کے زمانے کے بجٹ سے چار گنا بڑھ کر 23 کھرب ہو چکا ہے۔ اس رپورٹ کے حوالے سے دیکھا جائے تو کم سے کم یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بجٹ کی رقم میں اضافے کے ساتھ کرپشن میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں اگر قوم کے صرف 20 فیصد مسائل ہی حل ہو گئے ہوتے، باقی 80 فیصد بے شک بیورو کریسی سمیت حکمران مل کر کھا جاتے تو عوام بلکہ رعایا صبر بھی کر لیتے لیکن صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف اتنی رقوم قوم کسی طرح حکومت کو کاروبار مملکت چلانے کے لئے دے رہی ہے۔ اس کے بدلے اسے 25 فیصد بھی نہیں مل رہا۔ اس رپورٹ میں جن وزارتوں کے نام لے کر ذکر کیے گئے ہیں ان سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ شعبے کس قسم کے لوگوں کے حوالے کیے گئے ہیں اور وہ ان کا انتظام کس طرح چلا رہے ہیں کیونکہ اتنے بڑے پیمانے پر گڑبڑ ''بڑے لوگوں'' کی منشاء کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر حیرتناک اور افسوسناک امر یہ ہے

کہ ان شعبوں پر وزارت دفاع بھی شامل ہے۔ دوسرے شعبوں کا معاملہ پھر بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ملک کا دفاع کرنے والے ادارے کے حوالے سے ایسی خبروں پر قوم کو خوشی نہیں ہو سکتی۔ اور سب سے دلچسپ امر یہ کہ ایف بی آر کے نام سے جو ادارہ قوم سے چند ہزار آمدنی پر بھی ٹیکس وصول کرتا ہے اور ماچس کی ڈبیا تک اس کی ''نظر کرم'' سے محروم نہیں، ویٹ کی ''برکات'' کا نزول ابھی سے شروع ہو چکا ہے، خود اس ادارے کے اندر نہ صرف اتنے بڑے پیمانے پر کرپشن ہے کہ اس نے دوسرے تمام اداروں کو گویا مار بھگایا ہے۔ یہاں صرف یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر گھپلوں کے بعد ایف بی آر کو قوم کے محنت کش طبقے سے ٹیکس وصول کرنے کا کیا اور کتنا حق ہے اور حکومت کو بھی بتانا چاہیے کے اس رپورٹ پر اس کا کیا تبصرہ ہے اور اس لوٹے ہوئے قومی خزانے کو واپس کرنے کے لئے اس کے پاس کیا پروگرام ہے۔

اس وقت ملک میں بجلی کا بحران ہر روز بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ مذکورہ بالا رپورٹ کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس بحران کی اصل وجہ بھی بدعنوانی ہی قرار پاتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق رینٹل پاور پروجیکٹ کے نام پر 2 ارب ڈالر کی کرپشن ہوئی ہے۔ اس سے ان لوگوں کا موقف درست معلوم ہونے لگتا ہے جن کا خیال ہے کہ ملک میں بجلی کا بحران مصنوعی طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ اب یہ سوال لا حاصل ہے کہ بجلی ہی نہیں ہو گی تو صنعت و حرفت کا پہیہ کس طرح رواں ہو گا اور معیشت کس طرح ترقی کرے گی۔

یہ سارے اللے تللے ایسے وقت میں جاری ہیں جب ملک پر بیرونی قرضوں کا بوجھ حد سے تجاوز ہوتا جا رہا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق آئی ایم ایف سے مزید ایک ارب 20 کروڑ ڈالر قرض لیا جا رہا ہے جبکہ عالمی بینک کے حوالے سے معلوم ہوا ہے کہ پاکستان کو بجلی کی فراہمی کے لئے 90 کروڑ ڈالر یعنی تقریباً ایک ارب ڈالر قرض دے گا۔ گویا ان دو ہی مدات میں پاکستان پر سوا دو ارب ڈالر کا مزید قرضہ چڑھ جائے گا۔ جبکہ ماہرین معیشت ہی خبردار کر چکے ہیں کہ یہ

صورتحال جاری رہی تو آئندہ چند برسوں میں پاکستان پر غیر ملکی قرضوں کا بار 60 ارب ڈالر سے تجاوز کر جائے گا۔ واضح رہے کہ اس وقت بھی پاکستان پر صرف غیر ملکی قرضوں کا بار 50 ارب ڈالر سے متجاوز کر چکا ہے جبکہ تجارتی خسارے کے بارے میں حکمران بالکل چپ سادھے بیٹھے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے حکمرانوں کے لئے ہوش کے ناخن لینے اور سنبھلنے کا وقت ہے۔ اگر ملک میں اعلیٰ سطح پر کرپشن اور بدعنوانی کا یہ سلسلہ جاری رہا اور عوام کی مشکلات میں اضافہ ہوتا رہا تو نہیں کہا جا سکتا کہ حکمرانوں کو کس قسم کے ردعمل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے کسی ایسے الزام کا جواب ہی نہیں دیا جاتا اور ضد کی سی کیفیت طاری کی جا رہی ہے جو ملک کو سوائے تباہی کی طرف لے جانے کے اور کوئی کارنامہ انجام نہیں دے رہی۔

(جون 2010ء)

جھوٹ کا دھندہ کب تک؟

دودھ میں ملاوٹ، کھانے پینے کی چیزوں اور مسالوں میں ملاوٹ، حتیٰ کہ دوائیوں میں ملاوٹ تو سنی تھی، لیکن موجودہ حکومت کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے اعداد و شمار میں ملاوٹ کے ذریعے معاشی ترقی کا ایک نادر کارنامہ انجام دیا ہے۔ معاشیات کے سارے ماہرین عام آدمی کے تجربات کی گواہی کی روشنی میں، یہ کہہ رہے تھے کہ 2010ء، 2009ء پاکستان کی معاشی تاریخ میں بہت ہی مشکل سال رہا ہے۔ معیشت، جن مشکلات سے دوچار رہی، ان میں بجلی اور گیس کا بحران، صنعتی پیداوار اور برآمدات میں کمی، سرمایہ کاری کی سست روی، مہنگائی کا طوفان، بے روزگاری میں اضافہ، روپے کی عالمی قیمت میں کمی قابل ذکر ہیں۔ اور ان سب عوامل کی وجہ سے خود اسٹیٹ بنک کی مارچ 2010ء تک کی تمام ہی رپورٹوں میں معیشت میں شرح نمو (Growth rate) کے بارے میں اندازہ تھا کہ وہ 5 ,2 اور 3 فی صد کے درمیان ہو گی اور بہت زور لگایا تو شاید 3,5 فی صد ہو جائے۔ لیکن کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ بجٹ سے ایک ماہ پہلے مئی 2010ء میں حکومت یہ انکشاف کرے گی کہ سال رواں میں جی ڈی پی میں اضافہ 1ء4 فیصد ہو گا۔ نیشنل اکاؤنٹس کمیٹی نے یہ اعلان کر کے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا

لیکن جب اس محیر العقول تبدیلی کا سبب دریافت کیا گیا تو یہ حیران کن بات سامنے آئی کہ اس سال شرح نمو میں اضافہ دکھانے کے لئے گزشتہ دو سالوں کی شرح نمو پر نظر ثانی کی گئی ہے تا کہ اس کی بنیاد (base) کو نیچے لے جا کر سال رواں میں ترقی کی رفتار کو زیادہ دکھایا جا سکے۔

پہلے دعویٰ کیا گیا 2007-08ء میں 4ء1 فی صد ترقی کا جو دعویٰ کیا گیا تھا وہ صحیح نہیں تھا، بلکہ اصل اضافہ 3ء7 فی صد تھا۔ پھر نیا دعویٰ کیا گیا کہ یہ 3ء7 فیصد نہیں 3ء3 فیصد تھا اور اسی طرح 2008-09ء میں اضافہ 2 فیصد نہیں تھا بلکہ صرف 1ء2 فیصد تھا۔ اعداد و شمار میں اس ردوبدل کے نتیجے میں 2009-10 کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ متوقع اضافہ 3 فیصد نہیں، بلکہ 4ء1 فیصد ہے۔ گویا 2008-09 کے مقابلے میں ساڑھے تین گنا اضافہ ہوا ہے جسے ایک عظیم کرشماہی کہا جا سکتا ہے۔

جب پوچھا گیا کہ معیشت کے تمام بڑے بڑے مراکز تو کوئی اچھی صورت حال ظاہر نہیں کر رہے اور خصوصیت سے توانائی کے بحران کی وجہ سے پیداوار میں یہ اضافہ قابل فہم نہیں ہے۔ اس کے جواب میں بتایا گیا کہ اصل اضافہ تعمیرات کے شعبے (contruction industry) کی وجہ سے ہوا ہے، جس نے سال رواں میں 15 فیصد کے حساب سے ترقی کی ہے حالانکہ اسٹیل اور سیمنٹ دونوں جو اس صنعت کے اہم ترین بنیادی اجزاء ہیں، وہ تو مشکلات کا شکار رہے ہیں، پھر اس کے باوجود اس صنعت میں 15 فیصد اضافہ کیسے ہو گیا؟ اس سوال کا کوئی معقول جواب پیش نہ کیا جا سکا۔ اسی طرح لائیو سٹاک میں بھی دگنا اضافے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ یوں اعداد و شمار کے ہیر پھیر سے معاشی ترقی کی رفتار میں اضافے کا شعبدہ دکھا دیا گیا۔ پاکستان کے کئی معروف ماہرین معاشیات، مثلاً ڈاکٹر ایس اکبر زیدی (ڈان، 24 مئی 2010ء) اور ڈاکٹر اشفاق حسین (دی نیوز 18 مئی 2010) اور ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی (جنگ 25 مئی 2010ء) نے اس، کارنامے پر اپنی حیرت کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر زیدی نے بڑی دردمندی سے ملکی معیشت کے ذمہ

داروں کو بڑا مفید مشورہ دیا ہے جسے ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہوئے ہم بھی حکومت کی ٹیم کو ان کے اس طبع زاد کارنامے پر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ان تمام عوام کو دیکھتے ہوئے جنہوں نے گزشتہ دو برسوں میں پاکستان کی معیشت کو متاثر کیا ہے۔ ان میں سے صرف چند کو بیان کیا ہے۔ کوئی ایسا راستہ نظر نہیں آتا کہ پاکستانی معیشت میں اتنی معجزانہ بہتری رونما ہو سکے۔ اگر ایسا ہوا ہے جیسا کہ پاکستانی معیشت کے ذمہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ہوا ہے، تو ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے معاشی انتظامات کی بنیادی منطق ہی کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ ضروری ہے کہ وہ اپنے کارناموں کے لئے ثبوت مہیا کریں تا کہ دوسرے بھی سیکھ سکیں۔ (روزنامہ ڈان، 24 مئی 2010ء)

حکومت نے آئندہ مالی سال 2010-11 کے وفاقی بجٹ کا اعلان کرتے وقت کہا ہے کہ ملک کی آمدنی دو اعشاریہ تین ٹریلین یعنی تین ہزار دو سو اکسٹھ روپے ہو گی جبکہ بجٹ میں ظاہر کیے گئے اخراجات کا تخمینہ تین ٹریلین لگایا گیا ہے۔ گویا یہ چھ سو پچاسی ارب روپے کے خسارے کا بجٹ ہے، یعنی آمدنی اٹھنی خرچ روپیہ، لیکن آمدن اور خرچ کے فرق کو کون پورا کرے گا، کہاں سے آئیں گے تقریباً سات سو بلین روپے، حکومت ایک ہی سانس میں اس کا حل بھی بتا رہی ہے کہ اس فرق کو قرض کی رقم سے پورا کر لیا جائے گا لیکن یاد رکھو جو قرض لیتا ہے اپنی آزادی گنوا بیٹھتا ہے۔

آیئے پہلے اس بات کا تجزیہ کرتے ہیں کہ حکومت کو آمدن کیسے ہوتی ہے، وزارت خزانہ کے ذرائع کے مطابق براہ راست ٹیکسوں سے 35 فیصد اور بالواسطہ ٹیکسوں سے 65 فیصد، اس کا مطلب یہ ہوا کہ 65 فیصد ٹیکس عوام پر لگایا جاتا ہے۔

عوام ٹیکس دینے کی سکت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں یہ ٹیکس مختلف اشیائے صرف کی قیمتوں میں شامل کر کے زبردستی وصول کر لیا جاتا ہے، یا مختلف قسم کی سروسز کے ساتھ ملا کر وصول کر لیا جاتا ہے، یعنی غریب آدمی کی آمدنی کا زیادہ تر حصہ اشیائے خورد و نوش اور مختلف قسم کے یوٹیلیٹی بلز ادا

کرنے پرصرف ہوتا ہے،اس لئے غریب آدمی کو اپنی آمدنی کے حساب سے زیادہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے،شاید یہی وجہ ہے کہ اس بجٹ کو غریب عوام کا بجٹ (Pro- Poor budget) کہا جا رہا ہے۔واہ کیا کہنے،لگتا ہے حکومت غریبوں کو مار کر غربت مٹاؤ پروگرام پر عملدرآمد کر رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں غریبوں کی اصل دشمن تو ان کی غربت ہے نہ کہ حکومت۔

اب ذرا حکومت کے اپنے اخراجات کی بات ہوجائے۔

ایوان صدر کے سٹاف کا خرچہ،الاؤنسز اور گھریلو اخراجات روزانہ کا کل خرچ دس لاکھ روپے یعنی سالانہ 36 کروڑ پچاس لاکھ روپے۔

وزیراعظم سیکرٹریٹ روزانہ خرچ بارہ لاکھ روپے،سالانہ خرچ 43 کروڑ روپے تقریباً۔

قومی اسمبلی روزانہ خرچ چالیس لاکھ روپے۔

سینیٹ آف پاکستان روزانہ ستر ارب یا بیس کروڑ روپے،کیبنٹ سیکرٹریٹ سالانہ ستر ارب یا بیس کروڑ روپے روزانہ خرچ۔حکومت کے خرچ دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ غریبوں کی جیبوں سے ٹیکسوں کے ذریعے جس قدر روپیہ نکال سکتے ہو نکال لو اور بدلے میں صرف طفل تسلیاں دلا سے اور امیدیں دو کیونکہ غریب انہی چیزوں کے سہارے زندہ ہیں۔اور تیار ہو جاؤ کہ ویٹ یعنی ویلیو ایڈڈ ٹیکس کا استقبال بھی کرنا ہے،ایک اور بالواسطہ ٹیکس حکومت کا خیال ہے کہ اس ٹیکس سے ستر ارب روپے اکٹھے ہوں گے،لیکن ایسا کبھی نہیں ہوگا کیونکہ امیدیں اور توقعات صرف بیوقوفوں کے کھانے کا چارہ ہے،حقیقت یہ ہے لہ ملک کی آمدنی اور اخراجات میں بہت بڑا فرق ہے اور ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ خسارہ وہ رقم ہے جو ہمارے صدر سے لے کر نچلی سطح تک حکومت کے بہت سارے کرتا دھرتا خرچ کرتے ہیں لیکن چنداں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ خسارہ پورا کرنے کے لئے قرض لینے کا طریقہ ہمیں آتا ہے،کشکول لے کر بھیک مانگیں گے اور پھر ہم نے تھوڑے ہی یہ قرض واپس کرنا ہے،ہمارے بچے اور ہماری آنے والی نسلیں بھی ہمارا ہاتھ

بٹائیں گی،قرض اتاریں گی ملک سنواریں گی۔

اکثر راتوں کو اکیلے میں خوف کے مارے چلاتے ہوئے بیدار ہو جاتا ہوں،یاد رکھو کہ اس آدمی کا دکھ درد سچا ہے جو اکیلا ہے اور کوئی اس کا پرسان حال نہیں،ہاں ایک اچھی خبر بھی آئی ہے،وہ یہ کہ پاکستان میں پہلی بار حصص کے کاروبار پر بھی ٹیکس عائد کر دیا گیا ہے،لیکن بڑے بڑے امیر زمینداروں اور کمرشل پراپرٹی کا کاروبار کرنے والوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے،ان چہیتوں پر ٹیکس کیوں نہیں لگایا جا سکتا،کرنے کے کام تو اور بھی بہت سارے ہو سکتے ہیں،مثلاً ہمارے صدر جناب آصف علی زرداری اور وزیراعظم محترم سید یوسف رضا گیلانی ایک جگہ اپنے ملک میں کیوں نہیں رہ سکتے،یہ دونوں شخصیات کیوں ہوائی دوروں پر رہتی ہیں اور ہمارے وزیر داخلہ رحمان ملک برطانوی وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون کی طرح بس میں سفر کیوں نہیں کرتے کیوں اکیلے طیارے میں اڑتے پھرتے ہیں۔

ہمارا اصل مسئلہ کیا ہے؟ نہ امریکہ نہ اسرائیل نہ بھارت بلکہ ہماری حکومت کی ناکامی جو اپنی آمدن پر قناعت نہیں کر سکتی۔

پچھلے تریسٹھ سالوں سے ہم بڑے بڑے ڈھول پیٹ رہے ہیں،ہم پاکستان میں ہر برائی کے پیچھے سی آئی اے،اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد اور بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کو ملوث کر دیتے ہیں،یاد رکھیں کہ بے وقوف کی مثال بڑے ڈھول کی سی ہے جو بجتا تو خوب ہے لیکن اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔

اس بجٹ کے ذریعے سترہ کروڑ عوام میں سے صرف اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے وزراء یا صوبوں میں بیٹھے ہوئے دوسو وزیروں کو فائدہ ہوا جبکہ بقیہ سولہ کروڑ ننانوے لاکھ کے قریب عوام اس وقت سخت بھوک،طیش اور غربت میں مبتلا ہیں۔

میرے ہم وطنو! غصہ مت کرو کیونکہ پاک وطن میں اب غصے میں آنا بھی عیاشی سے کم نہیں،

کیونکہ کبھی کبھی غصہ بہت مہنگا پڑتا ہے۔ حکومت کے وعدوں میں کوئی وعدہ سچا ہے تو وہ ٹیکس لگانے کا وعدہ یا سڑکوں پر ملنے والی موت کا وعدہ، مجھے پیسوں کی جب بھی ضرورت پڑی تو مجھے بتایا گیا کہ قرض لینا آسان ہے لیکن چکانا مشکل ہے قرض لینے کے لئے وہ شخص تیار رہتا ہے جو جھوٹ بولنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ پس ہمارا نیا مالی سال بھی خیرات اور قرض مانگ کر شروع ہو رہا ہے اللہ خیر کرے جیسا شرمناک آغاز ویسا شرمناک انجام۔

ہمارے وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی کا وفد برسلز میں ہوٹل کا خرچ 60 یورو، لیموزین گاڑیوں کا خرچ ایک لاکھ بارہ ہزار یورو، ڈنر کا خرچ ڈھائی ہزار یورو۔

قرض کی رقم سے دو کروڑ خرچ ہو گئے۔

اللہ اللہ خیر صلاّ!

(جولائی 2010ء)

آپ کے دعوے اور زمینی سچائیاں

بجٹ آنے سے پہلے اور اس کے بعد بھی حکومت کی طرف سے اس حوالے سے جتنے دعوے کیے گئے تھے جتنی بڑھکیں ماری گئی تھیں وہ سب حسب روایت محبوب کے وعدوں کی طرح ہوا میں بکھر کر رہ گئے ہیں اور زمینی سچائی یہ ہے کہ تمام تر حکومتی دعوؤں اور بلند آہنگ اعلانات کے باوجود مہنگائی کی شرح میں اضافے کا تسلسل جاری ہے۔ مئی 2010ء کے دوران افراط زر کی شرح 13 فیصد رہی۔ سرکاری ادارے وفاقی ادارہ شماریات کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق جولائی 2009ء تا مئی 2010ء کے دوران افراط زر کی شرح 11.4 فیصد ریکارڈ کی گئی تھی جو گزشتہ برس سے تقریباً نصف ہے۔ گزشتہ ماہ اشیاء ضروریہ کی قیمتوں میں 14.8 فیصد اضافہ دیکھا گیا ہے۔ ان سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اشیاء خوردونوش کی قیمتوں میں 26.2 فیصد اضافہ ہوا۔ جبکہ وفاقی سیکرٹری تجارت نے اعتراف کیا ہے کہ ملکی معیشت مشکل ترین حالات سے دوچار ہے۔ یورپی یونین اور امریکہ عالمی مالیاتی بحران کے باعث پاکستان کو تجارت میں رعایت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ سیکرٹری تجارت نے انتہائی حیران کن انکشاف بھی کیا کہ وزارت تجارت کا فنڈ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں استعمال ہو رہا ہے جبکہ 3 سالہ تجارتی پالیسی کا فریم ورک ابھی تک

منظور نہیں ہو سکا۔

اگر کسی کو اب بھی شبہ ہے کہ حکومت کی معاشی واقتصادی پالیسیوں کے بابت میڈیا جو کچھ بیان کررہا ہے وہ محض حکومت کی مخالفت میں ہے اور اس کا مقصد کسی بھی نوع کی اصلاح کا نہیں تو اسے صرف ان دو ہی رپورٹوں کو توجہ سے پڑھ لینا چاہیے۔ وفاقی ادارہ برائے شماریات خالص سرکاری ادارہ اور وفاقی سیکرٹری تجارت سو فیصد سرکاری ملازم ہیں۔ وہ اپنے ''باس'' یا ''باسوں'' کے خلاف بیان دے ہی نہیں سکتے۔ اس کے باوجود انہوں نے کمال جرات سے کام لے کر یہ بیان دیا ہے تو اس سے حکومت کی پوری کی پوری اقتصادی پالیسی بے نقاب ہو جاتی ہے۔ جس حکومت نے ڈھائی برسوں میں تجارتی پالیسی کا فریم ورک تک منظور نہیں کیا اور اس وزارت کا فنڈ تک اغیار کی جنگ میں جھونک رہی ہے اور اگر خود وفاقی سیکرٹری تجارت یہ انکشاف نہیں کرتے تو قوم کو شاید مدتوں اس زبردست دھاندلی کا علم نہیں ہو پاتا، وہ حکومت قومی معیشت واقتصادیات کی بحالی اور بہتری کے لئے کیا کچھ کرے گی اور کب؟ جبکہ بجلی کا بحران اور اس کے نتیجے میں صنعتوں کی بندش کا سلسلہ بھی رکنے میں نہیں آرہا۔ اس کے باوجود ہمارے وزیر خارجہ سے لے کر وزیراعظم اور صدر صاحب تک سب ہی چیخ رہے ہیں کہ اس جنگ میں پاکستان کا 40 ارب ڈالر کا نقصان ہو گیا ہے۔ ہماری معیشت تباہ وبرباد ہو گئی ہے، عالمی برادری یہ کھڈا پر کرے! جب ہمارے اپنے حکمرانوں کا یہ حال ہے تو امریکہ، یورپی یونین یا کسی اور ادارے یا ملک کو سر میں درد ہوا ہے جو ہمارے معاشی معاملات درست کرنے سامنے آئے۔

ملک کے صنعتی وتجارتی مرکز کراچی کے اسٹاک ایکسچینج کی تازہ ترین صورت حال بھی اپنی وضاحت آپ اور حکومتی کارکردگی پر مکمل تبصرہ بھی ہے۔ اس پر مزید اضافے کی فی الحال ضرورت نظر نہیں آتی۔ ہاں عالمی ادارہ خوراک نے پاکستانیوں کی معاشی حالت کی جو تصویر پیش کی ہے، اسے بھی دیکھ لینا مناسب ہوگا۔

عالمی ادارہ خوراک نے پاکستان کے حوالے سے بتایا ہے کہ پاکستان میں خوراک کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور گزشتہ ایک سال کے دوران اشیاء خورد ونوش کی قیمتوں میں 100 فیصد اضافہ ہوا ہے جس کے سبب اشیاء خود ونوش عام شہریوں کی دسترس سے دور ہوتی جارہی ہیں۔ عالمی ادارہ خوراک کے مطابق 2009ء سے 2010ء کے وسط تک چینی کی قیمت 30 روپے فی کلو سے بڑھ کر 70 روپے فی کلو ہو گئی جبکہ گھی اور کوکنگ آئل کی قیمتوں میں 100 روپے، چائے کے 500 گرام کے پیکٹ کی قیمت میں 50 روپے اضافہ ہوا ہے جبکہ آٹا 25 روپے سے 35 روپے فی کلو تک کھلے بازار میں فروخت ہو رہا ہے۔ عالمی ادارہ خوراک کے مطابق گوشت کی قیمتوں میں حالیہ ہفتوں کے دوران 50 فیصد سے زائد اضافہ ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے پاکستان کے لوگوں کی قوت خرید 80 فیصد تک کم ہو گئی ہے۔ عالمی ادارہ خوراک نے مزید کہا ہے کہ ملک کی کل آبادی کے 62 فیصد عوام غریب ہو گئے ہیں اس تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سبب عام آدمی صرف کھانے پینے کی اشیاء کی خریداری تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ دریں اثناء یوٹیلٹی سٹورز میں چینی سمیت دیگر اشیاء کی قیمتوں میں پانچ سے دس فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ تازہ دھماکہ خیز اطلاع کے مطابق عام مارکیٹ میں بھی چینی کی قیمت میں 5 روپے کلو کا اضافہ ہو گیا ہے۔

یوٹیلٹی سٹورز پر ملنے والی اشیاء پر جیسی تیسی رعایت یا زر تلافی (وغیرہ وغیرہ) تھے۔ وہ تو حالیہ بجٹ میں ختم کر دیئے گئے ہیں، اب ان میں اور عام دکانوں میں کوئی بھی فرق باقی نہیں رہا اور ایک اعتبار سے یہ سٹورز کسی سہولت کی فراہمی کی بجائے آٹا چینی جیسی بنیادی ضروریات کے لئے بھی پبلک کو پریشان کرنے اور تکلیف دینے کے مراکز بن کر رہ گئے ہیں۔ ان سٹورز سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، لہٰذا ان کے حوالے سے اب کسی بھی سرکاری موقف میں کوئی جان یا وزن نہیں رہا۔ واضح رہے کہ گیلپ سروے نے بھی سامنے [illegible] بتایا ہے کہ روزافزوں مہنگائی کا مقابلہ کرنے کے لئے 51 فیصد پاکستانیوں نے اپنے اخراجات میں کمی کر دی ہے۔ دونوں رپورٹوں

سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ حکومت کے دعوؤں کے برعکس قوم کا کم از کم اوسطاً پچاس فیصد سے بھی زائد طبقہ اوسط درجے کی زندگی سے بھی نیچے جا چکا ہے۔ یہاں تک کہ یہ بھی اطلاع ہے کہ لوگوں نے بینکوں سے قرض لینا چھوڑ دیا ہے۔ زیادہ شرح سود کے باعث 3 ماہ میں کمرشل بنکوں سے قرض لینے والوں کی تعداد 10.7 فیصد کم ہوگئی۔ اسٹیٹ بنک نے بھی کہا ہے کہ امن وامان کی خراب صورت حال اور بڑھا ہوا کریڈٹ رسک بینکاری نظام کے لئے چیلنج ہے۔ اب اس مسئلے سے کس طرح نمٹا جائے گا۔ یہ اسٹیٹ بینک حکام ہی قوم کو بہتر بتا سکتے ہیں۔

حکومت کی جانب سے جنرل سیلز ٹیکس میں ایک فیصد اضافے کے نتائج بھی سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق مارکیٹوں میں (حسب روایت) ضروری اشیاء کی قلت پیدا کر دی گئی ہے۔ (یہ بھی عین روایت اور بالکل معمول کے مطابق ہے) اور قیمتیں بھی بڑھ گئی ہیں۔ اس میں بھی کوئی نئی بات نہیں ہے، سوائے قیمتوں میں اضافے کے۔ بتایا گیا ہے کہ ذخیرہ اندوزوں نے نئے ریٹ کے سبب مارکیٹوں میں مال دینا بند کر دیا ہے۔ دکاندار من مانے دام وصول کرنے لگے ہیں۔ چائے کی پتی، گھی، تیل، مشروبات، صابن، پرفیوم اور ادویہ سمیت کئی اشیاء کی قلت پیدا ہوگئی ہے (یا پیدا کر دی گئی ہے) مزید بتایا جا رہا ہے کہ کھانے پینے کی پیک کردہ اشیاء کی قلت کے سبب شہری کھلی ہوئی اشیاء خورد ونوش خریدنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

حکومت نے جو کیا سو کیا اور جنرل سیلز ٹیکس میں ایک فیصد اضافے کے حوالے سے ہی نہیں، بجٹ میں کسی بھی شے کی قیمت میں اضافے کے حوالے سے قوم کا بہت پرانا تجربہ ہے کہ کوئی بھی ٹیکس ہو، وہ اصل میں کئی گنا بڑھتا چلا جاتا ہے کیونکہ درمیان میں کئی ''مستحقین'' بھی دامن پھیلائے موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ عام شہری یعنی صارف تک پہنچتے تک اس شے کی قیمت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس بابت ماہرین اقتصادیات کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ صرف اس ایک فیصد اضافے ہی سے حکومت ویٹ سے زیادہ رقم جمع کر لے گی۔ لوگوں کو رفتہ رفتہ معلوم ہوگا

کہ نیا بجٹ دراصل کتنا بھاری ہے۔ واضح رہے کہ ابھی ویٹ نافذ نہیں ہوا لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ اکتوبر سے نافذ ہو جائے گا اور مزید یہ کہ بعض ذرائع کے مطابق اس کے نفاذ سے مہنگائی 20 فیصد سے 30 فیصد بڑھ جائے گی اور حقیقتاً مہنگائی کا ایسا ریلا آئے گا جس میں خود حکومت بھی بہہ سکتی ہے۔ تعلیم اور صحت کے شعبوں کے لئے مختص کردہ رقم کے حوالے سے مزید کچھ کہنا وقت کا ضیاع ہے۔ حکومت کو سوچ لینا اور فیصلہ کر لینا چاہئے کہ کیا وہ اپنی بقیہ نصف مدت پوری کرنا چاہتی ہے یا اسے گھر جانے کی بہت جلدی ہے!

(جولائی 2010ء)

ٹرانزٹ ٹریڈ اور بھارتی راہداری

18 جولائی کی شام جب ہیلری کلنٹن چک لالہ ایئرپورٹ پر لینڈ کر رہی تھیں تو ان کے استقبال کے لئے لگی قطار میں افغان وزیر تجارت انوارالحق نمایاں تھے جنہوں نے ہیلری کلنٹن کو چک لالہ پر اترتے ہی یہ خوشخبری سنادی کہ ان کے تجارتی مذاکرات کامیاب رہے ہیں جس کے بعد یہ تقریب برائے دستخط منعقد ہوئی تو تالیاں بجانے والوں میں صدر زرداری، ہالبروک اور ہیلری کلنٹن بھی شامل تھے۔ یہ بات شاید قارئین کے لئے باعث حیرت ہو کہ مارچ میں امریکہ میں ہونے والے سٹریٹجک ڈائیلاگ (جن میں اپنے مخدوم شاہ محمود قریشی صاحب ہیلری کلنٹن کا ہاتھ خاصی گرمجوشی سے دباتے رہے تھے) میں دیگر مسائل کے علاوہ جو اہم ترین مسئلہ زیر بحث آیا وہ بھارت کو پاکستان سے افغانستان تک راہداری دینے کا تھا اور امریکی وائسراؤں نے ان احکامات کے ساتھ ہمارے وفد کو روانہ کیا تھا کہ جلدی اس نٹنے کا خاتمہ کیا جائے جس پر اب گفتگو کے ساتویں راؤنڈ میں مخدوم امین فہیم (وزیر اعظم فیم) نے اچانک پاکستانیوں کو یہ کہہ کر سرپرائز دیا ہے کہ ہم نے افغانستان کو ہر ممکن تجارتی سہولت بہم پہنچانے کا عزم کر رکھا تھا اس لئے بھارت کو فضائی اور زمینی دونوں راستے دے دیئے۔ زمینی راستے کے ذریعے افغانستانی ٹرک میوہ

جات اور مقویات لے کر واہگہ تک جایا کریں گے اور فضائی راستے کے ذریعے بھارتی دیوہیکل سامان بردار ہوائی جہاز پاکستانی تباہی کا سامان لے کر کابل آیا کریں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ امریکہ بھی خوش۔ عوام بھی راضی کہ چلو بھارت کو تو اپنے ٹرک بذریعہ واہگہ کابل لے جانے کی اجازت نہیں دی ناں۔

مخدوم امین فہیم کبھی کبھی بڑی سادگی سے ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو اکثر "کوٹیشن" بن جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں موصوف فرماتے ہیں کہ ہم نے جواب میں افغانستان کے راستے سنٹرل ایشیا تک رسائی کا پروانہ حاصل کر لیا ہے شاید انہیں یاد نہیں (بادشاہ آدمی ہیں) کہ 2001ء میں افغانستان، پاکستان، قازکستان اور چین کے درمیان یہ معاہدہ پہلے سے موجود ہے لیکن ایک بھی ٹرک آج تک افغانستان کے راستے سنٹرل ایشیا اس لئے نہیں پہنچ سکا کہ کابل سرکار کی عملداری صدارتی محل کے دس پندرہ کلومیٹر آگے پیچھے تک ہی محدود ہے اس کے لئے نہ تو محفوظ راستہ ہے اور نہ سڑکیں، اگر طالبان سے معافی بھی مل جائے تو وادی پنج شیر پر بیٹھے شمالی اتحاد کے احمد مسعود گروپ والے بھارت نواز ایک ٹرک تو کیا ایک پاکستان باربردار گدھا بھی وہاں سے گزرنے نہیں دیں گے۔ اس لئے مخدوم امین فہیم کی یہ "کامیابی" تو مشکوک ہی رہے گی۔ البتہ ان کی مہربانی سے بھارت کا دیرینہ خواب پورا ہو گیا اسے افغانستان کے راستے بندر عباس تک رسائی میسر آ گئی۔ جبکہ پہلے ہی ممبئی اور چنائی سے بحری جہازوں کے قافلے ایرانی بندرگاہ چاہ بہار کی طرف رواں دواں رہتے ہیں جس کے ذریعے بھارتیوں کو شمالی افغانستان تک رسائی میسر رہتی ہے۔

پیپلز پارٹی کا کمال یہ ہے کہ وہ خود کو ہمیشہ "عقل کل" سمجھتے ہیں اور اپنے ہر اقدام کو "عوامی مینڈیٹ" بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اگر جناب بابر اعوان سی ون تھرٹی پر چڑھ کر سارے پاکستان کی بار کونسلوں کو نقد عطیات سے نوازنے لگیں تو وہ عین جمہوریت اور بمطابق آئین پاکستان ہے۔ سپریم کورٹ کے احکامات کے باوجود سوئس عدالت کو خط نہ لکھنا بھی آئین کے عین مطابق۔ غیرہ

وغیرہ کی طرح امید ہے۔ بھارت کو پاکستانی فضاؤں سے دندناتے ہوئے کابل تک پہنچانا بھی عوامی مینڈیٹ سے منسوب ہو جائے گا کیونکہ عوام بھارت سے اچھے تعلقات کے خواہاں ہیں۔ بھارت ہم سے کیسے تعلقات چاہتا ہے اس پر چند روز پہلے بھارتی وفد کی نشتند، گفتند، برخاستند کی مثال کافی ہے جس پر ہمارے وزیر خارجہ نے فرمایا ہے کہ وہ صرف چہل قدمی کرنے یا ہوا خوری کے لئے بھارت نہیں جاسکتے کیونکہ بھارتی مذاکرات کو سیریس نہیں لے رہے۔

زبیر موتی والا کراچی کے معروف تاجر اور اس مذاکراتی ٹیم کے رکن ہیں جو افغان ٹرانزٹ ٹریڈ مذاکرات میں حصہ لے رہی تھی ان کا کہنا ہے کہ ان کے ساتھیوں نے وزیر تجارت مخدوم امین فہیم کو بھارتی راہداری کے حوالے سے اپنے خدشات اور اس معاشی تباہی سے مکمل آگاہی دے دی تھی جس سے پاکستان دوچار ہوگا لیکن ان کی باتوں کو بڑے غور سے سننے کے بعد بھی مخدوم صاحب نے اچانک جو سرپرائز دیا ہے وہ واقعی حیران اور پریشان کن ہے۔ زیادہ دیر نہیں گزری کہ ایران نے ایک بین الاقوامی پرواز کو جو دوبئی جا رہی تھی بزور ایران میں اتار کر اپنے ایک مطلوب ملزم اسمٰعیل ریگی کو گرفتار کر کے اسے پھانسی چڑھا دیا ہے۔ بھارتی نیوی نے پاکستان آنے والے ایک جہاز کو بین الاقوامی سمندروں میں روک کر قبضے میں کر لیا تھا اور یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ یہ پاکستانی شپ ہے جو اسلحہ لے کر جا رہا تھا۔ کیا مخدوم صاحب کی ''عوامی حکومت'' اس اہل ہے کہ دہلی سے بھارتی ہوائی جہازوں میں لوڈ ہونے والے تباہ کن اسلحے سے بھرے کسی بھی ہوائی جہاز کو پاکستان میں اتار کر چیک کر سکے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے حکومتی بڑھکیں ایک طرف۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکی خوشنودی میں ہم کہاں تک جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ کیا یہ ملک برائے فروخت ہے کہ جس کا جی چاہے، جیسے چاہے اور جب چاہے اس کے اداروں اور سلامتی کو کوڑیوں کے مول فروخت کر دے۔

قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

حکومتی بیانات ایک طرف اور حقائق ایک طرف۔ زبان خلق پر یہ بات موجود ہے کہ جناب زرداری اپنے تاج وتخت کی سلامتی کے لئے امریکہ میں یہ لکھ کر دے آئیں ہیں کہ وہ بھارت کو واہگہ کے راستے کابل تک رسائی دیں گے اب وہ اس کی جو بھی توجیہہ کریں ان کی مرضی۔

افغان ٹرانزٹ معاہدے کی گونج ابھی فضاء ہی میں تھی کہ محترمہ ہیلری کلنٹن پاکستان تشریف لے آئیں ان کے دورے سے پہلے حسب معمول ہالبروک پاکستان میں فضاء ہموار کر چکے تھے۔ ہیلری کلنٹن صاحبہ نے پاکستان کے لئے جن منصوبوں کا اعلان کیا ہے وہ اونٹ کے منہ میں زیرہ دینے کے مترادف ہیں۔ اپنی روایتی بلیک میلنگ پالیسی کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے آپ نے یہ فرما دیا ہے کہ اسامہ بن لادن اور ملا عمر پاکستان میں چھپے ہوئے ہیں اور کچھ لوگوں کو ان کے ٹھکانوں کا علم بھی ہے۔ ظاہر ہے اس نوعیت کی باتیں جن کی کوئی تک نہیں بنتی پریشر قائم رکھنے کے لئے کی جاتیں ہیں۔ لیکن تابہ کے۔

افغان ٹرانزٹ معاہدہ اور ہیلری کلنٹن کا تازہ دورہ ہمیں یہ سمجھانے کے لئے کافی ہے کہ ہم اپنے مخصوص مفادات کے تحفظ کے لئے جس حد تک بھی چلیں جائیں امریکن ہم سے خوش نہیں ہوں گے وہ ہر مرتبہ ایک نیا بہانا تلاش کر کے ہم پر پریشر بڑھائیں گے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ امریکہ افغانستان میں انڈیا کو اپنا قائم مقام نہ بنا دے جب امریکہ اس گھناؤنے منصوبے میں کامیاب ہو گیا تو وہ حسب روایت اپنا گھوڑا بھی تبدیل کر لے گا۔

(اگست2010ء)

معاشی گورکھ دھندہ

آج چند معمے آپ کی خدمت میں پیش ہیں، پہلے ایک نیم معاشی معمہ ملاحظہ ہو، اس کے راوی ہماری برادری کے ایک محترم متوازن، معتدل اور سنجیدہ لکھنے والے ہیں جو ایک ایک لفظ تول کر استعمال کرتے ہیں اور تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ایک طرف بابائے اردو سے لے کر مقتدرہ قومی زبان تک نے اس کوشش میں سردھڑ کی بازی لگا رکھی ہے کہ اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا جائے کیونکہ اس میں جدید طریقوں کی ادائیگی کے ذرائع موجود ہیں۔ برطانوی عہد میں یہ نچلی عدالتوں کی زبان رہ چکی ہے، جو بعد میں تعصب کی بناء پر خارج کر دی گئی۔ ریاست بھوپال، حیدر آباد اور بعض دوسری ریاستوں میں یہ ہائیکورٹ تک استعمال ہوتی تھی، بھوپال ہائی کورٹ کا یہ مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ ایک مقدمے میں قائداعظم وکیل تھے، فریق ثانی کے وکیل لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر تھے، ان کو پتہ تھا کہ ریاست کی عدالتی زبان اردو ہے اور قائد کی اردو کمزور ہے، لہٰذا آغاز مقدمے میں پہلا سوال انگریزی میں ہی کیا کہ ''آنریبل بیرسٹر کس زبان میں بحث کریں گے'' قائد نے بڑا مختصر جواب دے کر ان کا منہ بند کر دیا۔ "It depends upon the cort" (تفصیل کے لئے دیکھئے اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان

جنوری 08ء) دوسری طرف خواجہ الطاف حسین حالی کے گھرانے کے ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ''اردو درخواست گزاروں، فدویوں، معافی کے خواست گاروں، رحم طلب اپیل کنندوں، جدی پشتنی خادموں اور تابعدار نمک خواروں کی زبان ہے'' (شکر ہے کہ اس مظلوم طبقے کو اپنی درخواستوں، اپیلوں، معافیوں، التجاؤں گزارشوں کے لئے ایک زبان تو میسر آئی) موصوف کے ''مطابق'' اردو زبان میں حضور فیض گنجور جیسے بیمار الفاظ کی بھرمار ہے کوئی انقلابی بات تو کیا کوئی اخلاقی نوٹ بھی نہیں لکھا جا سکتا۔ گو موصوف میری ہی ہم عمر ہیں اور ایک مرتبہ ملاقات کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ پھر بھی بزرگی کا احترام کرتے ہوئے ایک چھوٹا سا سوال کیا جا سکتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو شہید کی پہلی کابینہ کے پہلے وفاقی بجٹ کی تقریر، مسدس حالی اور مقدمہ شعر و شاعری جس نے اردو میں تنقید نو کی بنیاد رکھی، کو کس خانے میں رکھا جائے؟

میرا پچھلا کالم جو وفاقی اور صوبائی بجٹوں پر مشتمل تھا اس پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ایک صوبے کا بجٹ متوازن رہا اور تین صوبوں میں خسارہ بہت نمایاں رہا جبکہ مالیاتی فنڈ کے فارمولے کی بناء پر ان کو پہلے کے مقابلے میں وفاق سے دوچند سے زائد فنڈ میسر آئے۔ کسی غیر معمولی پروجیکٹ کا بھی ذکر نہیں پھر بھاری خسارہ کیوں؟ اور یہ کس طرح پورا ہوگا۔ وفاق سے تو کچھ ملنے کی امید نہیں، سندھ کو تھر پار کر کے کوئلے کے لئے، خیبر پختونخوا کو فاٹا کے لئے پنجاب کو دیہی ترقی کے لئے بعض بین الاقوامی اداروں سے کچھ قرض ملنے کی امید ہے مگر سوال یہ ہے کہ وہ کن شرائط پر ملے گا اور کیا صوبے مجوزہ شرائط پوری کر سکیں گے۔

ایک اور کلیہ سامنے آیا کہ ڈگری اصلی ہو یا جعلی ڈگری ہی رہتی ہے۔ ایک جانب جعلی ڈگری والے اراکین میں کھلبلی مچ گئی ہے دوسری طرف جعلی ڈگریاں بنانے والوں کے ہاں گھی کے چراغ جل رہے ہیں ان کے ہاں ڈگری تو نخالص ہے مگر گھی خالص ہے۔ طالب علموں کے دل باغ باغ ہو گئے اب ان کو موٹی موٹی کتابوں میں سر کھپانے، راتوں کو جاگنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ریلوے

کاؤنٹر پر جس طرح مقررہ رقم دے کر لاہور، پشاور یا کوئٹہ کا ٹکٹ خریدا جاسکتا ہے اسی طرح مقررہ فیس دے کر بی اے، ایم اے بلکہ پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ڈگری فروشوں میں مسابقت شروع ہو جائے گی۔ ان کی طرف سے ایسی ترغیبوں کی اطلاعات ملیں گی کہ ہم سے رابطہ پر 2 یا 3 فیصد ڈسکاؤنٹ ملے گا یا ہماری فراہم کردہ ڈگریوں سے 70 فیصد امیدوار بلا کسی سفارش کے اعلیٰ امتحانات بھی منتخب ہو گئے۔

ایک باپ نے بیٹے کو کالج سے غیر حاضر رہنے پر ٹوکا اور پوچھا تم کئی روز سے کالج نہیں جا رہے، بیٹا کہتا ہے کہ ابا جان اب کالج جانے کی ضرورت نہیں، آپ 40 ہزار کا بندوبست کر دیں، میں بی اے سیکنڈ ڈویژن کی سند آپ کے قدموں میں ڈال دوں گا، سرکاری سطح پر جعلی ڈگریوں کا اثر دوسرے جعلی کاروبار پر بھی پڑے گا۔ امراض قلب کے لئے چونے کی ٹکیاں، اصلی گھی کی بجائے نقلی گھی، دودھ میں پانی کی ملاوٹ کے بجائے پانی میں دودھ کی ملاوٹ ہوا کرے گی اور جب کوئی ڈرگ انسپکٹر چیکنگ کے لئے آئے گا کہ ٹکیا، گھی اور دودھ میں ملاوٹ ہے اور یہ جعلی اشیاء ہیں تو جواب ملے گا نقلی سہی مگر چیزیں تو موجود ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ اصلی یا مصنوعی اور جعلی۔ وزیراعظم کئی مرتبہ اشارہ دے چکے ہیں کہ وہ اپنی کابینہ میں کمی کرنے والے ہیں پہلے یہ اطلاع تھی کہ ساتویں مالیاتی ایوارڈ کے بعد تخفیف ہوگی، پھر یہ اطلاع آئی کہ بجٹ سے پہلے یا اس کے بعد کمی ہوگی، یہ دونوں دور بھی گزر گئے، کمی کے بجائے تین مزید مشیروں کا اضافہ کر لیا گیا، وہ کون سا معمہ ہے، جو وزیراعظم کو کابینہ میں تخفیف سے روک رہا ہے۔

ارکان اسمبلی با قاعدہ سرکاری ملازم تو نہیں مگر ان کو جو بھاری مشاہرے اور مراعات ملتی ہیں وہ صرف اس لئے کہ وہ مقننہ کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے شرکت کیا کریں گے اور ان کو دوران اجلاس طویل وقفوں کے لئے کیفے ٹیریا میں بیٹھنے یا ہال میں جھپکی لینے کی عام اجازت ہوگی۔ غیر حاضری کی شکایت پر ایک پارلیمانی لیڈر نے اس کی توجیہ یوں فرمائی کہ طویل اجلاسوں میں عدم

موجودگی کی وجہ یہ ہے کہ ایسے اجلاسوں کے واسطے بار بار سفر کرنا پڑتا ہے جو انہیں زیر بار کر دیتا ہے س لئے وہ اکثر اجلاسوں میں شرکت نہیں کرتے، لیکن وہ ایوان کی کارروائی سے پوری طرح باخبر رہتے ہیں۔ میرے پاس اراکین کے مشاہروں اور ان کی درجن بھر مراعات کے تازہ ترین اعداد نہیں مگر اوسطاً ان کو ایک لاکھ کے قریب معاوضہ ملتا ہے اس کے علاوہ مختلف مراعات کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے ان کو اسلام آباد میں سرکاری رہائش مہیا کی جاتی ہے جن لوگوں کے ذاتی رہائش ہے ان کو کرایہ، ایک خاص حد تک بجلی اور ٹیلیفون کے بلوں میں ڈسکاؤنٹ، دو تین سواریاں، ان کے ڈرائیور، مقررہ حد تک پٹرول کی فراہمی، جہاز اور ریل کے سفر کے لئے ان کے اور ان کے خاندان کے لئے سفری واؤچرز، دفتر اور گھر کی دیکھ بھال کے لئے مخصوص الاؤنس اور اجلاس کے دنوں کا الاؤنس الگ ملتا ہے پھر بھی زیرباری کا معمہ سمجھ میں نہیں آتا۔

حکومت کے تازہ اعلان کے مطابق ایک روپے سے کم قیمت والے تمام سکے بازار سے واپس لے لئے جائیں گے گو یہ اعلان اب ہوا مگر عملی طور پر ڈھائی تین سال سے چھوٹے سکے بازار سے غائب ہیں۔ یہ صرف پٹرول کی مصنوعات یا سگریٹ کی قیمتوں میں نظر آتے ہیں اس میں صارف ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے اور پمپ والے یا دکاندار فائدے میں رہتے ہیں مثلاً اس وقت مٹی کے تیل ایک لیٹر کی قیمت 65.38 روپے ہے، دکان دار تو 38 پیسے چھوڑنے سے رہا، خریدار ہی کو 62 پیسے زائد دینا ہوں گے کیوں نہ ان کی قیمتوں کو مکمل روپے میں تبدیل کر دیا جائے، سگریٹ میں مختلف اقسام کے درمیان بھی ردوبدل کا امکان ہے تاکہ صارف کو زیر باری سے بچایا جاسکے اس معمہ کو حل کرنا ضروری ہے۔

(اگست 2010ء)

اقتصادیات کا جنازہ

مہنگائی اس وقت پوری دنیا کا مسئلہ ہے لیکن دنیا کے دیگر ممالک اپنی اقتصادی پالیسیاں اتنی ٹھوس مرتب کرتے ہیں کہ مہنگائی کے اثرات عام صارف کو زیادہ متاثر نہ کر سکیں جبکہ پاکستان میں ہر اقدام سے عام صارف ہی متاثر ہو رہا ہے۔ فیڈرل بورڈ آف ریونیو کا ریکارڈ شاہد ہے کہ مجموعی ٹیکس ریونیو میں 60 فیصد بالواسطہ ٹیکس عام شہری ادا کرتا ہے جس میں کسٹم ڈیوٹی، سیلز ٹیکس، فیڈرل ایکسائز ڈیوٹی وفاقی جبکہ صوبائی سطح پر بھی حکومت کے ہر ٹیکس کا بوجھ عام شہری پر ہی پڑ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی 40 فیصد براہ راست ٹیکس بھی کارخانہ دار اور دکاندار اپنے خریداروں کو منتقل کر رہا ہے۔ اس ساری صورتحال میں کمر صرف غریب ہی کی ٹوٹ رہی ہے۔ دراصل عصر حاضر کو بحرانوں کے دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سیاسی، معاشی اور صنعتی بحران سب اصطلاحیں اس قدر عام ہو چکی ہیں کہ اب تو یہ بھی معمول کی کارروائی سمجھی جانے لگی ہیں۔ پٹرولیم مصنوعات، بجلی، گیس اور اشیائے خورد و نوش کے نرخوں میں اضافہ روزمرہ کی بات ہے ان عوامل کی وجہ چاہے جو کچھ بھی ہو ہمارے معاشرے میں یکطرفہ نرخ بڑھانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ڈیری مصنوعات، سبزیاں، فروٹ یا اشیاء خورد و نوش کی گرانی کی وجہ تیل کی قیمتیں بڑھ جانا بتایا جاتا ہے لیکن جب عالمی منڈی

میں تیل کی قیمتیں کم ہوتی ہیں تب اس شرح تناسب سے ہمارے ہاں تیل کی قیمتوں میں کمی نہیں آتی۔ چینی کے نرخوں میں اضافہ معمول کی بات ہے وجہ شوگر کی صنعت کی بحرانی کیفیت اور گنے کی پیداواری کمی بتائی جاتی ہے۔ دراصل مہنگائی کا عذاب نادیدہ ہوتا ہے جس نے پورے معاشرے کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ اور عوام جسمانی، ذہنی اور روحانی سطح پر مفلوج ہیں جبکہ دوسری طرف طبقہ اشرافیہ ہر طرح کے عیش و آرام سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ حقائق اس قدر تلخ ہیں کہ روح کانپ اٹھتی ہے۔ وطن عزیز میں بسنے والوں کو کبھی امیر، غریب اور درمیانے طبقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا لیکن اب پاکستان صرف دو طبقوں والا ملک بنتا جا رہا ہے اب یہاں صرف دو طبقے ہیں امیر اور غریب، مڈل کلاس طبقہ مدت ہوئی لوئر مڈل کلاس سے ہوتا ہوا غریب ہو چکا ہے۔ اب غریب دو وقت کی روٹی کے چکر میں ہے۔ عوام کی قوت خرید اس قدر کم ہو گئی ہے کہ لوگ اب بازار جاتے ہیں لیکن خریداری کے لئے نہیں بلکہ ونڈو شاپنگ کیلئے۔ پہناووں اور اشیاء صرف کی بڑھتی ہوئی قیمتوں نے عوام سے بازار یا مارکیٹ کا رخ کرنے کی سہولت چھین لی ہے۔ وطن عزیز اپنے قیام سے لے کر آج تک دنیا میں رائج تین معاشی نظام مختلف ادوار میں مختلف حیثیتوں سے دیکھ چکا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خدوخال کو ذوالفقار علی بھٹو نے سوشلسٹ نظریے کے ساتھ تبدیل کرنے کی کوشش کی اور بہت سارے ادارے حکومتی عمل داری میں آ گئے جس کے نتیجے میں مارکیٹ کا کنٹرول بھی سرکار کے ہاتھ آ گیا۔ کیپٹل ازم اور سوشلسٹ نظریے کے ساتھ ہمارے ہاں مکسڈ اکانومی بھی چلتی رہی لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہم ہر دور میں تجربات ہی سے گزرتے رہے ہم نے ایک وقت میں اداروں کو قومی تحویل میں لیا تو دوسرے مرحلے میں مزید اداروں کو حکومتی کنٹرول میں لینے کی بجائے انہیں کھلی بولی کے ذریعے نیلام کیا۔ ہم نے گھی کارپوریشن آف پاکستان بنا کر خوردنی تیل اور گھی کی صنعت سرکاری کنٹرول میں لے لی تو دوسری جانب گھی کے کارخانوں کو اتنا آزاد چھوڑا کہ چند سرمایہ دار ایک بزنس نیچ پر اکٹھے ہو کر گھی مہنگا اور سستا کرنے

لگے اور حکومت کا نرخوں سے متعلق ادارہ تماشائی ہی بنا رہا۔اسی طرح سرمایہ دار اپنی مرضی سے مصنوعات کے نرخ بڑھا دیتے ہیں۔ذوالفقار بھٹو نے چینی کے نرخوں میں برائے نام اضافے کو بنیاد بنا کر فیلڈ مارشل ایوب خان کے خلاف پوری قوم کو اکٹھا کر لیا اور اقتدار سنبھالتے ہی شوگر ملز مالکان کو نکیل ڈالی لیکن آج پارلیمنٹ کے اندر بیٹھے ہوئے چند شوگر ملز مالکان غریب اور متوسط طبقے کو معاشی طور پر بری طرح متاثر کر رہے ہیں حکومتی مشینری ان کو کسی قاعدے قانون کا پابند بنانے میں بری طرح ناکام ہو رہی ہے۔اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مہنگائی ایک عالمگیر مسئلہ ہے پٹرولیم مصنوعات،خوردنی تیل کی قیمتیں اور کرنسی کے ریٹ عالمی منڈی میں طے ہوتے ہیں۔ حکومت صرف ان اشیاء کی طلب اور رسد میں توازن ممکن بنا کر مارکیٹ میں بروقت اور عالمی منڈی کے نرخوں کے ساتھ مطابقت قائم رکھتے ہوئے فراہمی کی ذمہ دار ہے،تاہم مقامی پیداوار کی رسد اور فراہمی کے ساتھ ان کے نرخوں پر کنٹرول انتظامیہ ہی کا کام ہے جو وفاقی،صوبائی اور ضلعی سطح پر ایگزیکٹو سیٹ اپ میں طے شدہ طریقہ کار کے تحت ہی سرانجام دیا جا سکتا ہے۔سابق وفاقی وزیر خزانہ شوکت ترین کرپشن کو ملکی معیشت کے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دے چکے ہیں ملک میں کرپشن کا حجم 103 کھرب روپے تک پہنچ چکا ہے یہی وجہ ہے کہ ملک کا پورا انتظامی سیٹ اپ مل کر بھی مہنگائی کے جن کو قابو کرنے میں ناکام رہا ہے۔وفاقی ادارہ شماریات اس امر کی تصدیق کر رہا ہے کہ گزشتہ ہفتے مہنگائی کی شرح میں 18.82 فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔سرکاری رپورٹ کے مطابق 21 اشیاء کی قیمتیں بڑھی ہیں جن سے 7 ماہ کے دوران 163 ارب روپے سیلز ٹیکس ادا کرنے والے عام صارفین ہی متاثر ہوئے ہیں مہنگائی پورے ملک میں ہے اور ہر پاکستانی اس کا خاتمہ چاہتا ہے لیکن خیبر پختونخواہ صوبے کا شہری 1979ء سے 2010ء تک افغانستان کی صورتحال سے بری طرح متاثر رہا ہے۔یہاں سے اشیاء خوردونوش کی بڑی مقدار سرحد پار چلی جاتی ہے جس سے تاجروں،صنعت کاروں اور جاگیرداروں کی آمدنی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے نام پر سمگلنگ کی شرح میں ہونے والا اضافہ ملکی معیشت کو کھوکھلا جبکہ چند کاروباری خاندانوں کی تجوریاں بھر رہا ہے لاکھوں افغان مہاجرین کی آمد اور پاکستان خصوصاً خیبر پختونخواہ میں تیار ہونے والی اشیاء کی افغانستان ترسیل سے ہمارے صنعت کاروں کو بڑی منڈیاں مل گئی ہیں لیکن اس سب کے باوجود وہی کارخانہ اور دکاندار عوام کے خون پسینے کی کمائی سے جمع ہونے والا ٹیکس دہشت گردی کے نام پر حکومت سے پیکج کی صورت حاصل کر رہا ہے۔وطن عزیز میں مہنگائی کے ساتھ یوٹیلٹی بلوں نے غریب اور متوسط طبقے کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے جبکہ اربوں ڈالر قرض دینے والے ممالک اور ادارے بجلی گیس اور دوسرے یوٹیلٹی بلوں میں عوام کو سبسڈی یا کسی اور صورت ریلیف دینے کی مخالفت کر رہے ہیں اور نرخوں میں مزید اضافے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔سٹیٹ بنک کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کا ہر فرد اوسطاً 24 ہزار 412 روپے کا مقروض ہے جو بھارت کے مقابلے میں 75 فیصد زائد ہے۔بینک کے اعداد و شمار کے مطابق اس وقت مجموعی غیر ملکی قرضوں کی مالیت 50 ارب ڈالر ہے جبکہ آبادی 17 کروڑ ہے۔اس کے مقابلے میں بھارت کا جائزہ لیا جائے تو اس کے مجموعی قرضوں کی مالیت 222 ارب ڈالر جبکہ آبادی تقریباً ایک ارب 25 کروڑ ہے۔اس طرح بھارت کا ہر شہری اپنی آبادی کے اعتبار سے 8 ہزار 880 روپے کا مقروض ہے جو پاکستان کے مقابلے میں 75 فیصد کم ہے دوسری جانب آئی ایم ایف نے پاکستان کو شرح سود میں کسی قسم کی کمی نہ کرنے کا عندیہ دیدیا ہے۔ملک میں مہنگائی کا طوفان مزید بڑھنے والا ہے۔آنے والے دنوں میں تیل کی قیمتیں بڑھنے پر پاکستان کی معیشت میں طلب کا رجحان مزید بڑھ جائے گا۔بیرونی قرضوں سے عوام کو براہ راست کوئی فائدہ نہیں۔ غیر ملکی پراجیکٹس اور دیگر منصوبے ابتداء ہی میں ناکام ہو جاتے ہیں۔پروجیکٹس کے سربراہ کیلئے سفارشوں کی بنیاد پر نااہل افراد کا تقرر کیا جاتا ہے جو پراجیکٹ کو عوام کے مفاد میں چلانے اور جس مقصد کے لئے یہ پراجیکٹ قائم کیا گیا ہے اس کے ثمرات سے عوام کو مستفید کرنے کی بجائے نئے

ماڈل کی گاڑیوں کی خریداری، دفاتر میں غیر ضروری تزئین و آرائش اور ٹی اے ڈی اے پر ساری رقوم خرچ کر دیتا ہے جس کا خمیازہ عوام کو بھگتنا پڑتا ہے اور اس طرح عوام ایک ایسے قرضے تلے دبتے چلے جا رہے ہیں جو ان پر سرے سے خرچ ہی نہیں ہوا۔ ماہرین اقتصادیات کا موقف ہے کہ حالت جنگ ہو یا امن گھی، آٹے، چاول، دال چینی کا استعمال کم نہیں ہوتا لوگ زندہ رہنے کے لئے خوراک حاصل کرتے ہیں پھر کارخانہ دار کس چیز سے متاثر ہو رہا ہے اگر چند غیر ضروری اشیاء کے استعمال میں کمی آئی بھی ہے تو وہ بہت معمولی ہے۔ صرف ایک بینک نے گزشتہ 5 سال کے دوران 19 ارب روپے کے قرضے معاف کیے ہیں۔ قرضے معاف کرانے والوں میں وہ ادارے بھی شامل ہیں جو مالی طور پر مستحکم قرار دیئے جا رہے ہیں اس لوٹ مار میں سرمایہ دار مزید مستحکم جبکہ غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے جس کے لئے زندگی کی گاڑی کو رواں رکھنا بھی ممکن نہیں رہا۔ حکومت کے انتظامی سیٹ اپ میں مقامی مارکیٹ کنٹرول کرنا ڈسٹرکٹ سطح کی مینجمنٹ کا کام ہے۔ انگریز سرکار نے اپنے ریونیو کلکٹر یعنی ڈپٹی کمشنر کو بے انتہا اختیارات دے رکھے تھے جن میں ایک مارکیٹ کنٹرول بھی تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ قیمتوں کو مستحکم رکھنے کے ساتھ اشیاء ضروریہ کی طلب اور رسد سے متعلق معاملات کا بھی نگران ہوتا تھا لیکن سابق صدر پرویز مشرف کے متعارف کروائے گئے ضلعی نظام حکومت میں ضلعی اختیارات ناظمین کو سونپے گئے اور ڈسٹرکٹ مینجمنٹ کا ذمہ دار افسر منتخب ناظم کے زیر سایہ کام کرنے لگا اس دوران مارکیٹ چیک اینڈ بیلنس سے آزاد ہو گئی تاہم اس نظام کے خاتمے کے باوجود مہنگائی کا جن قابو میں نہیں آ رہا۔ تمام تر حکومتی دعوؤں اور اقدامات کے باوجود گزشتہ دو برسوں کے دوران اشیائے خورد و نوش سمیت یوٹیلیٹی بلز کی قیمتوں میں 100 سے 120 فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ معاشی ماہرین کے مطابق افراط زر کی شرح میں اضافے کی وجہ سے اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے رواں مالی سال کے پانچویں مانیٹری پالیسی میں شرح سود کی کمی کرنے سے انکار کرتے ہوئے اس ماہ کے آخر تک برقرار رکھنے کا اعلان کیا

ہے۔ اسیٹ بنک آف پاکستان کی رپورٹ کے مطابق تمام اشیائے خورد و نوش، سوئی گیس پٹرول، ڈیزل اور استعمال کی دیگر اشیاء کی قیمتوں میں ریکارڈ اضافہ ہوا ہے۔ دو سال کے دوران صرف ڈیزل کے نرخوں میں تقریباً 100 فیصد اضافہ ہوا، ڈیزل 37.9 روپے لٹر سے بڑھ کر 73.62 روپے اور پٹرول 53.8 روپے فی لٹر سے 69.84 روپے ہو گیا ہے۔ مارکیٹ ذرائع کے مطابق پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے پیداواری لاگت بڑھتی ہے اور مینوفیکچرنگ شعبہ اسی کی بنیاد پر تمام مقامی سطح پر تیار ہونے والی اشیاء کی قیمتیں بڑھا دیتا ہے۔ بجلی کی قیمتوں میں دو سال کے دران اوسطاً 120 فیصد اضافہ ریکارڈ ہوا ہے اور گھریلو فی یونٹ 7 روپے کے قریب جبکہ کمرشل یونٹ 19 روپے تک پہنچ گیا ہے۔ جو قبل ازیں 3 روپے اور 9 روپے تھا۔ سوئی گیس فی یونٹ 115.4 روپے سے بڑھ کر 286.3 روپے فی ایم ایم بی ٹی یو، ایل پی جی کا 11.8 کلو گرام سلنڈر 792 روپے سے بڑھ کر 1061 روپے، گندم 17 روپے فی کلو گرام سے بڑھ کر 27 روپے فی کلو گرام، آٹا 18 روپے سے بڑھ کر 36 روپے فی کلو گرام، باسمتی ٹوٹہ چاول 25 روپے سے بڑھ کر 54 روپے فی کلو گرام، بڑا گوشت 100 روپے سے بڑھ کر 200 روپے فی کلو گرام، چھوٹا گوشت 250 روپے سے 380 روپے فی کلو گرام، مرغی کا گوشت 125 سے بڑھ کر 150 روپے فی کلو گرام، انڈے 37 روپے سے بڑھ کر 60 روپے فی درجن، چینی 30 سے بڑھ کر 65 روپے فی کلو گرام، گڑ 31 روپے سے بڑھ کر 73 روپے فی کلو گرام، تازہ دودھ 30 روپے سے بڑھ کر 50 روپے فی لٹر، کوکنگ آئل کی قیمتوں میں 31 روپے فی لٹر اور گھی کی قیمت میں 30 روپے فی کلو گرام، اضافہ ہوا ہے۔ چائے کی پتی 276 روپے فی کلو گرام سے بڑھ کر 516 روپے فی کلو گرام، آلو 10 روپے سے بڑھ کر 30 روپے فی کلو گرام، پیاز 12 روپے سے بڑھ کر 30 روپے فی کلو گرام، ادرک 43 روپے سے بڑھ کر 180 روپے فی کلو گرام، دال ماش ثابت 50 روپے سے 160 روپے فی کلو گرام، دال ماش دھلی ہوئی 71 روپے سے 134 روپے

فی کلوگرام، دال مونگ دھلی ہوئی 52 روپے سے 85 روپے فی کلوگرام، دال چنا 42 روپے سے 57 روپے فی کلوگرام، سرخ مرچ 137 روپے سے 165 روپے فی کلوگرام ہوگئی ہے۔ اوپن مارکیٹ میں انہی اشیاء کی قیمتوں میں کم وبیش 30 تا 60 فیصد اضافہ ہوا ہے جنہیں سرکاری سطح پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ صابن، شیمپو اور روزمرہ استعمال کی تمام چیزوں کی قیمتوں میں 50 فیصد سے زائد اضافہ ہوا ہے۔ معاشی ماہرین کے مطابق سیلز ٹیکس کو ویلیو ایڈڈ ٹیکس میں تبدیل کرنے کے بعد روزمرہ استعمال کی اشیاء میں مزید اضافہ ریکارڈ ہونے کا اندیشہ ہے۔ ملاوٹ کا عالم یہ ہے کہ دودھ میں پانی صرف اسے پتلا کر دیتا ہے لیکن آج کل پانی کے ساتھ انتہائی مضر کیمیکل ملائے جا رہے ہیں جو دودھ کو گاڑھا کر دیتے ہیں۔ گوشت کا معیار چیک کرنے کے لئے ذبح خانوں میں ڈاکٹر کی مہریں ہر جانور پر لگی ہوتی ہیں جبکہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ انتہائی لاغر اور بیمار جانور روزانہ ذبح کر کے مارکیٹ لائے جا رہے ہیں۔ پھل فروٹ عام آدمی کی پہنچ سے دور ہیں سبزیوں کے نرخ ہر دکاندار من مانے وصول کر رہا ہے۔ ہماری بیوروکریسی کا اب تک یہ کہنا تھا کہ پورا نظام منتخب لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اب سب کچھ بیوروکریسی کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ایڈمنسٹریٹر مہنگائی کے جن کو قابو کر پائیں گے یا منتخب لوگوں کی طرح مصلحت کا شکار ہو کر خاموش تماشائی بنے رہیں گے۔ سیاسی قیادت سے متعلق تو یہ بات عام ہے کہ کسی منتخب بندے کے لئے امن وامان قائم رکھنے کے لئے سخت قدم اٹھانا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ اسے اپنا ووٹر عزیز ہوتا ہے لیکن اب تحصیل اور ڈسٹرکٹ سطح پر سرکاری افسران کی کارکردگی کا امتحان ہے۔ تاہم اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ان افسروں پر سیاسی دباؤ کم سے کم پڑے۔ 6 افراد پر مشتمل خاندان کے زندہ رہنے کے لئے ماہانہ کم از کم 15 ہزار روپے بھی ناکافی ہیں۔ اوسط خاندان کو ماہانہ کچن اخراجات کی مد میں 8 ہزار سے 10 ہزار روپے تک خرچ کرنا پڑتا ہے بجلی بل 1500 روپے، گیس بل 500 روپے، پانی کا بل 125 روپے ہے۔ بچوں کے تعلیمی اخراجات ایک ہزار روپے ماہانہ فی بچہ لگا لیں جبکہ کچن اور دیگر روزمرہ

کے اخراجات ملا کر مجموعی تخمینہ ہر صورت 15 ہزار روپے سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ان اخراجات میں ہنگامی حالات، بیماری، شادی، بیاہ اور ماتم پر اٹھنے والے اخراجات شامل نہیں اور نہ رمضان المبارک، عیدالفطر، عیدالضحیٰ اور دیگر ایام میں اٹھنے والے اخراجات شامل کیے گئے ہیں۔ ایک سے چہارم تک سکیل کے سرکاری ملازمین کس طرح اخراجات سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں۔ اگر گریڈ 17 کے ایک ملازم جس کی ملازمت کو بھی معقول عرصہ گزر چکا ہو وہ بھی ان اخراجات سے بمشکل نپٹ سکتا ہے جبکہ ایک بڑا طبقہ پارٹ ٹائم ملازمت پر مجبور ہے بہت سے سرکاری ملازمت فارغ اوقات میں رکشہ اور ٹیکسی چلاتے ہیں۔ پرائیویٹ اداروں میں ملازمت کرتے ہیں اور اپنے گھر کا چولہا جلانے کے لئے ایڈوانس تنخواہیں لیتے ہیں جبکہ پرائیویٹ سیکٹر میں تنخواہیں سرکاری محکموں سے بھی بہت کم ہیں بلکہ ایسے ادارے بھی ہیں جن سے متعلق شکایات عام ہیں کہ وہ اپنے ملازمین کو تنخواہیں نہیں دیتے اور تنخواہ کے مطالبے پر غریب ملازمین کو ملازمتوں سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ جس کے باعث سماجی بحران جنم لے رہا ہے۔ ڈکیتی، چوری، راہزنی اور قتل وغارت اس مالی بحران کے خاص اجزائے ترکیبی ہیں جبکہ معاشی ضروریات پوری کرنے کے لئے بعض خواتین بے راہ روی کا شکار ہو رہی ہیں۔ اشیاء صرف کے بعد پہناووں جن میں جوتی اور کپڑے شامل ہیں ضروریات زندگی میں شامل ہیں۔ اگر گرمیوں اور سردیوں میں صرف ایک فرد کے لئے تین سوٹ بنائے جائیں تو ایک خاندان میں 18 جوڑے کپڑوں کے بنتے ہیں جبکہ خواتین کے کپڑوں کے نرخ آسمان سے باتیں کر رہے ہیں ان میں سب سے زیادہ استعمال ہون والا کپڑا لون 450 روپے سے 500 روپے اور چکن بریزہ 700 روپے فی سوٹ ہے۔ یوں اوسطاً ایک خاندان میں 10 سے 15 سوٹ خواتین کے بنتے ہیں جن پر اوسطاً 9 ہزار سے 17 ہزار روپے سالانہ خرچ آتا ہے اس طرح مردانہ ورائٹی میں کاٹن کم از کم 600 روپے فی سوٹ کھدر 800 روپے، واش اینڈ ویئر 500 روپے اور بوسکی 3 ہزار روپے میں ملتا ہے۔ یعنی ایک اوسط درجے کا

خاندان سالانہ 28 سے 35 ہزار روپے کپڑوں کی مد میں خرچ کرتا ہے البتہ ان میں بچوں کے سکول یونیفارم شامل نہیں۔ عوامی حلقوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے پیپلز پارٹی کو مینڈیٹ اس لئے دیا تھا کہ وہ شہید جمہوریت ذوالفقار علی بھٹو کے نعرے روٹی، کپڑا، مکان کو عملی جامہ پہنائے گی تاہم گزشتہ اڑھائی سال سے اس نعرے کے برعکس اقدامات اٹھائے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کی مالی سال 2010-11 کے بجٹ سے کافی امیدیں وابستہ تھیں لیکن انہیں مایوسی ہوئی۔ سپین جماعت کے سامنے دیہاڑی کے انتظار میں بیٹھے مزدوروں کا کہنا تھا کہ انہیں 250 روپے سے 350 روپے بہ مشکل دیہاڑی پر کام ملتا ہے وہ بھی ہفتے میں تین یا چار دن ہی ہوتا ہے ایسے میں دو وقت کی روٹی تک کیلئے پیسے نہیں ہوتے۔ انہوں نے کہا کہ اگر دوپہر تک انہیں کہیں روزگار نہیں ملتا تو وہ خالی ہاتھ گھروں کو لوٹ جاتے ہیں ایسے میں دو وقت تو درکنار ایک وقت کی روٹی بھی نہیں خریدی جا سکتی۔

(اگست 2010ء)

پاک افغان تجارتی معاہدہ

18 جولائی کو ہونے والے پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدے کو دو ہفتے ہو گئے ہیں۔ معاہدے پر دستخط کی تقریب کے بعد سے اب تک خیبر پختونخوا سمیت ملک بھر کی بزنس کمیونٹی نے جس بھرپور انداز میں معاہدے کو مسترد کرتے ہوئے احتجاج کیا اور اپنے خدشات ریکارڈ پر لائی اس سے یہ امکانات روشن ہو گئے ہیں کہ کابینہ یا پارلیمینٹ کے لئے اس معاہدے کی منظوری اتنی آسان نہیں رہی۔ پاکستان اور افغانستان کے مابین دوطرفہ تجارت میں اضافہ کے لئے پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کا نیا معاہدہ اور بالخصوص بھارت کو سہولیات کی فراہمی واضح طور پر امریکی دباؤ کا نتیجہ دکھائی دیتا ہے۔ معاہدے کے ڈرافٹ میں پاکستان نے افغانستان کو اپنی مصنوعات بھارت برآمد کرنے کے لئے واہگہ بارڈر تک جانے اور پاکستان کا زمینی راستہ استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، تاہم بھارت کو پاکستان کا زمینی راستہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ اس کے بدلے افغانستان پاکستان کو وسطی ایشیائی ریاستوں تک راہداری فراہم کرے گا۔ معاہدے میں بھارت کو واہگہ بارڈر پر افغانستان جانے والے سامان کو ان لوڈ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ جہاں سے افغان ٹرک بھارتی سامان افغانستان لے جا سکیں گے۔ معاشی ماہرین نے پاک افغان

ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدہ کو ملکی مفادات کے خلاف قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس معاہدے سے پاکستان کی معیشت پر بہت برے اثرات مرتب ہوں گے۔ معاہدے کا مقصد بھارت کو فائدہ پہنچانا ہے اور معاہدہ امریکی دباؤ میں کیا گیا۔ معاہدے سے سمگلنگ میں اضافہ ہوگا اور یہ معاہدہ کسی بھی پہلو سے پاکستان کے حق میں نہیں۔ معاہدے سے پاکستان کی معیشت پر منفی اثرات مرتب ہونگے۔ حکومت نے یکطرفہ طور پر افغانستان کو بہت زیادہ رعایت دی ہے جس سے بھارت بالواسطہ طور پر مستفید ہوگا۔ بھارت ہمیں نیپال اور تبت تک راہداری دینے کے لئے تیار نہیں۔ ادھر بزنس کمیونٹی نے پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے نئے معاہدے کو مسترد کرتے ہوئے اپنے شدید تحفظات کا اظہار کیا ہے بزنس کمیونٹی کا موقف ہے کہ اس معاہدے سے پاکستان میں ٹرانسپورٹ کا شعبہ بری طرح متاثر ہوگا جبکہ مال برداری سے ہونے والی پاکستان ریلوے کی آمدنی بند ہونے کے ساتھ ہزاروں افراد بے روزگار ہو جائیں گے۔ بزنس کمیونٹی کا کہنا ہے کہ معاہدے کے تحت اگر افغانستان کے ٹرانسپورٹر کراچی سے مال افغانستان لے کر جاتے ہیں تو پاکستان کے ٹرانسپورٹر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں گے جبکہ افغان ٹرانسپورٹرز کی آمد سے امن و امان کی صورتحال متاثر ہونے کا بھی خدشہ ہے۔ یہاں پر نئے افغان ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدے سے ملکی معیشت پر منفی اثرات کی تفصیل سے قبل موجودہ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدے کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ بین الاقوامی قوانین اور جنیوا کنونشن کے تحت جس ملک میں سمندر نہیں ہوگا اس کا ہمسایہ ملک اس کو سمندری سہولیات فراہم کرے گا اور سمندر سے محروم ملک کے لئے دیگر ممالک سے آنے والی تمام اشیاء کیلئے اپنی بندرگاہ سے دوسرے ملک کی سرحد تک راہداری کی سہولت فراہم کریگا۔ جیسے بھارت نیپال کو یہ سہولت مہیا کر رہا ہے۔ پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدہ 45 سال قبل 1965ء میں جنیوا کنونشن کے تحت عمل میں لایا گیا جس کے تحت پاکستان اپنی بندرگاہ یعنی کراچی سے طورخم تک راہداری کی سہولت فراہم کر رہا ہے۔ افغانستان کیلئے دیگر ممالک سے آیا مال

وراستوں کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔ ایک صوبہ خیبر پختونخوا میں طورخم اور دوسرا کوئٹہ میں چمن کے راستے ٹرانزٹ کی جاتی ہے۔ کراچی سے پشاور تک ٹرانزٹ ٹریڈ کا مال بذریعہ ریل پہنچایا جاتا ہے جس سے پاکستان ریلوے سالانہ ڈیڑھ سے 3 ارب روپے کما رہا ہے۔ ریلوے کے علاوہ افغانستان کیلئے مال این ایل سی یعنی نیشنل لاجسٹک سیل کے ذریعے بھی پشاور تک پہنچایا جاتا ہے۔ ریلوے کی ایک ویگن (بوگی) پر 22 ٹن تک مال لادا جا سکتا ہے جس کا کراچی سے پشاور تک کرایہ 48 ہزار روپے بنتا ہے جبکہ این ایل سی کا کرایہ 75 ہزار روپے تک ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ریلوے کے ذریعے مال پشاور تک تاخیر سے پہنچتا ہے جبکہ این ایل سی کے ذریعے مال جو کنٹینرز اور ٹرکوں کے ذریعے پشاور تک پہنچایا جاتا ہے وہ ریلوے کی نسبت کم وقت میں پہنچتا ہے۔

افغانستان کو راہداری کی سہولت دینے کے علاوہ پاکستان افغانستان کی مصنوعات کے لئے بھی دیگر ممالک تک رسائی کی سہولت دیتا ہے۔ خصوصاً افغانستان کے فریش اور ڈرائی فروٹ کی دنیا بھر میں مانگ ہے۔ کوئٹہ سے چونکہ قندھار نزدیک پڑتا ہے اس لئے وہاں کی پیداوار انار اور انگور کوئٹہ کے راستے بھارت اور دیگر ممالک کو پہنچایا جاتا ہے جبکہ خیبر پختونخوا میں پاک افغان سرحد کے قریب مزار شریف ہے جہاں کی پیداوار فریش اور ڈرائی فروٹ کے علاوہ اعلیٰ قسم کا انگور بھی ہے۔ پاکستان کے راستے بھارت پہنچایا جاتا ہے۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدے کے مطابق ٹرانزٹ کا تمام مال ٹیکسوں سے مستثنیٰ ہوتا ہے لہٰذا حکومت پاکستان کو اس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا لیکن اس ٹرانزٹ کے ذریعے فریٹ کی سہولیات کی مد میں پاکستان ریلوے سالانہ 3 ارب روپے کما رہا ہے اس کے علاوہ صرف کراچی میں 3 ہزار کسٹم کلیئرنگ ایجنٹ کام کر رہے ہیں اور ہر ایجنٹ کے پاس 15 سے 20 افراد پر مشتمل عملہ ہے جبکہ کراچی پورٹ ٹرسٹ (کے پی ٹی) پر کرینز اور دیگر بھاری مشینری پر کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ اسی طرح صوبہ خیبر پختونخوا میں رجسٹرڈ کسٹم کلیئرنگ ایجنٹس کی تعداد 300 ہے۔ 60 بارڈر ایجنٹ ہیں ان کے پاس بھی 10 سے

15 افراد پر مشتمل عملہ ہے جس میں 8 افراد ان فارورڈنگ ایجنٹس کے دفاتر میں 4 ڈرائی پورٹ، 2 ایئر پورٹ اور 4 طورخم بارڈر پر خدمات انجام دیتے ہیں، ان ہزاروں افراد کا روزگار ٹرانزٹ ٹریڈ سے وابستہ ہے۔ نئے معاہدے کی راہ 2009ء کے آخر میں ہموار کی گئی ورلڈ بینک نے پاکستان اور افغانستان کو 1965ء میں کیے جانے والے پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدے میں ترامیم کرنے کی خواہش ظاہر کی اور نیا پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدہ عمل میں لانے کے لئے 13 جنوری کو اسلام آباد میں پاکستان اور افغانستان کے ٹرانزٹ ٹریڈ سے وابستہ تاجروں کے لئے ایک روزہ کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ کانفرنس کے تمام انتظامات ورلڈ بینک نے کیے تھے حیران کن بات تو یہ ہے کہ معاہدہ پاکستان اور افغانستان کے مابین ہونے جا رہا تھا اور دونوں ممالک کی تجارت کی وزارتوں کے بجائے اس کے لئے بات چیت کا انعقاد ورلڈ بینک کر رہا ہے اور اس معاہدے کو جلد از جلد حتمی شکل دینے پر زور دے رہا ہے۔ (1965ء میں پاک افغان معاہدہ دونوں ممالک کی وزارتوں کے درمیان ہوا اور اس میں کوئی تیسرا فریق شامل نہیں تھا) 13 جنوری کی تقریب میں ورلڈ بینک کے نمائندوں کے علاوہ افغانستان کے اس کاروبار سے وابستہ افراد نے شرکت کی جبکہ صوبہ خیبر پختونخوا سمیت پاکستان کے کل 110 تاجر شامل ہوئے۔ تقریب کے پہلے سیشن میں ورلڈ بینک نے نئے افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے حوالے سے بریفنگ دی جبکہ دوسرے سیشن میں اس کاروبار سے وابستہ افراد نے اپنی تجاویز دیں جبکہ خیبر پختونخوا کی نمائندگی کرنے والے تاجروں نے پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ میں بعض ترامیم پر اپنے شدید تحفظات کا اظہار کیا اس وقت نئے ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدے میں جو چیدہ چیدہ نکات شامل کرنے کی تجویز ورلڈ بینک نے دی تھی ان میں افغانستان کا مال کراچی بندرگاہ سے چمن اور طورخم پہنچانے کے لئے ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی خدمات حاصل کرنا تھی جو افغانستان کا تمام مال، بحفاظت پاک افغان بارڈر پر پہنچائے گی جبکہ کمپنی کا اپنا عملہ ہو گا اور وہ اس مقصد کے لئے اپنی ٹرانسپورٹ استعمال کرے گی۔ دوسرا اہم نقطہ یہ

تھا کہ بھارت کا افغانستان کے لئے بھجوایا گیا مال جو دوبئی سے ہو کر کراچی بندرگاہ تک پہنچتا ہے اب بھارت واہگہ بارڈر لاہور سے براہ راست اپنے کنٹینرز اور ٹرکوں کے ذریعے طورخم تک پہنچائے گا۔ معاہدے میں تیسرا انتہائی منفی پہلو یہ شامل کیا گیا تھا کہ معاہدے میں افغانستان کے لئے Agree جبکہ پاکستان کیلئے ضامن کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی افغانستان معاہدے کے کبھی بھی dis agree کر سکتا ہے لیکن پاکستان چونکہ ضامن ہے لہٰذا وہ اس سے کبھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا اس مجوزہ ڈرافٹ پر بزنس کمیونٹی نے سخت تحفظات کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ ان تین نکات کے پاکستان پر انتہائی منفی اثرات پڑیں گے پہلا انتہائی اہم پوائنٹ ملٹی نیشنل کمپنی کو ٹرانسپورٹ کی ذمہ داری دینا جس سے کراچی، کوئٹہ اور صوبہ خیبر پختونخوا 3300 فارورڈنگ ایجنٹس کے علاوہ ان کے پاس کام کرنے والا عملہ جس کی تعداد ہزاروں میں بنتی ہے۔ بے روزگار ہو جائے گا دوسرا انتہائی منفی پہلو ٹرانزٹ کے لئے استعمال ہونے والی ٹرانسپورٹ کو بھی ہم سے چھین لینا ہے۔ کمپنی کی اپنی گاڑیاں استعمال ہونے سے صرف پاکستان ریلوے کو سالانہ 3 ارب روپے کا نقصان اٹھانا پڑیگا جو پہلے ہی اربوں کے خسارے کا شکار ہے۔ تیسرا منفی پہلو بھارت کو پاکستان کے راستے افغانستان تک راستہ دینا ہے جو کسی طور ملکی مفاد میں نہیں ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ 13 جنوری کو اسلام آباد میں ہونے والی کانفرنس میں شامل بزنس کمیونٹی نے اپنے شدید تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے تحریری طور پر حکومت کو آگاہ کر دیا تھا پاکستانی سرمایہ کاروں کا شروع سے یہ مطالبہ رہا ہے کہ اگر ہم افغانستان کو راہداری کی سہولت بغیر کسی سرکاری ٹیکس کے دے رہے ہیں تو کیوں نہ پاکستان کو بھی افغانستان کے ذریعے وسطی ایشیائی ممالک تک رسائی دی جائے اور پاکستانی مصنوعات بھی افغانستان کے ذریعے 6 آزاد ریاستوں اور دیگر ممالک کو سپلائی کر سکیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ اگر بھارت کو واہگہ کے ذریعے افغانستان کو مال سپلائی کرنے کی اجازت دی جاتی ہے تو کیوں نہ پاکستانی مصنوعات بھی بھارت کے راستے بنگلہ دیش اور دیگر ممالک تک

پہنچائی جائیں۔ حیران کن بات تو یہ ہے کہ ورلڈ بنک کی پہلی کانفرنس میں پاکستان کے تیار کردہ ڈرافٹ کو پیش ہی نہیں کیا گیا۔ بعد ازاں صوبہ خیبر پختونخوا کی بزنس کمیونٹی نے 15 جنوری کو صدر آصف علی زرداری سے ملاقات کے دوران بھی نئے افغان ٹرانزٹ معاہدے پر اپنے شدید تحفظات کا اظہار کیا تھا جبکہ صدر نے ان کے خدشات دور کرنے کی بھی یقین دہانی کرائی تھی۔

اگر ہم ترمیمی ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدے ہی کا جائزہ لیں تو اس حوالے سے پاکستان اپنے موقف پر نظر نہیں آتا اور بھارت کو ٹرانزٹ ٹریڈ کی سہولت سے انکار کی پالیسی سے رجوع کر کے درپردہ اسے سہولت فراہم کی گئی ہے۔ اصل بات بھارتی سامان کی افغانستان اور وسطی ایشیائی ریاستوں تک فراہمی ہے جس کے مواقع ملنے سے بھارت کو اپنے مال کی کھپت کے لئے ایک بڑی منڈی میسر آ گئی ہے اور ہمیں بدلے میں راہداری کے چند سکے ملیں گے۔ افغانستان کی جانب سے پاکستان کو اس سہولت کے بدلے وسطی ایشیائی ریاستوں تک راہداری کی سہولت دینے سے پاکستانی معیشت اور تجارت پر کوئی قابل ذکر مثبت اثر پڑنے کا زیادہ امکان نہیں۔ بھارتی سستا مال بھی ساتھ ہی ان ممالک کو پہنچنا شروع ہو جائے تو مارکیٹ میں مقابلہ کی جو فضا پیدا ہو گی اس کا مقابلہ کرنا لوڈ شیڈنگ اور صنعتوں کی بندش کے شکار ملک کے صنعت کاروں کے لئے آسان نہ ہو گا۔ حکمرانوں کے عجلت میں کیے جانے والے فیصلے سے بھارت کو اپنے مال کی کھپت بڑھانے کے جو مواقع ملیں گے اس سے خود پاکستان کے اندر ہماری معیشت پر جو منفی اثرات مرتب ہوں گے اس کا مقابلہ بھی آسان نہ ہو گا۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کا جو مال اس وقت سمگل ہو کر پاکستان واپس آتا ہے یا ملی بھگت سے مال افغانستان لے جایا ہی نہیں جاتا یہ صورتحال پہلے ہی ملکی صنعتوں اور کاروبار کے لئے نہایت مشکلات کا باعث بنی ہوئی ہے اور اگر بھارتی مال کی بھی سمگلنگ کے ذریعے ہماری منڈیوں تک رسائی شروع ہو جائے تو اس صورتحال کا مقابلہ کیسے کیا جا سکے گا اس پر تو حکمرانوں کی توجہ نہ گئی ہو گی یا پھر بیرونی دباؤ کے تحت انہوں نے صورتحال کو جانتے ہوئے بھی

صرف نظر کی پالیسی اختیار کی۔ بھارتی سامان کی بہم رسائی اصل بات ہے۔ یہ بات ثانوی نوعیت کی ہے کہ ملک کے ٹرکوں اور کنٹینرز وں پر یہ سامان لادا جائے گا جو ہماری زمینی حدود سے گزریں گے اس انتظام میں یہ بات سراسر فراموش کر دی گئی ہے کہ ٹرکوں پر بھارتی سامان لدا ہو گا اور افغانستان میں بھارت کا جس قدر اثر و نفوذ ہے اس کے مدنظر یہ عین ممکن ہے کہ صرف ٹرک اور ٹرالر کا عملہ افغانی ہو گا سب کچھ بھارت کا ہو گا۔ خیبر پختونخوا میں صنعتی اور تجارتی صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ بندرگاہ سے سینکڑوں کلو میٹر دور خیبر پختونخوا صنعت و تجارت کے شعبوں میں نمایاں ترقی سے محروم رہا ہے۔ افغانستان کے راستے وسطی ایشیا کا گیٹ وے قرار دیا جانے والا یہ صوبہ ناقص پالیسیوں اور اداروں کی غفلت کے باعث یہ مقام بھی حاصل نہ کر سکا۔ پشاور میں ٹرانزٹ ٹریڈ کے حوالے سے کچھ سرگرمیاں دیکھنے کو ملتی ہیں تاہم افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے نئے معاہدے کے بعد یہ سرگرمیاں بھی مفقود ہو جائینگی۔

پاک افغان ٹرانزٹ معاہدہ کے اہم نکات

☆افغانستان کو اپنی مصنوعات بھارت برآمد کرنے کے لئے واہگہ بارڈر تک جانے اور پاکستان کا زمینی راستہ استعمال کرنے کی اجازت ہو گی جبکہ بھارت کو پاکستان کا زمینی راستہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہو گی ☆ بھارت کو افغانستان تک سامان کی نقل و حمل کے لئے پاکستان کے فضائی اور سمندری راستے استعمال کرنے کی اجازت ہو گی جس کے تحت بھارت اپنا سامان افغانستان بھجوانے کے سمندری راستے کے ذریعے کراچی پورٹ اور بن قاسم پورٹ تک لائے گا جبکہ اسے فضائی راستہ استعمال کرنے کی بھی اجازت دی گئی ہے ☆ پاکستان اور افغانستان کے مابین فضائی سمندری حدود سے ٹرانزٹ ٹریڈ کی پہلے سے دی گئی سہولت برقرار رکھی گئی ہے اس کے بدلے میں افغانستان پاکستان کو وسطی ایشیائی ریاستوں تک راہداری فراہم کرے گا اور پاکستانی مصنوعات کو ان ریاستوں تک جانے کی اجازت ہو گی ☆ بھارت کو واہگہ بارڈر پر افغانستان

جانے والے سامان کو ان لوڈ کرنے کی اجازت ہوگی جہاں سے افغان ٹرک بھارتی سامان افغانستان لے جاسکیں گے ☆ پاکستان کے مطالبے پر افغانستان میں لیٹر آف کریڈیٹ (ایل سی) کھولنے کی اجازت دی گئی ہے ☆ افغان ٹرک ڈرائیوروں اور عملے کو ویزے جاری کیے جائیں گے ☆ تمام بین الاقوامی قوانین کو مدنظر رکھا جائے گا اور پاکستان افغانستان سے ٹرانزٹ گارنٹی لے گا تاکہ سمگلنگ کی روک تھام کے لئے کسٹم ڈیوٹی وصول کی جاسکے ☆ افغانستان کو پشاور سے کراچی تک ٹرک لے جانے کی اجازت دی گئی ہے

پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدے کے نقصانات

☆ افغان ٹرانسپورٹ کے آنے سے پاکستان ریلوے کو 3 ارب روپے کا نقصان ہوگا (ریلوے کو پہلے ہی 40 ارب روپے خسارے کا سامنا ہے)۔

☆ این ایل سی (نیشنل لاجسٹک سیل) کو اربوں روپے کا خسارہ برداشت کرنا پڑے گا اس روزگار سے وابستہ لاکھوں افراد بے روزگار ہو جائیں گے۔

☆ افغان ٹرک لفٹ ہینڈ ڈرائیور ہوتے ہیں حادثات رونما ہونے کے خدشات بھی ہیں۔

☆ افغانستان کے ٹرک بھارتی سامان لے کر پاکستان کے راستے ہی کابل اور آگے وسط ایشیا تک جائیں گے جس کے باعث افغانستان اور وسطی ایشیا کی مارکیٹ سے بھی پاکستان آؤٹ ہو جائے گا۔

☆ پاکستان کی معیشت مکمل بیٹھ جائے گی سیکیورٹی خدشات بھی جنم لیں گے۔

☆ افغان ٹرانسپورٹ کے ذریعے ہیروئن اور اسلحہ کی بڑی کھیپ پاکستان بہ آسانی پہنچائی جا سکے گی۔

(ستمبر 2010ء)

کرپشن کا بھوت ناچ جاری ہے

ان حالات میں کہ جب ساری قوم پر معاشی عذاب مسلط ہے اور ملک کی قریباً نوے فی صد آبادی غربت کی لکیر کے نیچے یا اوپر زندہ درگور ہے۔ کاروباری حضرات ماتم کناں ہیں کہ دھندہ نہیں چل رہا۔ ملازمین سر پر ہاتھ رکھے رو رہے ہیں کہ تنخواہوں سے پوری نہیں پڑتی غرض ہر شخص کو مہنگائی اور قحط کے خوف نے ذہنی مریض بنا رکھا ہے لیکن حیرت انگیز طور پر ملک میں ایک ایسا طبقہ بھی ہے جن کا کاروبار دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ یہ ہیں پاکستان کے معزز پارلیمنٹیرین جن کے اثاثہ جات میں گزشتہ چھ سال کے دوران کم از کم تین گنا اور زیادہ سے زیادہ بارہ گنا اضافہ ہوا ہے۔ یہ بات محلِ نظر رہے کہ شاید ہی کوئی ایسا پارلیمنٹیرین ہوگا جس نے اپنے اثاثہ جات صحیح ڈکلیئر کیے ہوں لیکن اس کے باوجود ان میں اتنا اضافہ اللہ کی ان پر ''خصوصی مہربانی'' ہی ہو سکتی ہے۔

گزشتہ دنوں جب سیلاب زدگان پر میڈیا نے ''یلغار'' کی ہوئی تھی تو ایک سیلاب سے متاثر شخص اس بات پر رو پڑا کہ انہیں ''آفت رسیدہ'' کیوں کہا جا رہا ہے۔ اللہ ایسا بے انصاف نہیں کہ غریبوں پر آفت لائے اور وڈیروں کو موج میلہ کرنے کا موقعہ ملتا رہے۔ بہرحال یہ تو اللہ ہی بہتر

جانتا ہے کہ ''آفت رسیدہ'' کون ہے؟

''پلڈاٹ'' کی ایک رپورٹ کے مطابق اراکین اسمبلی الیکشن کمیشن کو پیش کردہ گوشواروں کے مطابق ان کے اثاثہ جات میں 6 سال کی مدت میں تین گنا کم از کم اضافہ ہوگیا ہے۔ سال 2002-03ء میں اراکین کے اوسط اثاثے 27 ملین مالیت کے تھے جو کہ 2008-09 میں بڑھ 81 ملین روپے ہو گئے۔ پیپلز پارٹی کے اراکین محبوب اللہ جان 3 ارب 28 کروڑ کے اثاثوں کے ساتھ سب سے امیر اور سعید اقبال چوہدری غریب ترین ہیں۔ پلڈاٹ کے جاری کردہ اعداد وشمار کے مطابق اوسط اثاثوں میں سال 2007-08 کی نسبت 9.5 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ غیر مسلم اراکین اسمبلی 20.35 ملین کے اثاثہ جات رکھتے ہیں جو کہ اراکین کے اثاثہ جات کی اوسط سے 75 فیصد کم ہیں، موجودہ اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے این اے 23 کوہستان سے رکن قومی اسمبلی محبوب اللہ جان 3 ارب 28 کروڑ 80 لاکھ روپے کے اثاثہ جات کے ساتھ سب سے زیادہ امیر ہیں۔ 1 ارب 62 کروڑ 70 لاکھ روپے کے اثاثوں ے ساتھ راولپنڈی سے مسلم لیگ (ن) کے رکن اسمبلی شاہد خاقان عباسی دوسرے نمبر پر ہیں۔ مسلم لیگ (ف) کے جہانگیر ترین 1 ارب 9 کروڑ 50 لاکھ روپے کے اثاثہ جات ے ساتھ تیسرے نمبر پر ہیں۔ سعید احمد ظفر 1 ارب 3 کروڑ روپے کے مالک ہیں خواتین میں سب سے امیر رکن اسمبلی مسلم لیگ (ن) کی نزہت صادق ہیں جو 912.81 ملین روپے کے اثاثہ جات رکھتی ہیں۔ سال 2007-08ء میں اراکین اسمبلی نے الیکشن کمیشن کو اپنے اثاثہ جات کی جو تفصیلات دی تھیں اس کے مطابق محبوب اللہ جان 3 ارب 25 کروڑ 20 لاکھ روپے کے اثاثوں کے مالک تھے جبکہ نزہت صادق 1 ارب 51 کروڑ 40 لاکھ روپے کے اثاثہ جات کی مالک تھیں، چوہدری زاہد اقبال کے اس وقت اثاثہ جات 1 ارب 24 کروڑ 80 لاکھ، چوہدری نذیر احمد جٹ جنہوں نے جعلی ڈگری کی بناء پر استعفٰی دے دیا تھا، 843 ملین روپے کے مالک تھے، موجودہ اسمبلی کے ''غریب'' اراکین میں پیپلز پارٹی کے

سعید اقبال چوہدری سرفہرست ہیں جو کہ 29 ملین روپے کے اثاثہ جات کے مالک ہیں، جن کے بعد روشن دین جونیجو، شیخ روحیل اصغر، وزیر مملکت برائے تعلیم غلام فرید کاٹھیا اور ایاز میر ہیں۔ نزہت صادق کے بعد دوسری امیر ترین خاتون رکن اسمبلی عاصمہ ارباب عالمگیر ہیں جو کہ 515.25 ملین روپے کی مالک ہیں، بیگم بیلم حسنین 298.50 روپے کے اثاثہ جات کے ساتھ تیسرے نمبر پر ہیں۔ قبائلی علاقے سے رکن قومی اسمبلی محمد کامران خان سب سے زیادہ منفرد ہیں جن کے اثاثہ جات میں ایک سال کے عرصے میں 42 گنا اضافہ ہوا، مولانا قاسم کے اثاثہ جات میں 12 گنا، بلال یاسین ے اثاثہ جات میں 9 گنا اضافہ ہوا۔ سیاسی جماعتوں کے تناظر میں سب سے زیادہ امیر اراکین اسمبلی مسلم لیگ (فنکشنل) کے ہیں جن کی فی رکن اسمبلی اوسط 239 ملین روپے بنتی ہے، نیشنل پیپلز پارٹی کے اراکین اسمبلی 122 ملین روپے، آزاد اراکین 108 ملین روپے، پیپلز پارٹی کے اراکین 102 ملین روپے، مسلم لیگ (ن) کے 75 ملین روپے، مسلم لیگ (ق) کے 62 ملین روپے، اے این پی اے 61 ملین روپے، پیپلز پارٹی شیر پاؤ کے 37 ملین روپے، ایم کیو ایم کے 25 ملین روپے، پی این پی 14 ملین اور ایم ایم اے کے اراکین اسمبلی 6 ملین روپے کی اوسط رکھتے ہیں۔

رپورٹ کے مطابق 2002ء سے 2006ء کے دوران پاکستان تحریک انصاف کے واحد رکن قومی اسمبلی عمران خان دولت کے حوالے سے پہلے نمبر پر رہے جن کے اثاثوں کی مالیت 85 ملین روپے تھی جبکہ مسلم لیگ (ن) 61 ملین کے ساتھ دوسرے، مسلم لیگ (ق) 56 ملین کے ساتھ تیسرے اور پیپلز پارٹی کے ارکان 34 ملین کے اوسطاً اثاثوں کے ساتھ چوتھے نمبر پر رہے۔

رپورٹ کے مطابق 2008-09ء میں اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے ارکان اثاثوں کے حوالے سے پہلے نمبر پر ہے جبکہ خیبر پختونخوا، پنجاب، فاٹا، سندھ اور بلوچستان کا نمبر اس کے بعد

آتا ہے۔ 2007-08ء میں بھی اسلام آباد کے ارکان سرفہرست رہے، مجموعی اثاثوں کی مالیت کے حوالے سے پنجاب 54 فیصد کے ساتھ پہلے نمبر پر رہا تاہم ان میں 2002ء سے 2006ء کے دوران 73 فیصد سے کمی ہوئی۔ خیبر پختونخوا 31، سندھ کا حصہ 10 فیصد، فاٹا تین فیصد، اسلام آباد ایک فیصد اور بلوچستان ایک فیصد اثاثوں کا مالک رہا۔

کاش پاکستان کے بدقسمت عوام پر جان سکتے کہ ہمارے معزز اراکین پارلیمنٹ کے پاس وہ کون سی جادو کی چھڑی ہے جس کے چھونے سے ان کے کاروبار دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں ورنہ تو ملکی اقتصادیات کا جنازہ نکل چکا ہے اور ایک مستند رپورٹ کے مطابق عالمی بنک نے پاکستان کو شعبہ بجلی کے لئے فنڈز کی فراہمی روک دی ہے بنک کے نائب صدر برائے جنوبی ایشیاء نے جو گزشتہ دنوں پاکستان آئے تھے 10 ستمبر کو روزنامہ ''نیوز'' کو بتایا کہ سرمایہ ضائع کرنے والا بجلی کا شعبہ پاکستان کے بجٹ اور مائیکرو اکنامک اہداف کیلئے سنگین خطرہ ہے۔ کیونکہ گردشی قرضہ، نااہلیت اور لوڈشیڈنگ میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ نائب صدر برائے جنوبی ایشیاء مسز ایزابل گوریرو نے ایک خصوصی انٹرویو میں بتایا کہ بجلی کے شعبے میں بڑھتی ہوئی سبسڈیز بجٹ کے تمام اہداف کو بری طرح متاثر کر رہی ہیں اس لئے عالمی بینک نے پیسے کے اس ضیاع کو فوری طور پر روکنے کی سفارش کی ہے۔ اس سوال کے عالمی بینک گزشتہ دس سال سے شعبہ بجلی کیلئے پیسے فراہم کرتا رہا ہے لیکن مطلوبہ بہتری نہیں ہوسکی مسز ایزابل نے کہا کہ اب عالمی بینک نے اس شعبہ کیلئے پیسے دینا بند کردیئے ہیں۔ کیونکہ بغیر کسی ہدف کے بڑھتی ہوئی سبسڈیز کسی مسئلے کا حل نہیں ہیں تاہم ذرائع کے مطابق موجودہ حکومت بجلی کے ٹیرف سبسڈی کیلئے 30 ارب روپے کی منظوری دے چکی ہے، جو اس ماہ کے آخر تک استعمال کر لئے جائیں گے۔ اب صرف دو ہی آپشن رہ گئے ہیں کہ آئندہ ماہ سے بجلی کی قیمتوں میں بڑے پیمانے اضافہ کر دیا جائے یا ہر مہینے آٹھ ارب روپے کا بجٹ خسارہ برداشت کیا جائے۔ وزارت خزانہ کے سینئر حکام نے جمعہ کو دی نیوز کو بتایا کہ بجلی کی قیمتوں

میں اضافہ ناقابل عمل لگتا ہے کیونکہ بدترین سیلاب اور حالیہ ہفتوں میں بنیادی ضرورت کی اشیاء کی قیمتوں میں زبردست اضافے کے باعث سیاسی حکومت عوام کی جانب سے شدید ردعمل کو برداشت نہیں کر سکتی۔

واشنگٹن میں گزشتہ دنوں آئی ایم ایف کے ساتھ مائیکرو اکنامک فریم ورک کے حوالے سے جو تبادلہ خیال کیا گیا ہے اس میں بھی زور دیا گیا ہے کہ بجلی کی قیمتوں کے حوالے سے سبسڈی کو 30 ارب روپے سے نہیں بڑھایا جائے گا۔ حکام کے مطابق یہ فریم ورک ناقص ہے متعلقہ اتھارٹیز بھی بخوبی آگاہ ہیں کہ اس کا حصول ممکن نہیں۔ یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ بجلی کا شعبہ پیپکو کے خاتمے کے بعد شاندار نتائج دکھانا شروع کردے گا کیونکہ تقسیم کار کمپنیوں کو خود مختاری دیتے ہوئے نجی شعبہ سے کسی کو تعینات کیا جائے گا جو اس غیر منافع بخش ادارے کو کارپوریٹ بنیادوں پر چلائے گا۔ ذرائع کے مطابق حکومت شعبہ بجلی کے اعلیٰ حکام پر دباؤ ڈال رہی ہے کہ اہم نوعیت کی اصلاحات کرتے ہوئے سمارٹ میٹر نصب کیے جائیں پیپکو کو ختم اور مکمل خود مختار پاور کمپنیوں کی جانب پیشرفت کی جائے اور کرپٹ عناصر کو نکال کر ان کی جگہ ایماندار اور محنتی ملازمین رکھے جائیں ادھر پیپکو حکام بجلی کی قیمتوں میں تین سے چار مراحل میں تیس فیصد اضافے کیلئے تا حال بضد ہیں۔ اگر موجودہ مالی سال کیلئے بجٹ میں منظور کردہ تیس ارب روپے میں اضافہ نہیں کیا جاتا تو پیپکو کو سالانہ ٹرن اوور 700 ارب روپے رہے گا۔ جو لوگوں سے بجلی بلوں کی صورت میں جمع کیا جاتا ہے لیکن اصلاحات کے نفاذ پر توجہ نہیں دی جاتی جس کی وجہ سے بجلی کے شعبے میں بحران گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ لائن لاسز حقیقی معنوں میں 35 فیصد تک ہیں لیکن پیپکو حکام اسے مختلف مدوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں مثال کے طور پر پیپکو حکام اپنے ملازمین کیلئے الاؤنس متعارف کرانے کی بجائے انہیں مخصوص حد تک بجلی کے یونٹ مفت استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں اس سہولت کا ملک بھر میں بڑے پیمانے پر غلط استعمال کیا جا رہا ہے۔ ذرائع نے کہا ہے کہ بجلی کے شعبے میں اصلاحات کے عمل میں

زور دیا گیا ہے کہ خودمختار ڈسٹری بیوشن کمپنیوں کے قیام کی جانب آیا جائے۔ اس مقصد کیلئے ان کمپنیوں کے بیس سے چالیس فیصد حصص مقامی سٹاک مارکیٹوں میں فروخت کرنے کی ضرورت ہے۔ سمارٹ میٹرز کے حوالے سے ذرائع نے کہا کہ ملازمین اور صارفین کے درمیان کرپٹ عناصر کے گٹھ جوڑ کو توڑنا بظاہر ناممکن دکھائی دے رہا ہے۔ البتہ ''خسارے'' کے لئے غریبوں کو قربانی کا بکرا ضرور بنایا جاتا ہے اور یہ جو ہم آئے دن بجلی کے بلوں میں زیادتی کا رونا روتے ہیں اس کا شاخسانہ دکھائی دیتا ہے۔ جو بجلی چوری ہوئی ہے اس کا بوجھ غریب صارفین پر لاد دیا جاتا ہے۔ اِلّا ماشاءاللہ کوئی شعبہ زندگی بھی اس حرامکاری سے خالی دکھائی نہیں دیتا۔

14 ستمبر کو ''کامران خان شو'' میں اس حوالے سے بڑے دلچسپ انکشافات کیے گئے۔ کامران خان کا کہنا تھا کہ معاشی بدحالی، حکومتی کرپشن اور سیلاب کی تباہ کاری کے بعد وہاں ہونے والے گھپلوں نے پاکستان کو دیوالیہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یہ خطرناک وارننگ کسی اور نے نہیں پاکستان کے وزیرخزانہ حفیظ شیخ نے دی ہے۔ گزشتہ دنوں وزیراعظم گیلانی کی زیر صدارت اعلیٰ سطحی اجلاس جس میں افواج پاکستان کے سربراہان اور اعلیٰ ترین حکومتی عہدے داران بھی موجود تھے کے روبرو حفیظ شیخ نے یہ انکشاف کیا ہے سو رکنی کابینہ کے ساتھ پاکستان پر حکومت کرنے والے وزیراعظم گیلانی کو صاف صاف بتا دیا گیا کہ ملک اب مزید افراتفری، مالیاتی کرپشن، اقرباء پروری اور سرکاری عیاشیوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اگر پاکستان کو بچانا ہے تو ان تمام چیزوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ وزیراعظم نے وعدہ کیا کہ وہ سرکاری کارپوریشنز اور دوسرے سرکاری عہدوں کو خاص لوگوں کے نرغوں سے نکال کر ایماندار پیشہ وارانہ شہرت کے حامل لوگوں کے حوالے کریں گے مگر قومی تاریخ کے اس خطرناک موڑ پر بھی وزیراعظم گیلانی اور ان کے سیاسی سرپرست ان وعدوں کے برعکس کام کرتے نظر آرہے ہیں اور اس کا انجام پاکستان کے لئے اچھا نہیں ہوگا پاکستان میں اہم عہدے قابل، دیانتدار اور غیر جانبدار لوگوں کے پاس ہوں،

وزیراعظم ہمیشہ اس کے حامی رہے ہیں مگر اس سلسلے میں انہوں نے قوم سے متعدد بار وعدے کیے وہ پورے ہوتے نظر نہیں آرہے۔ یہ وعدہ نہ ماضی میں پورے ہوئے اور نہ ہی آج پورے ہوتے نظر آرہے ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ شیخ نے یہاں تک کہہ دیا کہ حکومت پاکستان کے پاس شاید اتنی رقم بھی نہ ہو کہ وہ اپنے وفاقی ملازمین کو تنخواہیں بھی ادا کرسکے اس لئے فوری طور پر اقدامات کیے جائیں۔ کابینہ کو کرپٹ لوگوں سے پاک کریں اور سرکاری عہدوں پر کام کرنے والے کرپٹ افسران کو فارغ کرکے سرکاری کارپوریشنز کو پیشہ وارانہ طریقے سے چلائیں۔

وزیراعظم گیلانی نے حامی تو بھر لی لیکن ایسا اب تک نہیں کیا بلکہ ان کے اقدامات ان کی باتوں کے منافی نظر آرہے ہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت OGDC کے سربراہ کی حیثیت سے ان کے دوست عدنان خواجہ کا تقرر ہے جو مالی بے ضابطگیوں پر سزا یافتہ ہے اور حالیہ دنوں میں سپریم کورٹ سے ضمانت پر رہا ہوا ہے۔ وزیراعظم کے اس دیرینہ دوست کی تعلیمی قابلیت بمشکل ایف سی ہے۔ وزیراعظم نے یہ اقدام ایک ایسے وقت میں اٹھایا جب ان کی کابینہ کے اپنے وزیرخزانہ حفیظ شیخ نے ملک میں معاشی ابتری پیدا ہونے کی خطرناک اطلاع دی ہے۔ معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ وفاقی وزیر تجارت مخدوم امین فہیم کے دوست اور دبئی کے ایک نائٹ کلب کے سابق منیجر ایاز خان نیازی کو NIC کا سربراہ بنا دیا گیا جس کے بعد ایسا لگ رہا ہے کہ NIC ایک رئیل اسٹیٹ کا کاروبار کرنے والا ادارہ بن گیا ہے۔ ایاز خان نے اپنا تقرر ہوتے ہی رنگ دکھانا شروع کردیا ہے اور اب تک کئی سودوں میں اربوں روپے کے گھپلے کرچکے ہیں۔ اربوں روپے کے گھپلوں کا انکشاف اب روزانہ کا معمول بن چکا ہے۔ سٹیل مل، پی آئی اے، ریلوے کو جو کینسر لاحق ہے اس کے حوالے سے ایسی ایسی پریشان کن خبریں سامنے آتی ہیں کہ دل دھل جاتا ہے لیکن حکومت کا نہیں، عوام کا۔

(اکتوبر 2010ء)